مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

حیات اور کارنامے

تالیف: مولانا اسیر ادروی صاحب
استاذ جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس

شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم

زیر انتظام

بدرالدین اجمل علی القاسمی رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

سلسلہ مطبوعات شیخ الہند اکیڈمی ع۱۲

نام کتاب	:	مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حیات اور کارنامے
تالیف	:	جناب مولانا اسیر ادروی صاحب
کمپیوٹر کتابت	:	مرکزالمعارف، ہوجائی، آسام / برانچ دیوبند
صفحات	:	۴۱۲
سن اشاعت	:	رجب ۱۴۱۸ھ — نومبر ۱۹۹۷ء
تعداد بار اول	:	گیارہ سو
ہدیہ	:	
ناشر	:	شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند 247554

آفسٹ، جیگینیو اینڈ پرنٹرس Ph:7777587 ZAINUL ABEDIN

فہرست

باسمہٖ تعالیٰ

عرض ناشر

شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند - جس کی طرف سے زیر مطالعہ کتاب اشاعت پذیر ہو رہی ہے - کے قیام کا ایک بنیادی مقصد حضرات اکابر علمائے دیوبند کی مجاہدانہ و درویشانہ زندگیوں اور سرفروشانہ علمی، عملی، اصلاحی اور دعوتی کارناموں پر اردو اور عربی زبانوں میں عصری اسلوبِ نگارش سے ہم آہنگ معیاری اور تحقیقی کتابوں کی ترتیب و تالیف اور اشاعت ہے؛ تاکہ باشندگانِ برصغیر اور اہل عرب کو ان کی حیات و خدمات سے روشناس کرایا جاسکے۔

مقام شکر ہے کہ اکیڈمی نے گذشتہ چند برسوں کے دوران اس سمت میں قابل اطمینان حد تک پیش رفت کی ہے۔ اس سے پہلے میر کارواں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز کی سوانح پر مکرمی جناب مولانا اسیر ادروی کی شاہ کار کتاب "مولانا محمد قاسم نانوتوی، حیات اور کارنامے" کے عنوان سے اکیڈمی ہذا کی جانب سے طبع ہو کر علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کرچکی ہے۔ الحمد للہ اس کا دوسرا ایڈیشن قریب الختم ہے اور اب موصوف ہی کی یہ تالیف لطیف امام ربانی حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی شش پہلو عبقری شخصیت، علمی و دینی خدمات، دعوتی و اصلاحی سرگرمیوں سے عبارت حیات اور بدعات و خرافات کی بیخ کنی کے حوالے سے ان کی مساعی جمیلہ پر مشتمل، ارباب علم وفن کو دعوت

مطالعہ دے رہی ہے۔

امام ربانی حضرت گنگوہی قدس سرہ کی سوانح پر یوں تو متعدد چھوٹی اور بڑی کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ کی تالیف "تذکرۃ الرشید" سب سے ممتاز اور منفرد ہے۔ تاہم یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی کتاب امام ربانی کی جامع کمالات شخصیت پر بھرپور، مدلل اور سیر حاصل گفتگو نہیں کرتی ہے۔ علاوہ ازیں عصر حاضر کے رواں اور شگفتہ اسلوب تحریر سے ہم آہنگ نہیں ہے؛ جس کے باعث عام قاری کے لیے استفادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

اس ضرورت کے پیش نظر محترم مولانا اسیر صاحب ادروی نے زیر نظر کتاب "مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حیات اور کارنامے" لکھی اور خوب لکھی۔ اس پر وہ احقر اور تمام برادرانِ قاسمی کی جانب سے بجا طور پر شکریے کے مستحق ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ تنہا ایک شخص کب تک، کہاں تک اور کن کن شخصیات پر لکھ سکتا ہے کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است؛ اس لیے ضرورت ہے کہ تمام اہل قلم فضلائے دارالعلوم دیوبند سامنے آئیں اور اس ذمے داری کو بانٹ کر اس کی تکمیل میں ہمہ تن لگ جائیں۔

اس موقع پر راقم سطور ان جملہ معاونین ومحسنین کا شکر گذار ہے، جن کا کسی بھی قسم کا تعاون اس میں شامل حال رہا۔ بالخصوص حضرت اقدس مولانا سید اسعد صاحب مدنی صدر جمعیۃ علمائے ہند اور حضرت اقدس مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کا کہ ان حضرات کی دعاؤں نے بڑا کام کیا۔ نیز حضرات ارا کین مجلس شوریٰ خصوصاً گرامی مرتبت حضرت مولانا غلام رسول صاحب خاموش گجراتی اور گرامی حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی کا ممنون ہے کہ ان دونوں حضرات نے ہر موڑ پر اپنے مخلصانہ

مشوروں سے رہنمائی کی۔ **فجزاهم الله جميعا خير الجزاء**

کتاب کی اشاعت کے تعلق سے احقر برادر مکرم جناب مولانا مزمل علی آسامی استاذ دارالعلوم دیوبند اور برادر عزیز مولانا عبدالرشید بستوی رفیق تالیف وترجمہ مرکز المعارف برانچ دیوبند کا مشکور ہے کہ اول الذکر نے قابلِ قدر ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور پروف ریڈنگ سے لے کر طباعت تک کے تمام مراحل کی تکمیل میں کلیدی کردار ادا کیا، جب کہ مؤخر الذکر نے متعدد بار اصل مسودہ اور کتابت شدہ مسودہ پر نظر ڈال کر اسے اغلاط سے ممکنہ حد تک پاک کیا۔ پروف ریڈنگ میں عزیزم مولوی مصلح الدین سدھارتھ نگری معین مدرس دارالعلوم دیوبند، مولوی محمد یوسف رامپوری اور مولوی ذوالفقار احمد بہرائچی ریسرچ اسکالرس شیخ الہند اکیڈمی نے بھی اپنا تعاون دے کر گراں بار کیا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو دنیا و آخرت میں جزائے خیر عطا فرمائے، کتاب ہذا کو قبولِ عام بخشے اور اکیڈمی نیز دارالعلوم دیوبند کے تعلق سے احقر کو زیادہ سے زیادہ خدمات کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین!

مخلص

بدرالدین اجمل القاسمی

خادم شیخ الہند اکیڈمی و رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

۲۶/رجب ۱۴۱۸ھ

۲۷/نومبر ۱۹۹۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد اسلامی ہند اقتصادی و معاشی تباہیوں کے ساتھ ساتھ جس ذہنی و فکری انتشار میں مبتلا تھا اس کا اندازہ ہر اس شخص کو ہے جو تاریخ سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے تاریخ کے اس اہم اور نازک موڑ پر قومی و ملی دینی و مذہبی ذہنی و فکری تعمیر و تشکیل میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا اہم کردار رہا ہے مگر اب تک ان کی متنوع شخصیت کی یک رخی تصویر پیش کی گئی، دوسرے رخ پر روشنی ڈالنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے، میں نے اس کتاب میں حضرت گنگوہی کی ہمہ جہتی دینی و ملی و علمی خدمات اور اصلاح امت کے بے مثال کارناموں سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے، میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا؟ اس کا فیصلہ قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔

اسیر ادروی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی عظیم شخصیتیں اسلامی ہند کے اس دور میں پیدا ہوئیں جب اس کے جاہ وجلال عظمت و اقتدار کا پرچم سرنگوں ہو رہا تھا۔ اس کی بہاروں کا کارواں پابہ رکاب تھا اور باد خزاں کے جھونکے چلنے شروع ہو گئے تھے۔

تاریخ کے اس دوراہے پر کھڑے ہو کر اسلامی ہند کے ماضی کی طرف نگاہ ڈالیے تو حد نگاہ تک ہماری سربلندی و سرفرازی، حکمرانی و اقتدار کا پرچم آسمان سے باتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے، اس کے نیر اقبال کی روشنی چاروں کھونٹ پھیلی ہوئی تھی اور پھر جب اس کے مستقبل کی طرف دیکھیے تو ذلت وادبار، پستی ونکبت کی کالی گھٹائیں اُمڈتی ہوئی نظر آتی ہیں، راہیں تاریک سے تاریک تر ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، مسلمان بے بسی کے عالم میں سلامتی کی راہیں تلاش کر رہا تھا اور کوئی فیصلہ کرنے میں بے بس نظر آرہا تھا۔

ٹھیک تاریخ کے اسی موڑ پر یہ دونوں تاریخ ساز شخصیتیں عالم وجود میں آئیں، جو اپنے مضبوط کردار، خاراشگاف قوت فکر اور اپنے حیرت ناک کارناموں کی وجہ سے تاریخ کا عنوان اور سرنامہ بن گئیں، مورخ کا قلم مجبور ہے کہ جب اسلامی ہند کے عروج وزوال کی تاریخ مرتب کرے تو ان دونوں تاریخ ساز بزرگوں کو ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور

تحریک اصلاح کے امیر کارواں اور ملت اسلامیہ کے مسیحا کی حیثیت سے پیش کرے اور ان کے عظیم الشان کارناموں کو سنہرے حرفوں میں لکھے۔

دونوں کے دو محاذ تھے، حضرت نانوتویؒ ادیان باطل کے مقابلہ میں سینہ تان کر کھڑے ہوگئے اور حریف کے سارے حملوں کا بھرپور جواب دے کر ان کو ہزیمت کی رسوائی اور شکست کی ذلت دے کر بیک بنی و دوگوش میدان چھوڑنے پر مجبور کردیا، تو دوسری طرف حضرت گنگوہیؒ نے مسلمانوں کی داخلی گمراہیوں کے سدباب کے محاذ پر مورچہ سنبھالا اور تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا، اسلام میں مشرکانہ اوہام وعقائد کے نفوذ کی راہیں بند کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

حضرت نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند قائم کرکے اپنے مشن کی کامیابی کے لیے ایک شاہراہ قائم کردی کہ یہاں سے ہر دور میں ہر طرح کے اسلام دشمن رجحانات وخیالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے مجاہدین صف شکن پیدا ہوتے رہیں جو مجاہد فی النہار اور رہبان فی اللیل کی صفت سے متصف ہوں تو دوسری طرف حضرت گنگوہیؒ نے بیعت وارشاد اور درس و تدریس کے ذریعہ فولادی عزم وارادے کی ایک جماعت تیار کردی جو بدعات وخرافات مشرکانہ رسم ورواج میں جکڑے ہوئے مسلم معاشرہ کو اس عذاب سے نجات دلاکر اسلام کی صاف اور سیدھی شاہراہ پر لانے کا حوصلہ رکھتی تھی۔

یہ دونوں تاریخ ساز شخصیتیں جب تحصیل علوم میں مصروف تھیں تو مسلمانوں کی حکومت قائم تھی، لال قلعہ مسلمانوں کی عظمت واقتدار کا امین تھا اور جب تعلیم سے فراغت کے بعد عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھا تو اسلامی ہند میں وہ طوفان آگیا جس میں مسلمانوں کی عظمت واقتدار کا اثاثہ تباہ وبرباد ہوگیا اور ان کا ایوان حکومت زمیں بوس ہوگیا، مسلمانوں کا نیر

اقبال غروب ہو گیا اور برطانوی حکومت کا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا اور تین مہینوں میں ایسا ہولناک انقلاب آیا کہ آنکھیں خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو گئیں اور پوری ملت اسلامیہ مایوسی اور یاس و قنوطیت کے گہرے سمندر میں ڈوب گئی اور پوری قوم باحال پریشاں باچاک گریباں نالہ و شیون اور ماتم میں مصروف تھی، مگر ان دونوں بزرگوں کے تدبر و فراست نے یاس و نامرادی کی دلدل سے بچالیا ان کے دلوں میں یہ یقین پوری طاقت سے پیدا ہوا کہ آنسو بہانے سے قوموں کی قسمت نہیں بدلتی اس کے لیے جان کی بازی لگانی ضروری ہے اور انھوں نے یہی کیا۔

تنہا دارالعلوم دیوبند کا قیام ہی حضرت نانوتوی کو زندۂ جاوید بنانے کے لیے کافی ہے جب تک یہ ادارہ مصروف کار رہے گا آپ کا نامِ نیک زندہ رہے گا۔ حضرت نانوتوی کے بعد حضرت گنگوہی اس ادارے کے سرپرست بنائے گئے اور اسی کے ساتھ مظاہرعلوم سہارن پور کی بھی سرپرستی منظور فرمائی اور پوری جماعت کی زمام قیادت آپ کے ہاتھوں میں دے دی گئی۔ حضرتؒ نانوتوی کے انتقال کے بعد مسلسل ۲۵ سال تک آپ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور سے فارغ ہونے والے علماء کی ذہن سازی کرتے رہے اور عزم و عمل سے بھرپور اس جماعت کی رہنمائی فرمائی جن کی رگوں میں جوشِ عمل کا گرم خون دوڑ رہا تھا اس کو لے کر آپ نے اسلامی ہند میں تحریک اصلاح کو تیز سے تیز تر کرنے میں مثالی کارنامہ انجام دیا۔

حضرت گنگوہی کے کارناموں کی اہمیت و عظمت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس ماحول کو سمجھ لیا جائے جس میں یہ تحریک اصلاح آپ نے شروع فرمائی۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کی تاریخ اس تاریخ سے قطعاً مختلف ہے، جب اس ملک پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی، آخر کے دور میں اگرچہ برائے نام حکومت تھی، اختیارات مسلوب تھے، لیکن لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر تخت حکومت پر موجود تھے، اس لیے اسلامی ہند میں مذہبی فرقہ بندیوں میں شدت نہیں تھی لیکن جوں ہی زمام اختیار دوسروں کے ہاتھوں میں گئی تو مختلف اسلام دشمن طاقتیں اسلام کے خلاف صف آرا ہوگئیں، عیسائیت تو تلواروں کی جھنکار کے ساتھ آئی، پورے جاہ وجلال اور رعب داب سے آئی، لیکن قدرت نے ایسے جاں سپار علماء پیدا کردیے جنھوں نے جان کی پروا کیے بغیر اس فتنہ کے سرچشمہ کو بند کرنے میں کامیابی حاصل کرلی اور انگریزی حکومت کو بہ جبر واکراہ تبلیغ عیسائیت کی پالیسی بدلنی پڑی لیکن پادریوں اور مشنریوں کی سرگرمیاں ضرور جاری رہیں، ان سرگرمیوں کو بعد کے علماء نے اپنی جدو جہد اور مضبوط قوت ارادی سے کام لے کر دفن کردیا، لیکن سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہوئی کہ مسلمانوں کے اندر فرقہ بندیوں کا سیلاب آگیا جو اپنے ساتھ انتہائی جوش وخروش لے کر آیا، روافض ایک عرصہ سے اسلامی حکومت میں دخیل بن چکے تھے لیکن مغلیہ سلطنت کے تخت پر ہمیشہ سنی مسلمانوں کا قبضہ رہا اس لیے شیعہ اتنے بے لگام نہیں ہوسکے جتنا بعد میں ہوئے لیکن انگریزی حکومت کے قائم ہوتے ہی شیعہ علماء اور ان کے خانہ ساز مجتہدین نے زہر افشانی شروع کردی اور مسلمانوں میں غم حسین کے نام پر سیکڑوں بدعقیدگیاں پھیلادیں اور مشرکانہ اوہام وخرافات عام مسلمانوں میں پیدا کردیے۔

ٹھیک اسی دور میں بہار کے ایک عالم میاں نذیر حسین صاحب نے دہلی میں مسند تدریس سنبھالی اور مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ ایجاد کیا جن کو غیر مقلد کہا گیا اس فرقہ نے احناف کے خلاف محاذ جنگ کھول دیا، شہر

شہر اور گاؤں گاؤں میں ان کے شاگردوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کر کے مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، امام ابو حنیفہؒ کی شان میں نازیبا کلمات اور گستاخیاں شروع کر دیں، تقلید ائمہ کو شرک و ضلالت اور کفر تک پہنچا کر مسلمانوں میں ایک آگ لگا دی۔

تیسری طرف علماء بدایوں اور بریلی بدعات و خرافات کی پشت پناہ بن گئے اور تائید و حمایت میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا جو ان پڑھ عوام میں ان کی لاعلمی کی وجہ سے جاری و ساری تھیں اور مزید ستم یہ ہوا کہ جن علماء حق نے ان بدعات و خرافات کو مسلمانوں سے ختم کرنے کی جد و جہد شروع کی ان کو برملا کافر کہنا شروع کر دیا، جاہلانہ رسم و رواج اور مروجہ بدعات کی حمایت میں سب سے پہلی کتاب حضرت گنگوہی کے زمانہ میں آپ ہی کے ایک ہم وطن مولوی عبدالسمیع رام پوری نے لکھ کر شائع کی، اس کتاب نے بدعات و خرافات اور مشرکانہ عقائد کی جڑوں کو اور گہرا کر دیا۔

یہی وہ حالات ہیں جن میں حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ تعلیم سے فراغت کے بعد گھر گئے اور ان کو عملی میدان میں چومکھی لڑائی لڑنی پڑی۔ اسلام کو ہر طرح کی آمیزشوں سے محفوظ رکھنا علماء حق کا سب سے پہلا فریضہ ہے، حضرت گنگوہی نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا اور ساری زندگی ان گمراہیوں کے خلاف پوری سرگرمیوں کے ساتھ جہاد کرتے رہے، ایک جگہ بیٹھ کر پوری دل جمعی، پورے حوصلے اور پوری دانشمندی سے اس محاذ کو سر کرنے میں لگ گئے۔ تصحیح عقیدہ، توحید، مقام رسالت دین کی صحیح تعلیمات کو عوام، خواص، علماء اور سر برآوردہ طبقہ کے سامنے پیش کرتے رہے، انھوں نے ہر فرقہ کے جارحانہ اعتراضات کے جوابات خالص علمی انداز میں دیے، حدیث و قرآن سے دلائل پیش کیے اور انھوں نے علماء دیوبند کی تحریک اصلاح میں وہ قوت پیدا کی کہ بعد میں

آنے والی نسلوں کو اپنے اپنے علاقوں میں اس سے مدد ملی اور خالص دین کی تبلیغ کو انھوں نے آسان بنادیا اور ہر طرح کے مسائل کے بارے میں دوٹوک رائے دے کر آپ نے علماء حق کو اسلام دشمن طاقتوں سے مقابلہ کرنے کے لیے مسلح کر دیا، ایک دور تو ایسا آیا کہ ملک کے ہر خطے میں کسی مسئلہ کے بارے میں حضرت گنگوہی کے فتوی کا انتظار رہتا تھا اور ان کی رائے معلوم کرنے کے بعد ببانگ دہل صداقت کا اظہار کر دیا جاتا تھا۔

ایسی تاریخ ساز شخصیت کی سوانح حیات، علمی کارناموں اور ان کی تصانیف، ان کے رسائل، اہم ترین اور مفصل فتاوے اور ہر طرح کی دینی خدمات سے روشناس کرانا بعد کی نسلوں کا فریضہ تھا جو صحیح معنی میں اب تک ادا نہیں کیا گیا، حضرت گنگوہی کی ایک ضخیم سوانح عمری سوا سو سال پہلے شائع ہوئی تھی لیکن پوری ایک صدی کے بعد ذہن وفکر میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ سوچنے، غور کرنے، نتائج اخذ کرنے کے طریقوں میں انقلاب آچکا ہے۔ معروضی مطالعہ کی ایک لہر چل پڑی ہے، یک طرفہ رائے، قصیدہ خوانی، مدح سرائی اور محیر العقول حالات وکرامات کا ذکر علم وتحقیق کی دنیا میں اس کا ردعمل اچھا نہیں ہوتا۔ ترتیب واقعات نظری اور منطقی انداز بیان وترتیب انسانی ذہن سے قریب ہو آج ایسا کرنا اہل علم کے لیے ضروری ہو چکا ہے، پھر غیر ضروری تفصیلات کی وجہ سے صاحب کمال کا اصل کمال پردۂ خفا میں رہ جاتا ہے۔

انھیں اسباب کی بنا پر میں نے یہ کتاب مرتب کی ہے، کوشش یہ کی گئی ہے کہ حضرت گنگوہی کے علوم ومعارف ان کی دینی ومذہبی خدمات کا واضح خاکہ قارئین کے ذہن میں آجائے اور حضرت گنگوہی کی عظمت کا صحیح احساس دلوں میں پیدا ہو جائے، ان کے مباحث ان کے رسائل کے بارے میں تفصیل سے گفتگو اس لیے کی گئی ہے کہ یہی حضرت گنگوہی کا

اصل کارنامہ ہے، آپ کی محد ثانہ گفتگو اور عالمانہ تحقیق ہی زندۂ جاوید کارنامہ ہے اور اسی کی وجہ سے آپ علماء حق کے سرخیل اور جلیل القدر مقتدا تسلیم کیے گئے۔

حضرت گنگوہی کی ذات علماء دیوبند کی تحریک اصلاح کا مرکز ثقل ہے انھوں نے اس تحریک کو صحیح سمت دی اس کی رگوں میں تازہ اور گرم خون دوڑایا، اسی کا صدقہ ہے کہ آج کی نسل حضرت گنگوہی کو پورے ادب واحترام سے یاد کرنے پر مجبور ہے، مجھے امید ہے کہ کتاب قدر ومنزلت کے ہاتھوں سے لی جائے گی اور عقیدت وارادت کی نگاہوں سے پڑھی جائے گی۔

اسیر ادروی

جامعہ اسلامیہ، بنارس

۲۵؍فروری ۱۹۹۷ء

خاندان اور وطن

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کا مولد و منشا قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور ہے، تین پشتوں سے آپ کا خاندان یہاں آباد ہے، گنگوہ کی آبادی بہت قدیم ہے، عہد اکبری میں اس کی آبادی خاصی تھی، اس کی شہرت کا آغاز اس وقت ہوا جب مشہور بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ متوفی ۹۴۴ھ نے یہاں سکونت اختیار کی اور اپنی خانقاہ بنائی۔

شیخ موصوف کا اصل وطن ضلع بارہ بنکی کا مشہور قصبہ رُدولی ہے وہیں آپ پیدا ہوئے، طفولیت کا زمانہ گذرا اور سن شعور کو پہونچے، وہیں آپ نے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ملّا فتح اللہ آپ کے استاد تھے، لیکن تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا، آپ ردولی کی ایک خانقاہ میں مجاور ہوگئے، برسہا برس تک وہیں رہ پڑے، ردولی کے مشہور شیخ طریقت محمد ابن احمد ردولوی سے خرقۂ خلافت پایا پھر اس کے بعد ان کو احساس ہوا کہ بغیر علم کے شریعت و طریقت کی راہ پر سلامت روی سے چلنا مشکل ہے، تب آپ نے دوبارہ تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور درجۂ تکمیل تک پہونچایا، "عوارف المعارف" کی شرح لکھی، تصوف میں اُن کی ایک کتاب انوار العیون واسرار المکتون مشہور ہے۔

خلافت کے بعد انھوں نے ردولی کی سکونت ترک کردی پہلے شاہ آباد گئے، مگر جلد ہی وہاں سے منتقل ہوکر گنگوہ چلے آئے اور آبادی سے ہٹ کر تھوڑے فاصلہ پر اپنی خانقاہ تعمیر کرائی اور یہیں مستقل اقامت گزیں ہوگئے،

وفات کے بعد یہیں دفن بھی ہوے، آپ کے افراد خاندان نے یہیں اپنے مکانات بنوائے جو پیرزادے یا شیخ زادے کے نام سے جانے جاتے رہے، اس نئی آبادی کو سرائے کہا جانے لگا اور قدیم آبادی شہر کے نام سے موسوم ہوئی، دونوں آبادیوں کے درمیان ایک بڑا تالاب حائل رہا، امام ربانی کا نانہال شہر میں تھا، جہاں آپ کے چار ماموؤں کا بھرا پرا خاندان تھا آپ کا خاندان تین پشتوں سے یہاں رہتا آرہا تھا، اس سے پہلے آپ کا خاندان رام پور ضلع سہارن پور میں رہتا تھا، آپ کے دادا قاضی پیر بخش جو رام پور میں رہتے تھے، گنگوہ میں بعض اعزہ کی جان خطرے میں پڑ گئی تو انھوں نے قاضی پیر بخش کو اپنی مدد کے لیے بلایا، قاضی صاحب مع اہل وعیال رام پور کی سکونت ترک کر کے گنگوہ میں آباد ہو گئے قاضی پیر بخش کی والدہ مسماۃ بولی شیخ عبد القدوس گنگوہی کے خاندان سے تھیں، اس لیے آپ نے شہر کے بجائے سرائے میں اپنا مکان بنوایا اور وہیں سکونت پذیر ہوئے۔

قاضی پیر بخش کی شادی گنگوہ ہی میں ہوئی، امام ربانی کے والد مولانا ہدایت احمد کی ولادت گنگوہ میں ہوئی، یہیں نشو ونما پائی اور تعلیم حاصل کی اور یہیں ایک خاندان میں آپ کی شادی ہوئی، اب رام پور کے بجائے اس خاندان کا وطن گنگوہ ہو گیا، دوسرے اعزہ رام پور میں رہے۔

باب ع۲

ولادت، طفولیت، تعلیم

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کی ولادت قصبہ گنگوہ ضلع سہارن پور میں ۶/ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء کو ہوئی۔ آپ انصاری ایوبی خاندان سے ہیں، والد کی طرف سے سلسلۂ نسب یہ ہے:

قاضی اسلم انصاری ایوبی

↓

قاضی علی اکبر

↓

قاضی غلام علی

↓

قاضی غلام حسن

↓

قاضی پیر بخش

↓

مولانا ہدایت احمد

↓

امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

جدہ محترمہ کے واسطے سے آپ کا نسب گیارہ واسطوں سے شیخ عبد القدوس گنگوہی سے جا ملتا ہے جدہ محترمہ کا نام بولی تھا جو قاضی پیر بخش یعنی آپ کے دادا کی والدہ محترمہ تھیں، والدہ محترمہ کی طرف سے آپ کا شجرہ مکمل مو

ہے جو آپ کے ننھیال میں آپ کے ایک ماموں کے پاس تھا، ۳۷ واسطوں سے آپ کا سلسلۂ نسب صحابی رسول و میزبان رسول حضرت ابو ایوب انصاری مدنی رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے شجرۂ نسب درج ذیل ہے:

مولانا رشید احمد
↓
کریم النساء
↓
فرید بخش
↓
غلام قادر
↓
محمد صالح
↓
غلام محمد
↓
فتح محمد
↓
تقی محمد
↓
صالح محمد
↓
قاضی محمد کبیر الانصاری
↓
قاضی امین الدین
↓
خواجہ فرید
↓
خواجہ شاہ
↓
خواجہ محمد فاضل
↓
خواجہ محمد ہاشم
↓
خواجہ علاء الدین
↓
خواجہ رکن الدین
↓
خواجہ نجم الدین
↓
خواجہ شرف الدین
↓
خواجہ مجد الدین
↓
خواجہ عبد المجید
↓
خواجہ کبیر
↓
خواجہ رکن الدین
↓
خواجہ شرف الدین
↓
خواجہ تاج الدین
↓
خواجہ منہاج الدین
↓
خواجہ ہاشم بزرگ
↓
اسماعیل
↓
خواجہ عبد اللہ براتی
↓
خواجہ ابو محمد منصور
↓
خواجہ علی
↓
خواجہ محمد
↓
خواجہ احمد
↓
خواجہ جعفر
↓
ابو منصور
↓
ایوب
↓
شیخ ابو ایوب انصاری
میزبان رسولؐ

والدِ محترم

امام ربانی کے والد کا نام مولانا ہدایت احمد تھا، وہ صاحب علم وفضل تھے
آپ کو خاندان ولی اللّٰہی سے شرف تلمذ حاصل تھا، اپنے وقت کے مشہور
بزرگ اور شیخ طریقت شاہ غلام علی مجددی نقشبندی سے بیعت تھے، بہت
ہی خوش خط اور زود نویس تھے، آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں آپ
کے خاندان میں محفوظ تھیں، اپنے شیخ کے خلیفہ اور مجاز بیعت تھے، بسلسلۂ
ملازمت آپ کا قیام گورکھپور میں زیادہ رہتا تھا، سال میں دو تین بار وطن
گنگوہ آتے تھے اور کچھ دنوں قیام کر کے پھر گورکھپور واپس ہو جاتے تھے،
آپ نے عمر بہت کم پائی، ۳۵ سال کی عمر میں جمادی الاول ۱۲۵۲ھ مطابق
۱۸۳۶ء میں گورکھپور ہی میں انتقال ہوا، اس وقت حضرت گنگوہی کی عمر
صرف سات سال کی تھی۔

تعلیم وتربیت

چوں کہ آپ کا ننھیال بھی گنگوہ ہی میں تھا اس لیے والد صاحب کے
انتقال کے بعد آپ کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری آپ کے ماموں نے لی،
آپ کے ایک ماموں مولوی محمد تقی کرنال میں بسلسلۂ ملازمت رہتے تھے
وہ حضرت گنگوہی کو اپنے ساتھ کرنال لے گئے اور آپ کو خود ہی فارسی
پڑھانی شروع کر دی کچھ فارسی کی کتابیں مولوی محمد غوث صاحب سے پڑھیں۔
فارسی بقدر ضرورت پڑھ لینے کے بعد آپ کے دادا قاضی پیر بخش
نے اپنے آبائی وطن رام پور کے باصلاحیت استاد مولوی محمد بخش کے پاس
بھیج دیا، مولوی صاحب موصوف نے آپ کو عربی کی ابتدائی کتابیں
شروع کرائیں اور ہدایۃ النحو ختم کرا دی، اس سے زیادہ تعلیم کے لیے نہ رامپور

میں کوئی ذریعہ تھا اور نہ گنگوہ میں، مولوی محمد بخش صاحب نے قاضی پیر بخش کو مشورہ دیا کہ اب ان کو دہلی بھیج دیا جائے، آپ کے دادا نے اس مشورے کو پسند کیا اور آپ کو دہلی بھیج دیا اور اخراجات کے لیے تین روپئے ماہوار برابر بھیجتے رہے، انھیں تین روپیوں میں کھانے پینے کے علاوہ ساری ضروریات پوری کرتے تھے۔

امام ربانی دہلی میں

جب آپ دہلی گئے تو آپ کی عمر ۱۷ سال کی ہو چکی تھی اور تعلیم صرف ہدایۃ النحو تک تھی، آپ سے ایک سال قبل ۱۲۶۰ھ - ۱۸۴۴ء میں نانوتہ کے مولانا محمد قاسم نانوتوی بغرض تعلیم دہلی جا کر عربک کالج میں داخل ہو کر اپنے ہی خاندان کے ایک بزرگ استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی نانوتوی (۱) سے تعلیم حاصل کر رہے تھے، امام ربانی ان سے ایک سال بعد ۱۲۶۱ھ - ۱۸۴۵ء میں دہلی گئے، حضرت نانوتوی کی کافیہ چل رہی تھی، حضرت گنگوہی ابتداءً مولانا احمد الدین جہلمی اور بعض دوسرے بزرگوں سے تعلیم حاصل کرتے رہے، لیکن طرز تعلیم کی طرف سے آپ مطمئن نہیں تھے اس لیے کچھ دنوں کے بعد آپ حضرت نانوتوی کے ساتھ مولانا مملوک علی نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور عربک کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس دوران اتنی علمی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی کہ آپ کافیہ میں حضرت نانوتوی کے ساتھ کر دیے گئے اور دونوں حضرات ایک ساتھ

---

(۱) مولانا مملوک علی نانوتوی کا وطن نانوتہ ضلع سہارن پور تھا، انگریزی حکومت نے مشرقی علوم کی تعلیم کے لیے دہلی میں عربک کالج کھولا تھا، آپ اس کے صدر المدرسین تھے اور ساری زندگی اسی منصب پر رہے آپ کے ممتاز شاگردوں میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی بانیِ دار العلوم دیوبند امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی اور سر سید بانیِ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ وغیرہ شامل ہیں، آپ کی وفات ۱۲۶۷ھ - ۱۸۵۰ء میں ہوئی۔
(کاروانِ رفتہ، ص: ۲۳۶)

ایک جماعت میں پڑھنے لگے، پھر تو بہت تیز رفتاری کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

اساتذۂ کرام

دہلی میں اگرچہ علمی محفلیں بتدریج اُجڑتی جا رہی تھیں، شاہ اسحاق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۵۷ھ-۱۸۴۱ء میں بہ نیتِ ہجرت مکہ مکرمہ جا چکے تھے۔ شاہ یعقوب دہلوی نے بھی حجاز کے لیے رختِ سفر باندھ لیا تھا، لیکن ابھی خاندان ولی اللٰہی کے فیض یافتوں میں شاہ ابو سعید مجددی اور ان کے صاحبزادے شیخ عبد الغنی مجددی موجود تھے جن سے درس حدیث کی مجلس کی آبرو باقی تھی، دوسرے علوم و فنون میں مفتی صدر الدین صدر الصدور (۱) اور مولانا فضل حق خیر آبادی (۲) کی علمی مجلسیں قائم

---

(۱) مفتی صدر الدین آزردہ کی ولادت دہلی میں ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء میں ہوئی بہت ہی جید اور عظیم عالم تھے، ان کے اساتذہ میں شاہ عبد العزیز محدث دہلوی شاہ رفیع الدین دہلوی، شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی اور امام المعقول مولانا فضل امام خیر آبادی شامل ہیں۔ مغلیہ دور حکومت میں انتہائی معزز و محترم اور صدر الصدور کے عظیم منصب پر فائز تھے، علم و فضل میں بہت بلند مقام رکھتے تھے اردو فارسی ادب کا ذوق بڑا پاکیزہ اور بلند تھا، دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے شعر و شاعری کے بہترین نقاد تھے، صدر الصدور کے بلند منصب پر رہتے ہوئے بھی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا تھا اس وقت کے بہت سے مشاہیر اہل علم کو آپ سے شرف تلمذ حاصل تھا، ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے شکنجہ عذاب میں گرفتار ہوئے، عہدے سے معزول کر دیے گئے ان کی تمام جائداد بحق سرکار ضبط کر لی گئی، بس پھانسی سے بچ گئے بڑی عسرت کی زندگی گذار کر جولائی ۱۸۶۸ء میں انتقال کیا۔

(۲) مولانا فضل حق کی ولادت خیر آباد ضلع سیتاپور میں ۱۲۱۲ھ-۱۷۹۷ء میں ہوئی منطق و فلسفہ کے امام، خیر آبادی اسکول کے گل سرسبد، حکومت مغلیہ کی طرف سے معزز عہدے پر فائز تھے۔ انگریزی حکومت کے خلاف ۱۸۵۷ء میں ایک فتویٰ پر دستخط کرنے کی وجہ سے گرفتار ہوئے اور کالے پانی بھیجے گئے جہاں وہ ایک عرصہ تک بہت عبرتناک زندگی گذار کر راہی ملک بقا ہوئے، جزیرہ انڈمان میں انھوں نے الثورۃ الہندیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں آپ نے اپنی روداد غم لکھی ہے۔ ۱۲۷۸ھ-۱۹/اگست ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا۔ (کاروان رفتہ، ص: ۲۱۰)

تھیں، حضرت گنگوہی نے یوں تو بیشتر کتابیں مولانا مملوک علی نانوتوی سے ہی پڑھی تھیں لیکن بعض کتابیں مفتی صدر الدین صدر الصدور سے بھی پڑھی تھیں، ابتدائی دور میں جب آپ دہلی پہونچے تھے تو قاضی احمد الدین پنجابی دہلوی کے حلقۂ درس میں بھی شامل ہوئے تھے، اس طرح مختلف علوم وفنون مختلف اساتذہ سے حاصل کیے۔

علمِ حدیث

علمِ حدیث کے لیے حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کی نگاہِ انتخاب اس دور کے مشہور محدث اور صاحب درس اور خاندان ولی اللہ کے فیض یافتہ شاہ عبد الغنی مجددی (۱) پر پڑی، اس لیے جب دوسرے علوم وفنون کی تعلیم حاصل کر چکے تھے تو علم حدیث کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور صحاح ستہ ان سے پڑھ کر انھیں سے سند حدیث حاصل کی۔

سندِ حدیث

حضرت گنگوہی چار سال دہلی میں رہے ۱۲۶۱ھ میں آپ دہلی پہونچے اور کافیہ سے تعلیم کا آغاز کیا اس وقت آپ کی عمر ۱۷ سال تھی اور جب آپ کی عمر ۲۱ سال ہوئی تو ۱۲۶۴ھ میں سندِ حدیث شاہ عبد الغنی مجددی

(۱) شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی مشہور محدث وبزرگ شاہ ابو سعید مجددی کے صاحبزادے تھے، شاہ ابو سعید نے حدیث شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سے پڑھی تھی شاہ عبد الغنی مجددی مجدد الف ثانی سرہندی کے خاندان سے تھے، اسی لیے وہ مجددی کہے جاتے ہیں انھوں نے حدیث کی بعض کتابیں اپنے والد ابو سعید مجددی سے پڑھی تھیں اور بعض کتابیں شاہ اسحاق محدث دہلوی سے پڑھیں اب دہلی میں انھیں کا حلقۂ درس سب سے مشہور تھا، کچھ ہی دنوں کے بعد انھوں نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی، وہاں بھی درس حدیث کا سلسلہ جاری رکھا لیکن زیادہ اوقات اوراد وظائف اور یاد الٰہی میں بسر کرتے تھے، مدینہ منورہ میں ۶/ محرم ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں بعمر ۶۰ سال وفات ہوئی اور جنت البقیع میں آسودۂ خواب ہوئے، آپ کی علمی یادگار ابن ماجہ کا حاشیہ ہے جو انجاح الحاجہ کے نام سے ہے۔ (کاروان رفتہ ص: ۱۷۳)

سے لے کر اپنے وطن گنگوہ واپس ہو گئے، آپ نے حدیث کی اکثر کتابیں اپنے والد شاہ ابو سعید مجددی سے پڑھیں، بخاری شریف آپ نے شاہ اسحاق محدث دہلویؒ سے پڑھی تھی اس لیے آپ کی سندِ حدیث دونوں سلسلوں میں دو واسطوں سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک پہونچتی ہے، حضرت گنگوہی نے حدیث شاہ عبد الغنی مجددی سے، انھوں نے اپنے والد ابو سعید مجددی سے، انھوں نے شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سے، انھوں نے شاہ ولی اللہ محدث سے حدیث پڑھی، دوسری سند میں حضرت گنگوہی کے استاذ شاہ عبد الغنی مجددی ان کے استاذ شاہ اسحاق محدث دہلوی ان کے استاذ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ان کے استاذ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں۔

اساتذہ کی شفقت

ذہین اور شوقین طلبہ پر اساتذہ کی خصوصیت کے ساتھ نگاہ توجہ ہوتی ہے، استاد اور شاگرد کے درمیان ایک قلبی رابطہ ہو جاتا ہے ایک طرف سے غایت ادب و احترام، دوسری طرف سے شفقت و عنایت فطری بات ہے، شاگرد اپنے استاذ کے ساتھ عقیدت وارادت اور ادب و احترام کا پاس و لحاظ رکھتا ہے تو استاد کی طرف سے شفقت و عنایت ملتی ہے، حضرت گنگوہی بھی انھیں طلبہ میں سے تھے جن پر اساتذہ کی ہمیشہ نظر عنایت رہی، شاہ عبد الغنی مجددی نے ایک بار درس میں دیکھا کہ حضرت گنگوہی درس میں موجود نہیں، دریافت سے معلوم ہوا کہ وہ علیل ہیں، شاہ صاحب اسی دن حضرت گنگوہی کی قیام گاہ پر آئے، عیادت فرمائی اور تسلی و تشفی دی، فراغت کے بہت بعد ایک بار حضرت گنگوہی دہلی گئے اور اپنے استاد مفتی صدر الدین صدر الصدور سے ملاقات کے

لیے گئے، وہ حکومت میں بڑے معزز عہدے پر فائز تھے لیکن انھوں نے اپنے شاگرد سے اصرار کیا کہ وہ کھانا ان کے ساتھ کھائیں، انھوں نے بڑی مشکل سے حضرت گنگوہی کی معذرت منظور فرمائی۔

ایامِ طالب علمی میں

طالب علمی کا پورا دور آپ نے انتہائی پاکبازی، پابندی اوقات درس و مطالعہ اور بحث و مباحثہ میں گذارا، اکثر اساتذہ کی خصوصی شفقتیں آپ کو حاصل رہیں، علمی ذوق و شوق شباب پر تھا، حضرت نانوتوی سے اکثر کسی نہ کسی مسئلہ پر بحث و مباحثہ چل پڑتا تھا اور دونوں میں جوش و خروش سے بحثیں شروع ہو جاتی تھیں، طلبہ جمع ہو جاتے، دلچسپی سے دونوں کی علمی معرکہ آرائی کو سنتے اور لطف اندوز ہوتے، کبھی کبھی اساتذہ بھی ان بحثوں کے بارے میں سنتے اور اپنے خیال کا اظہار بھی فرماتے، وہ کہتے تھے کہ حضرت نانوتوی اپنی ذہانت و فطانت، حاضر دماغی اور زور بیان کی دھوم دھام کی وجہ سے بحث میں غالب رہتے ہیں لیکن حضرت گنگوہی کا نقطۂ نگاہ صحیح ہے اور ان کے دلائل مضبوط ہیں، یہ علمی بحثیں فاضل اوقات میں اکثر ہوتی رہتی تھیں یہ علمی مباحثے طلبہ کی علمی ترقی کا زینہ ہوتے ہیں۔

تدریس کا آغاز

منتہی طلبہ اگر ذہین ہیں اور ان میں افہام و تفہیم کا مادہ موجود ہے تو دوران تعلیم بھی وہ چھوٹی جماعتوں یا ایک دو طالب علموں کو خارج اوقات میں پڑھانے لگتے ہیں، حضرت گنگوہی بھی اپنی ذہانت و فطانت اور علمی صلاحیتوں میں ممتاز تھے اس لیے جب بعض طلبہ نے آپ سے بعض کتابوں کو پڑھانے کے لیے کہا تو آپ نے بخوشی وہ کتاب خارج اوقات

میں پڑھادی، دہلی میں تعلیم حاصل کرتے ہوے ایک جماعت کو آپ نے پڑھانا شروع کردیا جس میں ملا محمود دیوبندی بھی شریک تھے جو دار العلوم دیوبند قائم ہونے کے بعد اس کے سب سے پہلے مدرس بنائے گئے، وہ فراغت کے بعد میرٹھ میں فرائض تدریس انجام دے رہے تھے۔ جب حاجی عابد حسین صاحب نے خط لکھ کر حضرت نانوتوی سے مدرس مانگا تو آپ نے انھیں ملا محمود کو بلا کر فرمایا کہ آپ یہاں کی ملازمت ترک کر کے دیوبند چلے جائیں اور جو نیا مدرسہ قائم ہوا ہے اس میں کارِ تدریس شروع کردیں۔ چنانچہ وہ فوراً دیوبند گئے اور ایک طالب علم محمود حسن دیوبندی سے مدرسے کا آغاز کیا اور یہی طالب علم بعد میں شیخ الہند ہوے۔

امام ربانی کے ماموں زاد بھائی مولوی ابوالنصر جو عمر میں آپ سے دو سال چھوٹے تھے ان کو بھی اپنی طالب علمی کے زمانے میں کچھ کتابیں پڑھائیں اسی طرح ایک دوسرے ماموں زاد بھائی مولوی ابوالقاسم گنگوہی کو بھی اسی دور میں پڑھایا تھا جو بعد میں محکمہ پولیس میں انسپکٹر ہوے۔

امام ربانی گنگوہ میں

جب آپ ۲۱ سال کی عمر میں سند فراغت لے کر وطن آئے تو یہاں کوئی مصروفیت نہیں تھی، اس لیے آپ نے یہاں اپنے گھر پر کچھ طلبہ کو پڑھانا شروع کردیا۔ سید مومن علی حضرت گنگوہی کے اسی ابتدائی دور کے شاگردوں میں تھے دوسرا کام یہ کیا کہ از خود بغیر استاد کلام پاک حفظ کرنا شروع کردیا، آپ کا جو وقت بھی خالی بچتا آپ ایک گوشہ میں بیٹھ کر حفظ کرتے رہے، چوں کہ زیادہ وقت اسی مقدس مشغلہ میں صرف ہوتا تھا، اپنے شوق اور دل کے تقاضے سے یہ کام شروع کیا تھا اس لیے بہت تھوڑی مدت میں آپ نے پورا قرآن حفظ کرلیا اور اسی سال آپ نے اپنی مسجد میں محراب سنائی۔

شادی

آپ کے چار ماموں تھے ان میں سب سے بڑے ماموں محمد تقی تھے انھیں کی صاجزادی خدیجہ خاتون سے آپ کا رشتہ آپ کے خاندان والوں نے طے کر رکھا تھا، اس لیے تعلیم سے فراغت کے بعد نہایت سادگی کے ساتھ یہ رشتہ ازدواج قائم ہو گیا، شادی کے بعد قدرتی طور پر یہ احساس پیدا ہوا کہ معاش و معیشت کی کوئی سبیل پیدا کی جائے اور اخراجات کی ذمہ داری خود اٹھائی جائے، مگر بعض اسباب کی وجہ سے اس مسئلہ میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔

باب ۳

حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی کی خدمت میں

حضرت گنگوہی کے علم وفضل کی شہرت عہد شباب ہی میں ہو گئی تھی مسائل میں آپ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، دقیق علمی مسئلوں میں آپ کی رائے معلوم کی جاتی تھی، اہل علم کو اگر حضرت گنگوہی کی کسی مسئلہ میں تائید حاصل ہو جاتی تو اس کو بڑی اہمیت دیتے تھے جب کہ آپ نے کہیں بڑی جگہ نہ تدریسی خدمت انجام دی تھی اور نہ آپ کسی خانقاہ یا شیخ سے وابستہ تھے اور نہ کسی مختلف فیہ مسئلہ میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا کہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ سامنے آگیا۔

مولانا محمد تھانوی سے مباحثہ کا ارادہ

شیخ محمد تھانوی عالم بھی تھے اور مشہور شیخ طریقت شیخ میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہی نہیں تھے بلکہ خلیفہ مجاز بھی تھے اس طرح شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی تھے، انھوں نے یہ مسئلہ لکھا کہ روضۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک جگہ خالی ہے اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام دفن ہوں گے، یہ امر قطعی ہے اور ایسا ہے ویسا ہے اس سلسلہ میں آپ نے متعدد روایتوں کا ذکر کیا تھا اس طرح انھوں نے اس کو عقیدہ کا مسئلہ بنادیا تھا، تحریر میں ادعائی انداز تھا۔ یہی تحریر کسی نے حضرت گنگوہی کی خدمت میں پیش

کر دی اور مسئلہ کی صحیح صورت حال معلوم کی، حضرت گنگوہی نے اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ مسئلہ کے اثبات میں صرف اخبار آحاد پیش کی گئی ہیں جو مفید ظن ہوتی ہیں کسی عقیدہ کے لیے نص قطعی ہونی ضروری ہے، اس لیے قطعیت کے ساتھ اس عقیدہ کا اظہار درست نہیں۔

یہ جواب کسی نے شیخ محمد تھانوی تک پہونچادیا، وہ جواب سن کر سخت برہم ہوے اور اس تحریر کے جواب میں انھوں نے پورا ایک رسالہ لکھ کر شائع کر دیا یہ رسالہ بھی حضرت گنگوہی تک پہونچایا گیا، حضرت گنگوہی نے رسالہ دیکھ کر فرمایا کہ میں نے جو بات پہلے کہی ہے اب بھی وہی کہتا ہوں کیوں کہ اس رسالہ میں پہلی تحریر کے مقابلہ میں کوئی اضافہ نہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس مسئلہ پر کوئی نص قطعی پیش ہی نہیں کی جاسکتی، حضرت شیخ سے یہاں چوک ہو گئی اس جواب پر ان کی برہمی میں اور اضافہ ہو گیا جس کی خبر حضرت گنگوہی کو پہنچی، عنفوان شباب کا زمانہ تھا، علم تازہ اور مستحضر تھا جوش اظہار حق میں انھوں نے فیصلہ کیا کہ حضرت شیخ مولانا محمد تھانوی سے بالمشافہ گفتگو کر لی جاے۔

اتفاق امر انھیں دنوں ایک تقریب کے سلسلے میں رام پور جانا تھا سوچا کہ تقریب میں شرکت کے بعد ایک دن کے لیے تھانہ بھون جا کر براہ راست گفتگو کر لی جاے چناں چہ حسب پروگرام حضرت گنگوہی رام پور تشریف لے گئے اور تقریب میں شرکت کے بعد آپ تھانہ بھون پہنچے۔

حاجی امداد اللہ تھانوی کی خدمت میں

شیخ محمد تھانوی سے ملاقات سے قبل حضرت شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی کی خدمت میں شرف زیارت حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوے، ملاقات ہوئی خیر و عافیت معلوم کرنے کے بعد حضرت

حاجی صاحب(۱) نے حضرت گنگوہی سے مقصد سفر پوچھا تو آپ نے صورت حال بتائی اور اس خیال کا اظہار کیا کہ میں ان سے بالمشافہ گفتگو کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں حضرت حاجی صاحب نے فرمایا، وہ ہمارے بڑے ہیں، اپنے بڑوں کا ادب و احترام کرنا چاہیے، ان سے بحث مباحثہ نہیں کرنا چاہیے، یہ مناسب نہیں حاجی صاحب نے جس خلوص اور جس درد کے ساتھ یہ بات کہی اس نے حضرت گنگوہی کی ذہنی کیفیت ایک دم پلٹ دی، حضرت حاجی صاحب ایک عظیم اور مشفق مصلح کے بلند مقام پر نظر آئے، نوجوانی کے جوش میں کیا ہوا فیصلہ ایک دم بدل گیا اور دو جملوں نے ذہنی فضا کو صاف کر دیا، دل نے سرگوشی کی کہ اس عظیم ترین شخصیت سے استفادہ کا رشتہ مستحکم کر لیا جائے تو دین و دنیا دونوں کی سعادتیں حاصل ہو سکتی ہیں، دل نے دماغ کو بھی متاثر کر کے اپنا ہم نوا بنا لیا، پھر دونوں نے فیصلہ کیا کہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں بیعت کی درخواست

---

(۱) شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی اپنے دور کے ایک جلیل القدر شیخ طریقت تھے، علماء کا ایک طبقہ ان سے بیعت کر کے ان کے درس عقیدت سے وابستہ تھا حکیم الامت اشرف علی تھانوی امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی شارح ابو داؤد مولانا خلیل احمد انبیٹھوی جیسے اساطین اُمت ان کے خدام میں شامل تھے علم ظاہر کی تعلیم مختلف مقامات پر حاصل کی آپ کے اساتذہ میں مولانا الٰہی بخش کاندھلوی بھی ہیں زیادہ تر کتابیں انھیں سے پڑھیں درمیان ہی میں تعلیم کا سلسلہ رک گیا اور تکمیل نہ کر سکے آپ دہلی چلے گئے وہاں شیخ نصیر الدین شافعی کی خدمت میں ایک عرصہ تک رہے پھر مشہور شیخ طریقت میاں جی نور محمد جھنجھانوی کی خدمت میں رہے اور ان سے سلوک و طریقت اور تزکیہ باطن کی تعلیم حاصل کی اور ان کے خلیفہ ہوئے شیخ کے حکم سے آپ نے ارشاد و تلقین کا آغاز کیا۔ آپ کا مستقل قیام تھانہ بھون میں رہا غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے علماء کی ایک جماعت نے آپ کو امیر المومنین بنایا آپ ہی کی قیادت میں شاملی تحصیل پر حملہ ہوا اور انگریزی فوج کو شکست ہوئی آپ کے نام وارنٹ جاری ہوا مگر آپ گرفتار نہ ہو سکے بڑی مصیبتوں کے بعد مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور ہجرت کی نیت سے وہیں مقیم ہو گئے، مکہ مکرمہ ہی میں ۱۳۱۷ھ-۱۸۹۹ء میں وفات پائی اور اسی مقدس سرزمین میں مدفون ہوئے۔ (کاروان رفتہ، ص: ۳۴)

پیش کر دی جائے حضرت گنگوہی نے درخواست پیش کر دی۔

حضرت حاجی صاحب سے پہلا تعارف

حضرت گنگوہی حضرت حاجی صاحب سے اپنے دور طالب علمی سے واقف تھے۔ واقف ہی نہیں بلکہ دل کے ایک گوشہ میں ان کی عظمت، ان کے زہد وورع، ان کے تقدس کا اعتراف موجود تھا اور ان کی بزرگی اور ان کی زاہدانہ زندگی سے متاثر تھے، حضرت حاجی صاحب سے ذہنی قربت پیدا کرنے اور ان کی عظمت کے احساس کی بنیاد حضرت گنگوہی کے مخلص دوست، رفیق درس حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ڈالی تھی، حضرت نانوتوی حاجی صاحب سے بہت قریب سے واقف تھے کیوں کہ حضرت حاجی صاحب کا ننہیال حضرت نانوتوی کے خاندان میں تھا اور حضرت حاجی صاحب کی ایک بہن نانوتہ میں بیاہی تھیں اس لیے حضرت حاجی صاحب کی نانوتہ حاضری ہوتی رہتی تھی، حضرت نانوتوی اپنے ایک بزرگ اور بڑے کی حیثیت سے آپ سے ملتے رہتے تھے، رشتہ داری کی وجہ سے اس طرح بے تکلف تھے جیسے بچہ اپنے باپ دادا سے بے تکلف ہوتا ہے، حاجی صاحب ایک ہونہار بچہ سمجھ کر ان پر شفقت فرماتے رہتے تھے یہاں تک کہ آپ نے اس بچے کو کتاب کی جلد بندی بھی سکھائی اس لیے حضرت نانوتوی کا دل حضرت حاجی صاحب کے ادب واحترام سے ہمیشہ لبریز رہتا تھا۔

یہ کیسے حاجی صاحب ہیں؟

حضرت گنگوہی کے دل پر پہلا نقش حضرت حاجی صاحب کی عظمت کا اس وقت بیٹھا جب آپ دہلی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، واقعہ یہ ہوا کہ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی نے حضرت الاستاد مولانا مملوک علی

نانوتوی سے درخواست کی کہ ہمیں سلّم پڑھادی جائے۔ مولانا موصوف نے فرمایا کہ میرے یہاں وقت نہیں ہے بس ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ تم لوگ سوموار اور جمعرات کو آجاؤ تو میں پڑھادیا کروں گا، ہفتہ میں بس دو دن یہ حضرات سلّم پڑھتے تھے چوں کہ بڑی مشکلوں سے یہ وقت ملا تھا اس لیے بڑی دلچسپی اور لگن اور پابندی کے ساتھ وقت پر حاضر ہوکر سبق پڑھ لیا کرتے تھے، اتفاقاً ایک دن یہ حضرات سلّم پڑھنے کے لیے حاضر ہوئے تو دیکھا کہ ایک شخص معمولی لباس میں آتا ہوا نظر آیا جو بظاہر کسی گاؤں کا معلوم ہوتا تھا، حضرت الاستاد کی نظر جوں ہی اس شخص پر پڑی فوراً ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا حضرت حاجی صاحب تشریف لارہے ہیں، اب تم لوگوں کا سبق ہوچکا اور کتاب بند کرکے استقبال کے لیے آگے بڑھ گئے۔

حضرت گنگوہی کو بڑی ذہنی کوفت ہوئی کہ بڑی مشکلوں سے تو یہ وقت ملا تھا اور آج کا وقت ضائع ہوگیا آپ نے بدمزگی کے احساس کے ساتھ اپنے ساتھی حضرت نانوتوی سے فرمایا معلوم نہیں یہ کون حاجی آگیا کہ ہمارا سبق ہی ختم ہوگیا، حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ ادب سے نام لو، یہ بڑے بزرگ ہیں، بڑے اللہ والے ہیں، تھانہ بھون کے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ہیں، تمام لوگ ان کا بڑا احترام کرتے ہیں حضرت نانوتوی نے تفصیل سے تعارف کرایا، حضرت گنگوہی بہت متاثر ہوئے اور خاموش ہوگئے۔

اس واقعہ کے بعد حضرت نانوتوی جب دہلی سے وطن جاتے اور اپنے وطن سے دہلی آتے تو ہربار تھانہ بھون جاکر حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور شرف ملاقات حاصل کرتے اور جب دہلی آتے تو حضرت گنگوہی سے گھنٹوں حضرت حاجی صاحب کے فضائل و مناقب بیان فرماتے۔ قدرتی طور پر حضرت گنگوہی ان باتوں سے متاثر ہوتے اور بتدریج ان کی عظمت دل میں بیٹھ گئی۔

عقیدت وخلوص کی تاثیر

حضرت نانوتوی کی مسلسل تعریف وتوصیف اور حضرت حاجی صاحب کے مقام ومرتبہ کے اظہار وبیان سے دل کی گہرائیوں میں ان کی عظمت بیٹھ گئی اور جب آپ نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو دل میں پیوست عقیدت نے برگ وبار لانا شروع کردیا، جذبہ تقاضا بن گیا، دل کے فیصلے کی دماغ نے تائید کی تو پھر ہر طرف سے یکسو ہو کر حضرت گنگوہی کی ساری توجہ حضرت حاجی صاحب کی طرف منعطف ہو گئی اور فیصلہ کرلیا کہ اگر بیعت ہونا ہے تو صرف حضرت حاجی صاحب سے بیعت کی جائے گی، شیخ محمد تھانویؒ سے بالمشافہ بحث کے جذبے کے ساتھ دل کے ایک گوشے میں حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہونے کا بھی جذبہ تھا، اگرچہ گنگوہ سے چلتے ہوئے عزم مصمم نہیں تھا لیکن جب حضرت حاجی صاحب نے بحث ومباحثہ سے روکا اور اپنے بڑوں کی عزت وتوقیر اور ادب واحترام کا پہلا سبق پڑھایا تو ایک دم ذہنی کیفیت بدل گئی اور دل نے بے چین کردیا کہ جلد سے جلد اپنا ہاتھ حاجی صاحب کے ہاتھ میں دے دینا چاہیے، آپ نے درخواست کی کہ حضرت مجھے بیعت کرلیا جاے اور اپنے خدام میں شامل کرلیا جاے۔

خلوص اور سچی طلب کا امتحان

حضرت حاجی صاحب علماء کو بیعت کرنے میں عجلت نہیں فرماتے تھے اس لیے جب حضرت گنگوہی نے بیعت کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا، ذرا سوچ لیجیے، خوب غور وفکر کرلیجیے، گویا آپ نے درخواست کو ٹال دیا اور بہت بے نیازی کا اظہار فرمایا، لیکن حضرت گنگوہی دل کے

تقاضوں سے مجبور ہو کر حاضر ہوئے تھے اس لیے نامراد و ناکام واپس جانے کے لیے بھی تیار نہ تھے، اسی کشمکش میں تین دن گذر گئے، تیسرے دن حضرت حاجی صاحب کے پیر بھائی اور مقرب ترین بزرگ حضرت حافظ ضامن شہیدؒ تشریف لائے اور حضرت گنگوہی سے تھانہ بھون حاضری کی وجہ پوچھی، آپ نے مقصد سفر اور صورت حال بتائی، اس کے بعد حضرت حافظ صاحب نے فرمایا کہ کسی مناسب وقت میں حضرت حاجی صاحب سے ذکر کروں گا، چناں چہ انھیں کی سفارش پر حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی کو سلاسل اربعہ میں بیعت کر لیا۔

دل کی دنیا بدل گئی

بیعت کے بعد حضرت گنگوہی نے عرض کیا کہ مجھ سے معمولات کی پابندی نہیں ہو سکے گی، حاجی صاحب نے فرمایا، کوئی مضائقہ نہیں جب کہ آپ کو دوازدہ تسبیح کی تلقین کی جا چکی تھی، عشاء کی نماز کے بعد جب حضرت گنگوہی اپنی چارپائی پر جانے والے تھے کہ حضرت حاجی صاحب نے خادم سے فرمایا کہ مولانا گنگوہی کی چارپائی میری چارپائی کے قریب کر دو، چناں چہ مُرشد و مُسترشد دونوں قریب قریب کی دو چارپائیوں پر استراحت فرما ہوئے، رات کے پچھلے پہر حضرت حاجی صاحب اپنے معمولات کے لیے بیدار ہوئے اور وضو کر کے مسجد تشریف لے گئے تو حضرت گنگوہی کی بھی آنکھ کھل گئی، مگر کروٹ بدلتے رہے، مگر حاجی صاحب نے ان سے کچھ نہیں فرمایا تھا آپ خود چلے گئے، حضرت گنگوہی کے دل نے گوارا نہ کیا کہ مرشد تو اپنے معمولات میں لگ جائے اور مسترشد بستر پر رہے، بالآخر خود اُٹھ گئے اور وضو کر کے مسجد چلے گئے، حضرت حاجی صاحب مسجد کے ایک گوشے میں معمولات کی ادائیگی میں مصروف تھے، آپ نے

مسجد کے دوسرے گوشہ میں ذکر بالجہر شروع کر دیا۔

دوسرے دن حضرت حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی کے عمل کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور آپ کے بارے میں کلمات خیر کہے۔

ایک ہفتہ قیام

حضرت گنگوہی جب گھر سے چلے تھے تو ارادہ تھا کہ دوسرے دن گنگوہ واپس ہو جاؤں گا، اس لیے کپڑے کا دوسرا جوڑا بھی اپنے ساتھ نہیں رکھا تھا اور یہاں صورت حال ایسی بن گئی کہ پاؤں میں زنجیر پڑ گئی، کپڑے میلے ہو گئے، مگر بدلنے کے لیے دوسرا جوڑا بھی نہیں تھا، نئی زندگی پا کر دل یہاں سے جانے کے لیے آمادہ نہیں تھا، نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھیرا جائے ہے مجھ سے ایک ہفتہ بعد حضرت گنگوہی نے عرض کیا کہ اب گنگوہ واپسی کا ارادہ ہے، حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ ذرا ٹھہریے، پھر چلے جایئے گا، حضرت گنگوہی نے واپسی کا خیال دل سے نکال دیا، نو دس دنوں کے بعد حاجی صاحب نے فرمایا کہ مولوی رشید احمد صاحب مجھے جو کچھ حاصل تھا وہ میں نے آپ کو دے دیا، حضرت گنگوہی حیرت زدہ تھے کہ آپ نے کیا دیا اور مجھے کیا ملا؟

خدمت مرشد میں ۴۰ دن

روز واپسی کا ارادہ کرتے اور ارادہ فسخ کرتے اگر ایک طرف سے ارادہ ہوتا تو دوسری طرف سے ایسا جواب ہوتا جس سے معلوم ہوتا کہ ٹھہرنا مناسب ہے، اگر حاجی صاحب کی طرف سے پوچھا جاتا تو حضرت گنگوہی فرماتے کہ جلد ہی چلا جاؤں گا، اس حیص بیص میں دن گذرتے رہے اور چالیس دن ہو گئے، تب حضرت گنگوہی نے عرض کیا کہ اب مجھے گنگوہ ہی

جانا چاہیے، حضرت حاجی صاحب نے فرمایا، ٹھیک ہے کل چلے جائیں۔
بیالیسویں دن حضرت گنگوہی نے تیاری کی، بیل گاڑی کا انتظام ہوا حضرت حاجی صاحب اور آپ کے خدام مشائعت کے لیے چلے، حضرت گنگوہی کی طبیعت ان دنوں کچھ علیل تھی اور کمزوری تھی۔ اور پیدل چلنے میں دشواری محسوس کر رہے تھے لیکن شیخ کی موجودگی میں بیل گاڑی پر بیٹھنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی کہ یہ ادب واحترام کے خلاف ہے اور حضرت حاجی صاحب کے تقاضوں کے باوجود سواری پر نہیں بیٹھے، جب حاجی صاحب نے محسوس فرمایا کہ ان کو پیدل چلنے میں تکلیف ہو رہی ہے تو حضرت گنگوہی کو ایک طرف لے جا کر آہستہ سے فرمایا کہ اگر کوئی آپ سے بیعت ہونے کے لیے آئے تو اس کو بیعت کر لیجیے گا، حضرت گنگوہی نے عرض کیا کہ مجھ سے کون بیعت ہو گا؟ حاجی صاحب نے فرمایا جو میں کہہ رہا ہوں وہ کیجیے گا، یعنی چالیس دن کی ریاضت کے بعد آپ کو خلعت خلافت دے دی گئی۔

ذہنی وفکری انقلاب

علم ظاہر کی روشنی سے شریعت کی راہیں روشن ہو جاتی ہیں اگر دل و دماغ اس روشنی میں صراط مستقیم کو پا کر اس پر رہروی کو زندگی کا مشن بنالیا تو خود اس کی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتی ہے جو شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ ہے اور دوسروں کو بھی اس سانچے میں ڈھالنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، اگر علوم ظاہر کے ساتھ دل میں انقلاب پیدا کرنے والا علم باطن بھی حاصل ہو جائے جو سلوک وطریقت کے دبستانوں سے حاصل ہوتا ہے تو اس کی مثال اس تلوار کی ہو جاتی ہے جس پر ابھی ابھی سان چڑھائی گئی ہو اب وہی شخص منکرات وسیئات کے خلاف علم جہاد بلند

کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اب وہ شخص برائیوں کی صرف مذمت بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس میں شمشیر براں کی کاٹ پیدا ہو جاتی ہے بیعت وسلوک سے ایمانی زندگی میں یہی انقلاب برپا ہو جاتا ہے، اوراد و وظائف، ذکرو شغل اور راتوں کی خلوتوں، تنہائیوں میں دل کی گہرائیوں سے خدا کو یاد کرتا ہے، روتا ہے، آنسو بہاتا ہے، توبہ وانابت کا خلوص اس کو سیماب صفت بنا دیتا ہے، غیر اختیاری طور پر اس شخص سے ایسی کیفیات کا ظہور ہونے لگتا ہے جس کا خود اس کو تو احساس نہیں ہوتا لیکن دقیقہ رس نگاہیں ان کیفیات کا ادراک کر لیتی ہیں۔

حضرت حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی کی چالیس روزہ خانقاہ امدادیہ میں حاضری میں بچشم خود ان کیفیات کا ادراک کر لیا جو برسہا برس کی ریاضت اور ذکر و شغل کے بعد پیدا ہوتی ہیں، جو سلوک و طریقت کی راہ میں مطلوب ہیں، یہی وہ مقام ہے جب مرشد کو مسترشد کے اپنے سانچہ میں ڈھل جانے کا یقین حاصل ہو جاتا ہے تو اس کو اپنا خلیفہ بنا دیتا ہے اور ہدایت دیتا ہے کہ وہ دوسروں کو بیعت کر کے دین کی صحیح راہ پر لانے کا فریضہ انجام دے، انھیں احساسات کے چالیس روزہ جدو جہد نے حضرت گنگوہی کو اس مقام پر پہونچا دیا اور آپ تھانہ بھون شیخ محمد تھانویؒ سے علمی مباحثہ کی غرض سے تشریف لے گئے تھے اور جب واپس ہوئے تو اصلاح اُمت کی اہم ترین ذمہ داری لے کر واپس ہوئے اسی کو کہتے ہیں کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔

باب ۴

تلاش معاش کی راہیں

گنگوہ واپسی کے بعد دین کے ساتھ دنیاوی مسائل کا بھی سامنا تھا سب سے پہلا مسئلہ معاش کا تھا، خاندان کی جو آمدنی تھی اس سے آپ کا تعلق برائے نام تھا، اہل و عیال کی ذمہ داری آپ پر آچکی تھی اس لیے اس طرف فوری توجہ کی ضرورت تھی اتفاق سے اسی دوران سہارن پور سے نواب شائستہ خاں کی طرف سے کچھ بچوں کی تعلیم کے لیے جگہ آئی، آپ نے اُسے منظور فرمالیا اور مشاہرہ دس روپے ماہوار طے ہوا جو اس زمانہ میں گذر بسر کے لیے کافی تھا اس لیے آپ سہارن پور تشریف لے گئے اور وہاں جاکر تعلیم کا سلسلہ شروع کریا، لیکن آپ اس کام سے مطمئن نہیں تھے، بدرجہ مجبوری اس کام کو اختیار کیا تھا پھر بھی آپ نے چھ ماہ ملازمت کرتے ہوے گذار دیے، بالآخر آپ نے اس سے ترک تعلق کر کے گنگوہ میں قیام کو بہتر تصور کیا اور چھ ماہ کی اس ملازمت کے بعد آپ نے پھر دوبارہ کبھی ملازمت نہیں کی، یہ ملازمت پہلی بھی تھی اور آخری بھی۔

مطب کا آغاز

دہلی تعلیم کے دوران طب کی تعلیم کے لیے وقت نہیں ملا اس لیے آپ نے باضابطہ طب نہیں پڑھی۔ گنگوہ میں قیام کے بعد جس طرح

بغیر استاذ کلام پاک حفظ کیا اور محراب سنائی اسی طرح آپ نے طب کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور طبی اصولوں کو ذہن نشین کرنے کے بعد ہلکے پھلکے علاج کرنے شروع کردیئے۔ مفرد دوائیں ضرورت مندوں کو بتاتے رہے، علاج کا آغاز گھر اور خاندان سے کیا۔

آپ کے ایک ماموں طبیب تھے اور مریض ضرورت کے وقت ان کی طرف رجوع کرتے تھے، خاندان کے ایک مریض کے علاج میں وہ ناکام رہے ان کی تجویز کردہ کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی تھی، تب حضرت گنگوہی نے خود تشخیص مرض فرمائی اور علاج تجویز کیا، خدا کی مرضی کہ علاج شروع ہوتے ہی افاقہ ہونے لگا اور صحت بتدریج عود کر آئی، مایوس العلاج مریض کا صحت مند ہونا طبیب کے علاج پر اعتماد میں اضافہ کرتا ہے، یہ بات عام ہوگئی اور آپ کے علاج کی شہرت ہوگئی پھر تو گنگوہ میں آپ کی حیثیت ایک ماہر طبیب کی ہوگئی۔ پھر آپ نے اپنا الگ مطب قائم کرلیا اور علاج و معالجہ کا سلسلہ چل پڑا، قدرت نے دست شفا دیا تھا اس لیے عام طور پر جو لوگ آپ کے زیر علاج رہے شفایاب ہوتے رہے، بتدریج شہرت بڑھتی چلی گئی، لوگوں کا یقین واعتماد آپ کے علاج اور تشخیص پر مستحکم ہوتا چلا گیا، بعض مایوس العلاج مریض آئے اور آپ کے معمولی اور چند پیسوں کے نسخوں کے استعمال سے صحت یاب ہوگئے اس طرح کے متعدد واقعات ہوئے جس کی وجہ سے دور دور سے مریض آنے لگے اور آپ ایک ماہر طبیب و معالج کی حیثیت سے بھی مشہور ہوگئے۔

شب و روز کی مصروفیت

مطب کی مصروفیتوں کے ساتھ اگر کوئی شوقین طالب علم آگیا اور اس نے بعض کتابوں کے پڑھانے کی درخواست کی تو مطب سے فارغ ہو

کر اس کو پڑھاتے بھی رہے، اس دور کی تعلیم و تدریس کی پوری تفصیل تو دریافت نہیں لیکن قیام گنگوہ کے بعد جب آپ نے تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا تو ابتدائی دور کے طالب علموں میں مولانا سید مومن علی کا نام نمایاں ہے وہ نکوڑ کی تحصیل میں سرکاری ملازم تھے ان کے دل میں یکایک دینی تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا تو ملازمت ترک کر کے حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہو گئے، ان کو شرح جامی پڑھانے کا تذکرہ آپ کی سوانح میں ملتا ہے۔

دن انھیں مصروفیتوں میں گذر جاتا تھا، لیکن رات کی مصروفیتوں کا علم کم لوگوں کو تھا، رات کی تنہائی اور سناٹے میں مسجد کے ایک گوشے میں جو ذکر بالجہر کا سلسلہ شروع ہوتا تھا تو رات کا بڑا حصہ روحانی نشاط، دل کی تڑپ اور آنکھوں سے برستے ہوئے آنسوؤں میں گذرتا تھا، درد و کرب سے بھری ہوئی ذکر بالجہر کی غمناک آواز سے چھوٹی سی مسجد کی اندرونی فضا معمور رہتی تھی یہ ذکر و شغل پوری پابندی اور پورے انہماک کے ساتھ برابر جاری تھا، پچھلے پہر تہجد کی نماز شروع ہوتی تو فجر تک قرآن کی زیادہ سے زیادہ تلاوت ہو جاتی، فجر کی نماز کے بعد اوراد و وظائف اور مراقبہ میں مصروف رہتے، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا کہ سورج طلوع ہو کر ذرا بلند ہو جاتا تو آپ اشراق کی نماز پڑھ کر گھر واپس تشریف لاتے اور پھر دن بھر کی مصروفیات کا آغاز ہو جاتا تھا۔

باب ۵

ذہنی وفکری انقلاب

زندگی کی ان مصروفیات کے باوجود عشق الٰہی کی وہ تپش چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی جو خانقاہ امدادیہ کا روحانی فیضان تھا، پوری پوری رات ذکر بالجہر اور اوراد و وظائف میں گذرنے کے باوجود دل کی تپش اور بڑھتی جاتی اور بے چین رکھتی اس لیے آپ ایک ہفتہ گنگوہ میں رہتے تو دوسرے ہفتے تھانہ بھون جانا ضروری تھا اور پورا ہفتہ گذارے بغیر واپسی ممکن نہ تھی، اگر پندرہ دن گنگوہ میں قیام رہا تو خانقاہ امدادیہ میں پندرہ دن گذارنا لازمی تھا، اس طرح مسلسل شیخ و مرشد سے کمالات روحانی کے اکتساب میں دنیاوی علائق کو بھول جاتے تھے سلوک و طریقت کی راہ میں ذہن و فکر بے بس رہ جاتے ہیں اور جذبہ عشق آگے بڑھ کر رہنمائی کا فریضہ انجام دینے لگتا ہے اور باگ ڈور اس کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے، جوں جوں عشق الٰہی کی یہ کیفیت دل میں بڑھتی جاتی ہے اس کی آب و تاب ظاہری وجود پر نظر آنے لگتی ہے، جس طرح شیشہ کے سفید و شفاف گلاس میں کوئی رنگین مشروب ڈال دیجئے تو باہر سے گلاس بھی اسی رنگ میں ڈوب جاتا ہے، چہرہ دل کی کیفیات کا آئینہ بن جاتا ہے، حضرت گنگوہی کی شب بیداری تہجد گذاری اور اوراد و وظائف کی پابندی نے دل

میں جو جلا پیدا کی اس کا نور چہرے پر نمایاں ہونے لگا، پہلی نگاہ پڑتے ہی ہر شخص محسوس کرتا کہ اس چہرے والا انسان کمالات روحانی سے مالا مال ہے اخفا کی لاکھ کوششوں کے باوجود چہرہ شخصیت کے کمالات کی غمازی کرنے لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کچھ ہی دنوں کے بعد ایسے لوگ خدمت میں حاضر ہوئے کہ آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو کر اپنی زندگی کو سنواریں لیکن آپ نے صاف لفظوں میں بیعت کرنے سے انکار فرمادیا اور انتہائی تواضع اور انکساری کے ساتھ کہا کہ میں اس لائق نہیں کہ کسی کو بیعت کروں، جب کہ شیخ و مرشد کی طرف سے ایک دم ابتدائی دور میں خلافت سے سرفراز کیے جا چکے تھے، لیکن آپ طالبین سلوک و بیعت سے ہمیشہ انکار کرتے رہے۔

تعمیل حکم ضروری ہے

بیعت پر اصرار کرنے والے گنگوہ ہی کے لوگ تھے اور بار بار کی درخواست کے باوجود ان کو بیعت نہیں کیا تھا کہ اتفاق سے شیخ و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نانوتہ جاتے ہوئے گنگوہ تشریف لائے اور حضرت گنگوہی کو شرف میزبانی حاصل ہوا، جب طالبان سلوک کو حضرت حاجی صاحب کے آنے کی اطلاع ملی تو انھوں نے موقعہ غنیمت جانا اور حاضر خدمت ہو کر حضرت حاجی صاحب سے اپنی درخواست کی ناکامی کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمارے اصرار کے باوجود حضرت گنگوہی نے ہمیں بیعت نہیں کیا، حضرت حاجی صاحب نے سائل کا پتہ دریافت کر کے حضرت گنگوہی کو ساتھ لیا اور اس کے دروازے پر پہونچ گئے، اور فرمایا کہ ان کو میرے سامنے بیعت کیجیے، شیخ و مرشد کا حکم تھا اس لیے تعمیل حکم پر مجبور ہونا پڑا اور ان کی موجودگی میں اس شخص کو بیعت کیا۔

اصلاح کا آغاز

مطب کی مصروفیت کے بعد خالی اوقات میں درس و تدریس اور بیعت وارشاد کے پاکیزہ مشغلہ کے ساتھ گردو پیش کی اصلاح کا داعیہ دل میں پیدا ہوا اور اس کا آغاز بھی آپ نے فرمادیا۔

جب اشاعت دین زندگی کا مشن بن جائے، جب احکام شریعت کی اہمیت و عظمت انسان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو جائے تو دل میں خلاف شریعت امور کی طرف سے نفرت ہی نہیں دشمنی بیٹھ جاتی ہے اور ہر قیمت پر اس بُرائی کو مٹانے کا ایک ایسا جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ ساری مصلحتیں اور دور اندیشیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں، علم جہاد بلند ہو جاتا ہے اور برائی کے خلاف جنگ چھیڑ دی جاتی ہے حضرت گنگوہی کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا، آپ کے عزیز و اقارب اور رشتہ دار شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان کے ہونے کی وجہ سے پیر زادے کہے جاتے تھے اور بعد پیر زادگی ان کو کچھ دنیاوی منافع بھی حاصل تھے، شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ کے سالانہ عرس، محفل سماع اور چڑھاوا اور نذر و نیاز کچھ نہ کچھ سلسلہ سال بھر چلتا رہتا تھا اور فتوحات کے نام پر اس خاندان کے لوگ آمدنی کو باہم تقسیم کر لیتے تھے، خود آپ کے ایک چچا کے یہاں اس طرح کے مراسم کے سلسلہ میں چڑھاوے کی چیزیں آتی رہتی تھیں، ظاہر ہے کہ یہ سب بد عقیدگی کے نتیجہ میں ہوتا تھا اور یہ سب کچھ بدعات و خرافات کے طفیل میں ہوتا تھا، آپ نے ان کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور ایک دن توڑ پھوڑ مچادی، اس واقعہ سے آپ کے عزیز و اقارب اور گنگوہ کے دوسرے باشندوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ نوجوان ہمارے طریقے سے الگ تھلگ اپنی راہ رکھتا ہے مگر کھل کر

عداوت و مخالفت کسی نے نہیں کی لیکن وہ آپ کی طرف سے صاف دل نہیں رہے اور ذہنی طور پر آپ سے وہ دور ہو گئے اور آپ کے کاموں میں رخنہ اندازی کی کوشش کرتے رہے مگر آپ ان حالات سے شکستہ خاطر نہیں ہوئے اور نہ آپ کے دل میں کوئی اندیشہ پیدا ہوا بلکہ اور کھل کر اپنی تقریروں اور وعظوں میں ان مراسم کی مذمت بھی بیان کرنی شروع کر دی جو پیر زادوں کے گھرانوں میں پائی جاتی تھیں اور گنگوہ کے اور لوگ بھی اس میں مبتلا تھے۔

باب ۶

۱۸۵۷ء کا حادثہ اور حضرت گنگوہیؒ

ذریعہ معاش کے طور پر مطب، دینی خدمت کے جذبے سے درس و تدریس اصلاح اُمت کے لیے بیعت و ارشاد اور تھانہ بھون کی آمد و رفت جاری رہی اور مقامات سلوک طے کرتے ہوئے دس سال کا عرصہ گذر گیا، اس وقت آپ کی عمر ۳۱ سال کی ہو چکی تھی، اسلام کی سربلندی، شعائر اسلام کی ترویج واشاعت آپ کا مشن بن چکا تھا اور اصلاح اُمت اور خالص اسلامی تعلیمات کو مشرکانہ عقائد اور بدعات وخرافات سے پاک صاف رکھنے کا سلسلہ جاری تھا کہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کا انتہائی ہولناک حادثہ رونما ہو گیا، مغلیہ سلطنت کی بنیاد جو ایک عرصہ سے کھوکھلی بنائی جارہی تھی کہ مئی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا آٹھ سو سالہ ایوان اقتدار اتنے دھماکے کے ساتھ گرا کہ پورے ملک میں زلزلہ آگیا اور ہر گھر کی در و دیوار ہل گئی، ہر طرف توپوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی، بہادروں نے تلواریں سونت لیں، ظالم انگریزوں سے دست بدست جنگ کے لیے میدان میں نکل آئے، جانیں لیں اور جانیں دیں، عوام سراسیمہ اور پریشان، خواص خوف وہراس میں مبتلا، اسلام کی سربلندی کا خواب دیکھنے والے علماء ومشائخ مسلمانوں کے اقتدار کی بازیافت کے لیے اپنے حالات اور وسائل وذرائع کے مطابق جد و جہد میں مصروف ہو گئے ہزارہا ہزار مسلمان شہید ہوئے مسلمانوں کا جاگیردار اور زمیندار طبقہ تباہ و برباد ہو گیا،

رؤساء وامراء نان جویں کے محتاج ہو گئے اور مسلمانوں کا نیر اقبال ایک غیر معین مدت تک کے لیے غروب ہو گیا۔

یہ سب کچھ حضرت گنگوہی کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا ان کے لیے ان حالات سے صرف نظر کرنا ممکن نہ تھا، آپ بھی اس آگ میں کود گئے۔

بے جھجک کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

کیوں کہ آپ کے دوست اور بچپن کے ساتھی حضرت نانوتوی اس محاذ پر شمشیر بدست آچکے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ حضرت گنگوہی کے شیخ و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی ان مجاہد علماء کے قائد اور امیر المومنین بنائے گئے تھے انھیں کی قیادت میں یہ جنگ لڑی جارہی تھی، ان حالات میں حضرت گنگوہی اس جہاد حریت بلکہ اسلام پر کفر کی یلغار کو روکنے والی جنگ سے کیسے علیحدہ رہ سکتے تھے یہ تو ان کے مشرب اور ان کے اصول کے بھی خلاف تھا۔

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز رسم و راہ منزلہا

اس لئے جن لوگوں نے حضرت گنگوہی کے اس جہاد میں شرکت سے انکار کیا ہے ممکن ہے ان کے سامنے اس وقت کوئی مصلحت رہی ہو لیکن تاریخ کی سچائی یہی ہے کہ حضرت گنگوہی اس میں شریک ہی نہیں بلکہ اس جہاد حریت کی قیادت کرنے والی جماعت کے رکن رکین تھے۔

حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی

ہندوستان کی ان دونوں عبقری شخصیتوں کے روابط سے ہر وہ شخص واقف ہے جس کو ان دونوں اکابر کی زندگی سے تھوڑی بہت بھی واقفیت

ہے، دہلی کا چار سالہ دور طالب علمی ایک ساتھ گذرا، دونوں کے اساتذہ ایک، دونوں کی کتابیں بھی ایک، دونوں کا قیام بھی ایک جگہ، شب وروز کا بیشتر حصہ ایک ساتھ گذرتا دونوں میں دوستانہ بحث و مباحثہ اور علمی معرکہ آرائیوں کا بھی اکثر سلسلہ چلتا رہتا، دونوں حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی سے بیعت اور دونوں آپ کے خلیفہ مجاز، تعلیم سے فراغت کے بعد دونوں کے روابط میں مزید استحکام آیا، ہر اہم کام میں صلاح و مشورہ، نانوتہ، گنگوہ اور تھانہ بھون میں ہر جگہ دونوں کا اجتماع، حتی کہ ان دونوں اکابر کے اساتذہ دونوں میں سے کسی ایک سے ملتے تو دوسرے کا حال اور خیر و عافیت ضرور دریافت فرماتے ان دونوں حضرات کا نقطۂ نگاہ، مسائل و معاملات میں رائے ایک، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسم دو ضرور ہیں مگر دونوں جسموں میں ایک ہی روح کام کر رہی ہے اور ساری دنیا جانتی ہے کہ حضرت نانوتوی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں عملی طور پر حصہ لینے والوں میں شامل ہی نہیں تھے بلکہ امیر کے انتخاب اور نقشہ جنگ مرتب کرنے والے تھے اور مجاہدین کو ایک پرچم کے نیچے کرنے والوں میں تھے اور ہاتھوں میں تلوار لے کر شاملی کے محاذ پر داد شجاعت دینے والوں میں تھے اور برطانوی کرایہ کے سپاہیوں سے دوبدو جنگ کرنے والوں میں تھے، ان حالات میں یہ کیسے مان لیا جائے کہ ان کے رفیق قدیم حضرت گنگوہی دور کے تماشائی تھے۔

برطانوی نظام حکومت سے نفرت

حضرت گنگوہی کی پوری زندگی اسلامی شریعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی اور اسی سانچے میں ہر شخص کو ڈھالنے کی کوشش کرنے والوں میں تھے وہ اسلام کی سربلندی اور شعائر اسلام کو برملا انجام دینے کے لیے ماحول کو سازگار بنانے کا خواب دیکھنے والوں میں تھے، علم و فضل، زہد و

تقویٰ اور حدیث وفقہ میں درجہ کمال حاصل تھا، چھوٹے چھوٹے مسائل زندگی پر مجتہدانہ و محققانہ انداز میں سوچنے والے اور اظہار رائے کرنے والوں میں تھے اور عملی زندگی میں اس کے نفاذ کی کوشش کرنے والوں میں تھے، ان کی حیثیت مسائل شریعت میں مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے کی تھی۔ تمام مسائل فقہیہ میں انھیں کی طرف رجوع کیا جاتا تھا اور آپ کی رائے کو اکابر علماء بھی بطور سند پیش کرتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے۔ ان تمام حقیقتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے حالات پر نظر ڈالیے۔

مرجع العلماء حضرت شاہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کا فتوی ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے بارے میں بہت پہلے ہی شائع ہو چکا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط مسلمانوں کے لیے ایک چیلنج ہے اس کے خلاف جد و جہد کرنا مسلمانوں کا قومی و ملی فریضہ ہے، دار الحرب کی مظلومانہ زندگی اور شعائر اسلام کی تحقیر اور اس کے نفاذ میں رکاوٹوں کو دور کرنا ہر مسلمان کا فرض اولین ہے، شریعت کا یہ تقاضا بھی ہے اور ایک غیرت مند اور متحرک وفعال قوم کی نفسیات کے عین مطابق بھی، دار الحرب سے یا تو ہجرت اختیار کرو یا اس باطل نظام سے ٹکرا کر اس کو مٹا دو یا خود مٹ جاؤ تیسری کوئی شکل نہیں، حضرت گنگوہی فقیہ تھے، کیا ان کی نگاہ اس صورت حال پر نہیں تھی، کیا وہ اس سے صرف نظر کر سکتے تھے؟ یہ عقل میں آنے والی بات نہیں جس کی پوری زندگی اسلام کی سر بلندی اور منشاء شریعت پر عمل آوری ہی نہیں بلکہ اس کے اجرا اور تبلیغ میں گذر رہی تھی، یہ کیسے ممکن ہے کہ وقت کے اس اہم ترین مسئلہ سے وہ اغماض فرماتے۔

۱۸۵۷ء کے کچھ دنوں پہلے جو فتوے شائع ہو رہے تھے ان میں حضرت گنگوہی کا فتوی تو نظر نہیں پڑا لیکن اس کے کچھ ہی عرصہ بعد

برطانوی تسلط کے خلاف واشگاف لفظوں میں ہم ان کو اظہار رائے کرتے ہوئے پاتے ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کے بارے میں ان کی فقہی بصیرت نے کیا فیصلہ کیا ہوگا؟

حضرت گنگوہی کا فتویٰ

ہندوستان کے دارالحرب کے سلسلہ میں مولانا سعد الدین کشمیری اور مولانا امان اللہ کشمیری نے علماء ہند سے استفتاء کیا تھا اور ہندوستان کے مشاہیر علماء کی رائیں جمع کرنے کے بعد اس مفصل فتوی کو ''نصرۃ الابرار'' کے نام سے ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کیا تھا۔

دارالحرب کا مسئلہ اس لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ اگر ہندوستان کی حیثیت انگریزوں کے تسلط کی وجہ سے دارالحرب کی ہوئی تو مسلمانوں پر جہاد ضروری ہو جائے گا یہ استفتاء حضرت گنگوہی کی خدمت میں بھی بھیجا گیا تھا، آپ نے سات صفحات میں مفصل اپنی رائے کا اظہار فرمایا تھا، یہ فتوی فارسی زبان میں ہے جو اس وقت اہل علم کی عام زبان تھی، میں اس کے کچھ ٹکڑوں کو یہاں نقل کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت گنگوہی برطانوی تسلط کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے، اس فتوی میں ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں

> ''اکنوں حال ہند را خود غور فرمائند کہ اجراء احکام کفار نصاریٰ دریں جا بچہ قوت و غلبہ است اگر ادنی کلکٹر حکم کرد کہ در مساجد جماعت ادا نکنید، ہیچ کس از امیر و غریب قدرت ندارد کہ ادائے آں نماید (نصرۃ الابرار، ص: ۱۴، علماء ہند کا شاندار ماضی، ج: ۵، ص: ۸۹)

یعنی آپ خود غور فرمائیں کہ کافر نصرانیوں کا حکم کس قوت و غلبہ کے ساتھ یہاں نافذ ہے ایک معمولی کلکٹر بھی حکم جاری کردے کہ مسجدوں میں جمع ہو کر مسلمان نماز ادا نہ کریں تو امیر و غریب میں سے کسی کی مجال

نہیں کہ وہ اس حکم کی خلاف ورزی کر سکے۔

اسی فتوی میں کچھ اور آگے چل کر حضرت گنگوہی غیر مبہم الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

"بہر حال تسلط کفار بر ہند بداں درجہ است کہ در ہیچ وقت کفار را در دار الحرب زیادہ ازیں نبود، و ادائے مراسم اسلام از مسلمانان محض بہ اجازت ایشاں است و از مسلمان عاجز تریں رعایا کسے نیست، ہنود را ہم رسوخ است مسلمانان را نیست (علمائے ہند کا شاندار ماضی، ج:۵، ص:۸۹)

یعنی ہندوستان میں انگریزوں کو اس درجہ قوت و غلبہ حاصل ہے کہ کسی دار الحرب میں اس سے زیادہ کبھی نہیں رہا، یہاں مسلمان شعائر اسلام جو ادا کرتے ہیں وہ سب ان کی رعایت و اجازت سے (یعنی جب چاہیں روک سکتے ہیں) کوئی رعایا ہندوستان میں مسلمانوں سے زیادہ مجبور و مظلوم نہیں حتی کہ ہنود کو بھی مسلمانوں سے زیادہ رعایت حاصل ہے۔

تھانہ بھون کی حاضری

حضرت گنگوہی کے یہ خیالات اور یہ رائے صرف بحیثیت مفتی و فقیہ کے ہی نہیں بلکہ ایک غیرت مند مجاہد کے خیالات ہیں اور رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل کرنے والے فرد کی رائے ہے، اسی سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے خونبار حادثہ کے بارے میں ان کے جذبات کیا رہے ہوں گے ظاہر ہے کہ ان کی شرکت خالص دینی نقطۂ نگاہ سے تھی جو حضرت گنگوہی جیسے بزرگوں کے دلوں میں اس وقت پیدا ہو گیا تھا، پھر حضرت گنگوہی کی اس قیامت کی گھڑی میں تھانہ بھون حاضری کا مقصد اور کیا ہو سکتا ہے، سوائے اس کے کہ اپنے شیخ و مرشد حاجی امداد اللہ

صاحب تھانوی اور اپنے مخلص دوست حضرت نانوتوی کے ذہن و مزاج اور جذبات و خیالات سے واقفیت ہو اور مستقبل کا لائحہ عمل تیار ہو، یہ حاضری نہ اتفاقی تھی نہ اپنے معمول کے مطابق حاضری تھی بلکہ اس حاضری کا مقصد وہی تھا جس مقصد کو لے کر حضرت نانوتوی تھانہ بھون حاضر ہوئے تھے۔

میرٹھ میں بغاوت کے آغاز سے لے کر دہلی کی سڑکوں کے لالہ زار ہونے تک کا زمانہ ایسا ہے کہ شہروں سے لے کر گاؤں تک ایک قیامت برپا تھی، ہر شخص کی نگاہ میں اس کی جان، اس کی عزت و آبرو، اس کی جائداد اور اس کا مستقبل سب کچھ خطرے میں گھرا ہوا تھا، جس طرح یک بیک زلزلہ آجائے تو ہر فرد اپنی جگہ خوف و دہشت کا شکار ہو جاتا ہے، اس میں کوئی استثناء نہیں ہوتا۔ ۱۸۵۷ء کا حادثہ اس ہلاکت خیز اور تباہ کن زلزلہ سے کسی طرح کم نہیں تھا، کیا عقل یہ مان سکتی ہے کہ حضرت گنگوہی ان حالات سے بے خبر تھے یا ان کو اپنی یا مسلمانوں کے مستقبل کی کوئی فکر نہیں تھی یا وہ اپنے اکابر کے نقطہ نگاہ سے واقف نہیں تھے۔ یہ سب مفروضے غلط تھے، ایک ایسا شخص جس کا پورا وجود اسلام کی عظمت و سربلندی اور دین کی حفاظت کے لئے وقف تھا اسلامی ہند پر جو قیامت ٹوٹی تھی وہ کس طرح اس سے بے نیازانہ گذر سکتا تھا۔

اس لیے اب کی بار حضرت گنگوہی کی تھانہ بھون حاضری مستقبل کے لائحہ عمل مرتب کرنے ہی کی غرض سے ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب علماء و مشائخ کی تھانہ بھون میں مجلس شوریٰ بیٹھتی ہے تو حضرت نانوتوی کو اگرچہ سالار اور قائد تجویز کیا جاتا ہے تو حضرت گنگوہی کو وزارت جنگ کا سکریٹری نامزد کیا جاتا ہے اور حضرت گنگوہی کے شیخ و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی کو متفقہ طور پر امیر

المومنین منتخب کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی جاتی ہے، بیعت کرنے والوں میں حضرت گنگوہی بھی شامل ہیں پھر یہ سر فروش مجاہد علماء کا فوجی دستہ شاملی تحصیل کے محاذ کی جانب کوچ کرتا ہے تو حضرت نانوتوی کے ساتھ حضرت حافظ ضامن شہید حضرت مولانا منیر نانوتوی کے ساتھ ساتھ حضرت گنگوہی بھی اس مورچہ پر موجود نظر آتے ہیں اور ہر طرح کے حالات سے نبرد آزمائی کے لیے تیار کھڑے ہیں۔

حضرت گنگوہی کا احساس ذمہ داری

شاملی تحصیل پر انگریزی سپاہیوں سے جو گڑھی میں متعین تھے مجاہدین کا مقابلہ ہوتا ہے، دست بدست جنگ ہوتی ہے اتفاق سے ایک گولی حضرت ضامن شہید کے سینہ میں لگتی ہے وہ زمین پر گر جاتے ہیں تو حضرت حافظ ضامن شہید کو محفوظ مقام پر لے جانے اور ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لے کر حضرت گنگوہی آگے آتے ہیں حضرت گنگوہی کے سوانح نگار نے خود اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت امام ربانی قدس سرہ کو خادمانہ مریدانہ تعلق پر اعلیٰ حضرت کے ساتھ جو کچھ وابستگی تھی وہ تھی ہی مگر چچا پیر حضرت حافظ ضامن شہید کے ساتھ بھی نہایت ہی درجہ مخلصانہ اُنس تھا اور حافظ صاحب بھی مولانا کے گویا جاں دادہ عاشق تھے اس گھمسان میدان میں مولانا کو پاس بلایا اور فرمایا، میاں رشید! میرا دم نکلے تو تم میرے پاس ضرور ہونا، تھوڑی دیر گذری کہ حافظ صاحب دھم سے زمین پر گر پڑے، معلوم ہوا کہ گولی کاری لگی اور خون کا فوارہ بہنا شروع ہوا حافظ صاحب کا زخم سے چور ہو کر گرنا تھا اور حضرت امام ربانی کا لپک کر آپ کو کاندھے پر اُٹھانا، قریب کی مسجد میں لائے اور

حضرت کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تلاوت قرآن میں مشغول ہو گئے۔
(تذکرۃ الرشید مصنفہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص ۷۵)

معرکہ کارزار ختم ہوا

حضرت گنگوہی کا اس جہاد حریت مین نفس نفیس شریک ہونا ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ تحصیل فتح ہوئی اور برطانوی پولیس کو شکست، دشمن مورچہ چھوڑ کر فرار کر گیا انگریز بغاوت پر قابو پاتے جا رہے تھے اور باغیوں کی تلاش کرتے پھر رہے تھے، تحصیل شاملی ضلع مظفر نگر میں ہے، جب انگریزی افسران کو تھانہ بھون کی طرف سے اس حملہ کی خبر ملی اور انگریزی سپاہیوں کی شکست کی اطلاع افسران بالا کو ہوئی تو انھوں نے تھانہ بھون کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کا فیصلہ کیا اور ایک مسلح دستہ مع توپ کے تھانہ بھون روانہ ہو گیا، فوجی دستہ جب تھانہ بھون پہونچا تو وہاں سناٹے کا عالم تھا، بغاوت کا آغاز کرنے والے تھانہ بھون کے معزز جاگیر دار قاضی عنایت علی کی تلاش ہوئی وہ نہیں ملے تو ان کے محل پر گولہ باری کر کے اس کو کھنڈر بنادیا اور پھر ان تمام لوگوں کی تلاش ہوئی جنھوں نے شاملی تحصیل پر حملہ کر کے انگریزی سپاہیوں کو قتل کیا تھا، مگر وہاں اُن میں سے کوئی فرد بھی نہیں ملا، کیونکہ سب کو پہلے سے اس کارروائی کا علم تھا۔

وارنٹ گرفتاری

انگریزی حکومت کے مخبر ہر سمت پھیلے ہوئے تھے اور پل پل کی خبریں افسران کو پہونچا رہے تھے اور بغاوت میں ممتاز اور سربر آوردہ شخصیتوں میں سے ہر ایک کے نام اور دوسری تفصیلات ریکارڈ میں موجود تھیں، اس لیے بغاوت پر قابو پانے کے بعد ہر گاؤں، ہر آبادی کے ممتاز

مسلمانوں کی گرفتاری کی مہم چلائی گئی، تمام تھانوں کو ان باغیوں کی فہرست بھیج دی گئی اور ہر جگہ کی پولیس ان باغیوں کی تلاش میں مصروف ہو گئی، شاملی تحصیل پر حملہ کرنے والوں میں تھانہ بھون کے بزرگوں کے نام نمایاں تھے، اس لیے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی اور دوسرے بزرگوں کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکا تھا اور پولیس خوں آشام بھیڑیے کی طرح اپنے شکاروں کی بو سونگھتی پھر رہی تھی، ہر علاقہ میں تھانوں کی طرف سے مقرر کردہ مخبر گاؤں اور آبادیوں میں سادہ لباسوں میں مجرموں کا پتہ لگا رہے تھے، جوں ہی معلوم ہوتا کہ فلاں باغی فلاں جگہ دیکھا گیا فوراً اٹھانے کی انگریزی پولیس دوڑ پڑتی تھی، ہمارے اکابر سب سے پہلے نشانے پر تھے۔

حاجی امداد اللہ تھانوی

حضرت حاجی صاحب اس جنگ میں امیر المومنین تھے اس لیے ان کو علم تھا کہ سب سے پہلے انگریزی پولیس ان کی گرفتاری کی کوشش کرے گی اور گرفتاری کا مطلب تھا پھانسی، اس سے کم کی سزا اس وقت ان کے پاس نہیں تھی، اس لیے انھوں نے پہلے ہی مرحلہ پر مستقبل کا فیصلہ فرمالیا تھا اور انگریزوں کے حدود سلطنت سے باہر نکل جانے کا تہیہ فرمالیا تھا، آپ سے ذرا پہلے مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے جو راہ اختیار کی تھی بالکل وہی راہ حضرت حاجی صاحب نے بھی اختیار فرمائی، روپوشی کی حالت میں آپ نے جنگلوں بیابانوں اور خطرناک راہوں کو طے کرتے ہوئے کسی طرح ساحل سمندر پر پہونچنے میں کامیابی حاصل کرلی اور پھر بادبانی کشتی کے ذریعے مکہ مکرمہ پہونچنے کی راہ آسان تھی، مکہ مکرمہ پہونچ کر آپ نے وہیں بہ نیت ہجرت قیام کیا اور اسی مقدس سرزمین

میں ساری زندگی گذار کر وہیں آسودۂ خواب ہوئے۔

حضرت گنگوہی کے رفیق دیرینہ حضرت نانوتوی

حضرت گنگوہی کو اپنے شیخ و مرشد حاجی صاحب کے سفر ہجرت کی خبر تھی، آپ نے خفیہ طور پر اسی روپوشی کے زمانہ میں آپ سے ملاقات کی تھی اور آپ کو خدا حافظ کہا تھا، شیخ کو جب رخصت کر کے واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ رفیق دیرینہ حضرت نانوتوی کی گرفتاری کے لیے ہر طرف انگریزی پولیس نے جال بچھا دیا ہے اور ہر طرف مخبر شکاری کتوں کی طرح دوڑ رہے ہیں، کبھی ان کو پتہ چلتا ہے کہ دیوبند میں گھر پر ہیں۔ پولیس کا چھاپا پڑتا ہے تب تک وہ شاہین صفت انسان اپنے آشیانہ سے پرواز کر چکا تھا، مخبر پھر خبر دیتا ہے کہ چھتہ مسجد میں حضرت نانوتوی دیکھے گئے ہیں، شکاری کتے دوڑ پڑے مگر جوش انتقام میں آنکھیں اندھی ہو چکی تھیں، آپ کو پا کر بھی کھو آئے، پھر مخبر نے تھانے کو اطلاع دی کہ حضرت نانوتوی شیخ نہال احمد رئیس کی کوٹھی چکوالی میں مقیم ہیں، کپتان پولیس کا ایک دستہ لے کر مکان کی حصار بندی کر لیتا ہے کواڑ کھول کر خود حضرت نانوتوی کپتان کے سامنے آجاتے ہیں اور پوچھتے ہیں، آپ کو کس سے ملنا ہے؟ جواب دیتا ہے ہمارا ملزم اس مکان میں چھپا ہوا ہے، ہم اس کو گرفتار کرنے آیا ہے، حضرت نانوتوی نے فرمایا یہاں کوئی مجرم نہیں ہے، اس نے کہا ہم تلاشی لے گا، آپ نے فرمایا شوق سے تشریف لایئے، آپ آگے آگے، پیچھے پیچھے پولیس کپتان، وہ کواڑ کھولو، وہ مکان کھولو، باتھ روم اور لیٹرین کی بو سونگھ کر واپس چلا جاتا ہے، وہ جھنجھلا جاتا ہے، مخبر غلط خبر دیتا ہے، حضرت نانوتوی نے قیام گاہ بدل دی اور پھر روپوشی ہی کے ایام میں سفر حج کے لیے روانہ ہو گئے جہاں سے واپسی ایک سال سے پہلے ممکن ہی نہ تھی، پولیس ہاتھ مل کر رہ گئی۔

مولانا ابو النصر شکنجہ عذاب میں

حضرت گنگوہی بھی زندگی کے اسی خطرناک موڑ پر تھے، کسی وقت بھی پولیس چھاپہ مار سکتی ہے آپ نے عارضی طور پر اپنی قیام گاہ بدل دی اور اپنے جدی وطن رامپور ضلع سہارن پور چلے گئے اور حکیم ضیاء الدین صاحب کے مکان پر قیام فرمایا، پولیس آپ کی تلاش میں تھی، گارڈی کرنیل ایک دن پولیس لے کر گنگوہ پہونچ گیا آپ کے مکان اور مسجد کی حصار بندی کر لی تلاشی لی جانے لگی، گھر کا کونہ کونہ چھان مارا مگر شکار ہاتھ نہیں آیا گھر سے نکل کر مسجد میں پولیس پہونچی وہاں ایک بزرگ مراقبہ میں سر جھکائے اور اد و ظائف میں مشغول تھے پولیس نے سمجھ لیا کہ شکار ہاتھ آگیا، جاتے ہی ایک ہاتھ ان کی گردن پر مارا اور دانت پیستے ہوے کہا مسجد میں چھپا بیٹھا ہے، چل دیکھ تیرا کیا انجام ہوتا ہے، جلادوں کی اولاد نے ان کو تھپڑ اور گھونسوں پر رکھ لیا اور جرم کا اقرار کرانا چاہا مگر وہاں ایک خاموشی سب کے جواب میں، نہ برأت ظاہر کرتے ہیں اور نہ اپنا بے مقصد ہونا بتاتے ہیں۔ پولیس دل کی سیاہ آنکھ کی اندھی خود اس کو ملزم کی شناخت نہیں، ایک بے قصور انسان پر مشق ستم کیے جارہے تھے کہ کسی نے بتادیا کہ جن کی تلاش ہے یہ وہ نہیں ہیں، یہ تو مولانا ابو النصر صاحب ہیں مگر پولیس کو شرم کہاں کہ اپنی غلطی کا اقرار کرے، پولیس میں اتنی انسانیت کب رہی البتہ اتنا ہوا کہ ان کو رہا کر دیا اور وہیں پولیس کو پتہ چلا کہ اصل ملزم قصبہ رام پور میں ہے۔

حضرت گنگوہی کی گرفتاری

پولیس نے مولانا ابو النصر کو گنگوہ میں چھوڑا اور تیز رفتاری کے ساتھ

رام پور کی جانب چل پڑی جس مکان میں آپ اقامت گزیں تھے، مخبر کی اطلاع کے مطابق اس کو اپنے حصار میں لے لیا حضرت گنگوہی وہیں موجود تھے، پولیس نے فوراً گرفتار کیا اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں اور پاپیادہ صدر مقام سہارن پور کے لیے چل پڑی وہاں جاکر حوالات میں ڈال دیا، تین دنوں کے بعد مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے سہارن پور جیل بھیج دیا جہاں آپ ۱۵ دن رہے۔ چوں کہ واقعہ شاملی تحصیل کا تھا جو ضلع مظفر نگر میں ہے اس لیے مقدمہ بھی مظفر نگر ہی کی عدالت میں چلانا طے تھا اس لیے ۱۵ دنوں کے بعد پولیس کے گھیرے میں ان کو مظفر نگر جیل بھیج دیا گیا جہاں چھ مہینے آپ کو رہنا پڑا۔

مقدمہ اور افواہیں

حضرت گنگوہی پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا غدر ۱۸۵۷ء کے جملہ مجرمین پر بغاوت ہی کا الزام تھا اور اس کی سزا میں کسی طرح کی کوئی رعایت نہیں تھی یا تو مجسٹریٹ فیصلہ سنا دیتا کہ ملزم کو میدان میں کھڑا کر کے گولی ماردی جائے یا بھی فیصلہ کرتا کہ ملزم کو پھانسی دی جائے اور بہت رعایت کی تو فیصلہ کر دیا کو ملزم کو ہندوستان سے نکال کر جزیرہ انڈمان کے ٹاپو میں بھیج دیا جائے جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر کئی مہینے تک جتنے بغاوت کے مقدمے چلے کسی مقدمہ میں ملزم کو بری نہیں کیا گیا، تقریباً پانچ ہزار سے زیادہ لوگوں کو جزائر انڈمان (کالے پانی) بھیجا گیا، کتنوں کو پھانسی پر چڑھایا گیا، اس کا تو اندازہ بھی نہیں بتایا جا سکتا۔

جن دنوں حضرت گنگوہی پر مقدمہ چل رہا تھا مختلف اضلاع میں اس طرح کے مقدمات چل رہے تھے اور لوگوں کو فیصلوں کا علم ہوتا رہتا تھا کہ آج فلاں کو پھانسی دے دی گئی۔ آج فلاں جاگیر دار کو کھڑا کر کے

گولی مار دی گئی اس دہشت ناک فضا میں حضرت گنگوہی پر بھی مقدمہ چل رہا تھا اور جب عدالت میں پیشی ہوئی تو دوسرے دن افواہ اڑ جاتی کہ عدالت نے پھانسی کا حکم دے دیا کبھی افواہ اڑتی کہ گولی مارنے کا حکم ہوا ہے، کبھی یہ افواہ پھیل جاتی کہ کالے پانی بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور جب جب یہ افواہیں اڑتی تھیں تو ہزاروں دلوں میں تیر لگتا اور چھلنی ہوتے، ہزاروں آنکھیں خون کے آنسو بہانے لگتیں، یہی ماحول تھا دھڑکتے ہوئے دلوں اور اشکبار آنکھوں سے حضرت گنگوہی کے مقدمہ کے حالات دیکھ اور سن رہے تھے کہ ایک دن عدالت میں فیصلہ کی تاریخ آگئی، سرکاری وکیل نے جرم کا اقرار کرانا چاہا، سوال کیا اور تم نے فساد کیا اور مفسدوں کا ساتھ دیا ہے؟

ہمارا کام فساد پھیلانا نہیں، ہم مفسدوں کے ساتھی نہیں

تم نے حکومت کے خلاف ہتھیار اُٹھایا ہے؟

آپ نے جیب سے تسبیح نکال کر دکھاتے ہوئے کہا ہمارا ہتھیار یہ ہے

ہم تم کو کڑی سے کڑی سزا دیں گے

پہلے جرم تو ثابت ہو جائے، سزا تو خدا دے سکتا ہے

تمہارا پیشہ کیا ہے؟

زمینداری

مجسٹریٹ نے فیصلہ سنادیا، پولیس ثبوت فراہم کرنے میں ناکام ہے، استغاثہ میں جو دفعہ لگائی گئی ہے وہ دفعہ ملزم پر عائد نہیں ہوتی ثبوت ناکافی ہے، ملزم کو باعزت بری کیا جاتا ہے

رسیدہ بود بلائے ولے بہ خیر گذشت

باب ۷

حضرت گنگوہی اپنے وطن میں

حضرت گنگوہی کا یہ پورا سال حوادث کی نذر ہو گیا بلکہ "عام الحزن" بن گیا مختلف اقسام کے صدمات سے دو چار ہونا پڑا، احباب کی جدائی، ان کی مصیبتیں اور پریشانیاں، شیخ و مرشد کو زندگی کے جس خطرناک موڑ پر آپ نے چھوڑا تھا وہ سوہان روح بنا ہوا تھا، حضرت پر کیا گذری، کس طرح راہ کے مصائب پر قابو پایا، خود اپنے اور اپنے عزیزوں پر جو مصائب آئے وہی کیا کم تھے لیکن دل مطمئن تھا کہ "بہ مصیبتے گرفتارم نہ کہ بمعصیتے" ہم نے جو کچھ کیا دین و شریعت کے تقاضوں سے کیا، مرضی الٰہی اور اس کی دین کی سر بلندی کے لیے کیا، انشاء اللہ اس کا اجر مل کر رہے گا۔

جب آپ مظفر نگر عدالت سے باعزت بری ہو کر اپنے وطن گنگوہ تشریف لائے تو یہاں کا ماحول یہاں کی فضا تبدیل ہو چکی تھی ساری دینی و علمی چہل پہل رخصت ہو چکی تھی، فضا میں ایک طرح کا سناٹا تھا، دل صدموں سے چور تھا یاد الٰہی میں ڈوب جانا چاہتا تھا، اس کی خواہش تھی کہ کوئی خلوت کدہ ہو، تنہائی میں کوئی مخل ہونے والا نہ ہو اور ایک گوشہ میں بیٹھ کر صرف اللہ اللہ کے اور کوئی مشغلہ نہ ہو آتش عشق الٰہی جب اور تیز بھڑکی تو دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ شیخ عبد القدوس گنگوہی کی خانقاہ کے کھنڈر کو پھر ذکر الٰہی سے آباد کیا جائے اور بتدریج یہ خیال عملی شکل اختیار کرنے لگا، اور اس کھنڈر کی صفائی کا کام شروع فرمادیا۔

ویران خانقاہ کی آبادی

آپ اپنے مکان مسکونہ سے الگ تنہائی اور یکسوئی کی جگہ کی تلاش میں تھے، شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے روضہ سے متصل حجرہ ابوسعید جو ایک تنگ سی کوٹھری تھی آپ نے سالہا سال اس میں ریاضت کی اور اپنے معمولات پورے کیے، لیکن وہ بہت ہی تنگ اور اس کا فرش گہرا تھا اس لیے تکلیف دہ تھا، شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مزار سے متصل کبھی شیخ کی خانقاہ تھی، جہاں انھوں نے برسہابرس ریاضت کی تھی ہزاروں کو بیعت کیا تھا ذکر کی کیف آور ایمان افروز آواز جس میں گونجتی رہی اور وہ جگہ کبھی سرچشمۂ نور ہدایت تھی، مرور ایام کے تھپیڑے کھاکر اب زمیں بوس ہو چکی تھی اور اس کے نشانات تک مٹ گئے تھے البتہ اس کا ملبہ ادھر ادھر پڑا ہوا تھا، خانقاہ کے کھنڈر کا کچھ حصہ ایسا تھا جہاں گھوڑے گدھے باندھے جاتے تھے اور زمین غلاظت سے بھری پٹی تھی، چونکہ وہ خانقاہ کی زمین تھی اس لیے کوئی اس پر قابض نہیں تھا اور نہ کوئی اس کا دعویدار تھا اس لیے وہ گندگی کا ڈھیر ہو چکی تھی، آپ کی نگاہ انتخاب اسی زمین پر پڑی اور آپ نے شیخ المشائخ کی اس خانقاہ کو از سر نو آباد کرنے کا عزم بالجزم فرمالیا اور پھاوڑے لے کر اس کی گندگی صاف کی، کوڑا کرکٹ اور غلاظت باہر پھنکوائی اور جب زمین صاف اور مسطح ہو گئی تو آپ نے اپنے لوگوں سے کچھ مالی تعاون لیا اور کچھ رقم اپنے پاس سے لگائی، اور اس زمین پر ایک سہ دری کی بنیاد ڈال دی، تعمیر کے بعد اسی میں ایک طرف آپ نے اپنا بستر بھی لگالیا، اسی سہ دری میں درس و تدریس کا بھی سلسلہ شروع کردیا۔

اب وہی کوڑا خانہ اور گندگی کا ڈھیر جہاں وحشت برستی تھی اب اس کی فضا میں قال اللہ و قال الرسول کا نغمۂ جانفزا گونجنے لگا، کل اس کی

طرف کوئی نگاہ تک نہیں اٹھاتا تھا اب وہ جگہ اتنی خوش منظر ہو گئی کہ پیر زادوں کی نظر اس پر پڑنے لگی اور چاہا کہ حضرت گنگوہی کو اس سے بے دخل کر دیں گندگی و غلاظت اور کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بلکہ خانقاہ کو کوڑا خانہ بنا رہنا منظور مگر ذکر و فکر اور درس حدیث و قرآن کے زمزموں سے اس کا معمور ہونا منظور نہیں، باہمی صلاح و مشورہ ہونے لگا، قبضہ کرنے کی تدبیریں سوچی جانے لگیں۔

معرکہ آرائی

پیر زادے جو اس زمین کے دعویدار تھے ان کو شیطان نے ورغلایا، ان کی کئی پنچایتیں ہوئیں کانا پھوسی ہوئی کھل کر رائے اور مشورہ ہوا اور تیز و طرار اور پرجوش لوگوں نے دوسرے لوگوں کو ورغلایا کہ بزور قوت اس زمین کو خالی کرا لینا ضروری ہے، یہ مشورے ان کی نجی مجلسوں ہی تک محدود رہے حضرت گنگوہی جو اسی خاندان کے عزیز و اقارب میں سے تھے کوئی ظاہری دشمنی اور عداوت کبھی نہیں رہی اس لیے طاقت کے مظاہرے کے بجائے کچھ معمر لوگوں کو پیر زادوں نے حضرت گنگوہی کے پاس بھیجا اور ان کی معیت میں پیچھے پیچھے کچھ پرجوش پیر زادے بھی آئے، آتے ہی انھوں نے کہا کہ یہ زمین ہماری ہے آپ نے اس پر تعمیر کر کے قبضہ کر لیا ہے، آپ اس کو چھوڑ دیں زیادہ سے زیادہ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ اس کی تعمیر میں جو اخراجات ہوئے ہیں وہ ہم آپ کو دے سکتے ہیں، حضرت گنگوہی نے ان کے چہروں سے ان کا ارادہ پڑھ لیا تھا اور آپ طبعاً فتنہ و فساد سے دور رہنا چاہتے تھے اور تقاضائے وقت بھی یہی تھا کہ تلخی کو زیادہ بڑھنے نہ دیا جائے، کیونکہ مستقبل میں جو اصلاح کا پروگرام پیش نظر تھا اس کے لیے سنجیدہ فضا، پرسکون ماحول اور ایک دوسرے پر اعتماد اور اخلاق حسنہ کا

ظاہرہ وسلوک ضروری ہے، آپسی اختلاف، باہمی دشمنی وعداوت آئندہ مشکلات پیدا کر سکتی ہیں۔ ابھی تک ان کی زبانیں بند ہیں، اگر آج ان کی زبانیں کھل گئیں تو آئندہ قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کریں گے۔

اس لیے آپ نے فرمایا، آپ نے پہلے کہہ دیا ہوتا تو یہ کمرہ بھی نہ بنتا اور اس کی نوبت نہ آتی۔ بہر حال اب بھی اس کا وقت ہے۔ مجھے اس پر قبضہ رکھنے پر اصرار نہیں، میں نے تو محض اس خیال سے اس زمین کو غلاظتوں سے صاف کیا تھا کہ ہمارے جد امجد حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خانقاہ تھی، جہاں برسہا برس تک اللہ کا ذکر ہوتا تھا، یہاں سے ایمان کی روشنی تقسیم ہوتی تھی، بھٹکے ہوئے اللہ کے بندوں کو یہاں سے نور ہدایت ملتا تھا، اس کو نادانوں نے گندگی کا ڈھیر بنا دیا تھا، میری طبیعت نے اس مقام کی بے حرمتی کو گوارا نہ کیا اور میں نے اپنے ہاتھوں سے محنت کر کے اس کو صاف کیا اگر آپ کو یہ پسند نہیں تو میں اس کو خالی کیے دیتا ہوں، آپ شوق سے اس پر قبضہ کیجئے میرے لیے اللہ کا گھر کافی ہے۔

بے دخلی مکمل ہوگئی

حضرت گنگوہی نے اظہار حقیقت کے بعد طلبہ سے فرمایا کہ اپنے اپنے سامان سمیٹ لو، ٹاٹ اور فرش لپیٹ کر مسجد میں لے چلو اور خود آپ کھڑے ہوگئے، پیرزادوں نے اس تعمیر پر جو لاگت آئی تھی حضرت گنگوہی کو پیش کر دی اور آپ نے قبول بھی فرمالیا، آپ نے کچھ ذاتی سامان گھر بھیج دیا، خانقاہ اور مدرسہ کا ٹاٹ اور فرش اور مصلے اور چٹائیاں طلبہ نے مسجد میں پہونچادیں، آپ خاموشی کے ساتھ مسجد میں پہونچ کر ایک گوشے میں تسبیح لے کر مراقبہ میں بیٹھ گئے طلبہ کے چہروں پر

اُداسیاں پھیلی ہوئی تھیں، حضرت الاستاذ کے حکم کی وجہ سے ایک حرف بھی ان کی زبان سے نہیں نکلا، پیرزادوں کے خیال کے برعکس نہایت آسانی سے مکان پر قبضہ ہو گیا۔ حملہ آور بن کر آئے تھے اور فاتح بن کر واپس چلے گئے، تعمیر شدہ کمرہ سناٹے میں ڈوب گیا کیوں کہ اب وہاں نہ حضرت گنگوہی تھے نہ طلبہ، پیرزادوں کو اس کمرے میں نہ قیام سے دلچسپی تھی نہ اس کو آباد رکھنے کا کوئی جذبہ، ان کو تو صرف اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا اور ان کو پیرزادگی کے راستہ سے جو آمدنی تھی اس کے خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا اس اندیشہ کو ختم کرنے کے لیے حضرت گنگوہی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنی تھی، ان کا مقصد پورا ہو گیا وہ تو تعمیر شدہ کمرے کو ویران چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

حضرت گنگوہی کے ہمدردوں کی آمد

پیرزادوں کے پیدا کردہ اس ہنگامہ کی خبر جب گنگوہ قصبہ میں پہونچی جہاں حضرت گنگوہی کے اعزہ واقربا اور رشتہ دار تھے اور باثر تھے وہ سرائے میں آئے، ان کو واقعات کا علم ہو چکا تھا اور یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت گنگوہی نے لوگوں کو اپنی حمایت میں پیرزادوں سے الجھنے سے منع فرما دیا تھا، اس لیے ان حضرات نے آنے کے بعد مکان پر قبضہ کرنے کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن انھوں نے اصرار کے ساتھ یہ کہا کہ حضرت آپ قصبہ چلیں اور جس کا مکان پسند آئے اس میں اپنی خانقاہ اور مدرسہ قائم کر لیں ہم ساری سہولتیں فراہم کریں گے اور وہ ہمیشہ کے لیے آپ کے قبضہ واختیار میں ہو جائے گا۔ وہاں ہر طرح کا سکون حاصل ہو گا، اس حوصلہ مندانہ پیش کش کے جواب میں حضرت گنگوہی نے ان حضرات کا شکریہ ادا کیا، مگر پیشکش کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ مجھے اس مسجد میں آرام ہے،

میں یہ مقام چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جانا پسند نہیں کرتا، یہ اللہ کا گھر ہے، یہاں سے مجھے کوئی نکالنے والا نہیں آبادی سے علیحدہ واقع ہونے کی وجہ سے جو سکون یہاں ہے دوسری جگہ نہیں مل سکتا اس لیے آپ حضرات اصرار نہ فرمائیں تو بہتر ہوگا، آنے والوں کو حضرت گنگوہی کے عزم مصمم کے سامنے مزید اصرار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی اور اداس اُداس واپس ہو گئے۔

زود پشیماں کی پشیمانی

پیر زادے تو اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے تھے اس پر وہ خوش بھی تھے لیکن یہ خوشی دیرپا نہیں ثابت ہوئی دل اندر سے ملامت کرتا تھا، کم ظرفی کے اس مظاہرے پر ان کو ندامت تھی

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

پیر زادوں میں حضرت گنگوہی کی رشتہ داریاں تھیں وہ گھرانے بھی یہیں تھے وہ لوگ بھی یہیں سرائے میں رہتے تھے اس لیے حضرت گنگوہی کے طرز عمل ادفع بالتی ھی احسن کا مظاہرہ دیکھا تو وہ از خود بہت شرمندہ ہوے اور خود پیر زادوں میں بھی کچھ ایسے لوگ تھے جنھوں نے اس اقدام کو پسند نہیں کیا بلکہ اقدام کرنے والوں کو ملامت بھی کی، پھر اس حرکت کی مذمت کرنے والوں کی تعداد بتدریج بڑھتی گئی یہاں تک کہ سنجیدہ اور عمر رسیدہ لوگوں نے اس ردعمل کو دیکھ کر اس قضیہ کو خوبصورتی سے ختم کرنے کا تہیہ کر لیا انھوں نے پیر زادوں کی میٹنگ بلائی اور کہا کہ ہمارا یہ طرز عمل غیر شریفانہ تھا، ہمارے جد امجد کی خانقاہ اور عبادت خانے پر دھوبی گدھے باندھیں اور لید گوبر سے اس کو ناپاک کرتے رہیں تو ہمارے دلوں میں کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا اور آج ایک شخص نے ہمارے اوپر احسان کیا اور

ہم کو جد امجد کے سامنے شرمندگی سے بچایا تو ہم اس کے خلاف محاذ آرائی کریں یہ کہاں کی عقل مندی ہے، کیا ہمارا یہ رویہ درست ہے؟

اس میٹنگ میں اب کوئی پرجوش پیرزادہ نہیں تھا جو اپنے طرز عمل کی حمایت میں کچھ کہتا اپنے خاندان کے بزرگوں کے سامنے بولنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی اب صورت حال کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ ہر شخص اپنے فعل پر شرمندہ تھا اور کوئی فرد اپنے پہلے کے اقدام کو درست کہنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا، دوسرے دن معمر پیرزادوں کا ایک وفد آیا اور حضرت گنگوہی سے کہا کہ حضرت! ہم اظہار ندامت کے لیے حاضر ہوے ہیں، ہمیں شرمندگی ہے کہ ہم نے آپ کے ساتھ یہ نازیبا سلوک کیا اور آپ کو وہاں سے بے دخل کیا ہماری درخواست ہے کہ آپ اپنے تعمیر کردہ کمرے میں تشریف لے چلیں اور ہمیشہ کے لیے آپ اس مقام پر قیام فرمائیں، اب کوئی شخص اس میں دخل اندازی کی ہمت نہیں کرے گا۔

ابتداءً تو آپ نے وہاں جانے سے انکار فرمادیا لیکن جب اظہار ندامت اور اصرار زیادہ بڑھا تو آپ خاموش ہو گئے، پیرزادوں نے اپنے لوگوں کی مدد سے مسجد سے سامان اٹھوایا اور نو تعمیر کردہ مکان میں پہونچادیا، تمام طلبہ اور حضرت گنگوہی بھی سہ دری میں واپس آ گئے اور پھر زندگی کے آخری لمحات تک یہاں قیام پذیر رہے اور وہیں سے آپ سفر آخرت پر روانہ ہوے۔

باب ۸

سفرِ حج اور مشکلات و مصائب کے ایام

۱۸۵۷ء کے حادثہ کے بعد تقریباً پورا سال، ذہنی، روحانی اور قلبی اذیتوں میں گذرا، گنگوہ میں ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا، کچھ عرصہ توروپوشی میں گذرا، پھر گرفتاری کے بعد چھ سات ماہ حوالات اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے گذرے پھر مقدمہ کی پیشیوں میں برباد ہوے اس طرح ایک سال کا عرصہ برطانوی ظلم وستم کی نذر ہوگیا اور جب باعزت رہا ہو کر مظفر نگر جیل سے گنگوہ واپس ہوے تو کچھ دنوں یہاں پیرزادوں کی ریشہ دوانیوں کے شکار رہے جب پوری استقامت اور ثابت قدمی کے ساتھ ان مراحل سے گذر کر گنگوہ میں اقامت گزیں ہوئے تو خانقاہ، مدرسہ اور مسجد کی نورانی فضا میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا، اس چمن میں از سر نو ایک تازہ بہار آگئی، ذکر و شغل اور اوراد و وظائف کے نغمہ لاہوتی سے مسجد اور خانقاہ اور خلوت خانے گونج اُٹھے درس و تدریس کا سلسلہ از سر نو شروع ہوا اور بیعت وارشاد کا پاکیزہ مشغلہ چل پڑا، رہائی کے بعد مسلسل چار سال تک آپ گنگوہ میں رہے، معاشی حالت بھی کچھ بہتر نہیں تھی، پورے ایک سال کی غیر حاضری کی وجہ سے مطب کا سارا نظام درہم برہم ہوچکا تھا، آپ نے دینی کتابوں کا ایک کتب خانہ کھولا مگر گنگوہ جیسے معمولی قصبہ میں کتابوں کی فروخت سے کسی خاندان کی پرورش ممکن نہ تھی لیکن ذہن میں ملازمت کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا، صرف ایک

بار ملازمت کی تھی جو صرف ۶ ماہ تک رہی پھر دوبارہ اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔

زیارت حرمین شریفین کی تمنا

تنگ دستی کے اس دور میں سفر حج کا تصور بھی محال تھا مگر دل کی بات ہی کچھ اور ہے، رہائی کے بعد ہی سے زیارت حرمین کی تمنا آپ کے دل میں جاگزیں ہو چکی تھی لیکن وسائل مفقود تھے، معاشی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے اس لیے دل کا جذبہ ہمہ وقت اس پہلو کے امکانات پر غور کرنے کے لیے مجبور کرتا رہتا تھا۔

آتش شوق تیز تر ہوتی رہی

حضرت گنگوہی سلوک و معرفت کے جس بلند مقام پر فائز تھے اس کا بھی تقاضا تھا کہ عشق و دیوانگی کی وہ عبادت جو خدا کے گھر کے طواف و سعی اور تجلیات ربانی کی محسوس کیفیات و سرشاری کا مظہر ہوتی ہے اور پھر محبوب رب العالمین محسن کائنات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں قریب سے درود و سلام بھیجنے کی سعادت حاصل کرنے کا جذبہ ہر مخلص اور کامل الایمان مسلمان کے دل کی گہرائیوں میں جس شدت سے اٹھتا ہے حضرت گنگوہی جیسا عارف باللہ شخص کیسے محروم رہ سکتا ہے۔ آپ کا دل عشق الٰہی کی دہکتی ہوئی بھٹی بن چکا تھا، پوری پوری رات یاد الٰہی میں گریہ و زاری میں گذرتی، لرزتے ہوئے ہونٹوں اور کانپتے ہوئے دل سے ذکر بالجہر، اور اوراد وظائف کا سلسلہ جاری رہتا، اس کے اثرات نے آپ کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا تھا، عشق و محبت کی یہ سوزش یہ جلن، یہ بے چینی اور تڑپ اسی وقت تسکین پا سکتی ہے جب تجلی گاہ رب السموات والارض اور

فرودگاہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سرزمین کے ذرے ذرے کو عقیدت و ارادت کی سجدہ گاہ نہ بنالیا جائے، اس لیے شب و روز یہی تمنا آپ کو کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی تھی، مگر اس تمنا کے بر آنے کی کوئی سبیل نہیں تھی، اور امید کا کوئی اور راستہ دور دور تک نظر نہیں آتا تھا، لیکن قدرت کے کرشمے وقت کا انتظار کرتے ہیں، اس راہ میں مایوسی اخلاص و ایمان کے منافی ہے کیونکہ

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما

قدرت کا کرشمہ

مایوسیوں کی کالی گھٹا یک بیک صاف ہوتی ہے اور قسمت کا دمکتا ہوا ستارہ طلوع ہوتا ہوا نظر آتا ہے، قدرت نے اپنی کارسازی کے مظاہرہ کے لیے ایسی ذات کو ذریعہ بنایا جس کی طرف تصور کی نگاہ بھی نہیں جاتی تھی۔

رام پور کے مشہور رئیس ڈپٹی عبدالحق رام پوری نے زیارت حرمین کا ارادہ کیا اور انھوں نے چند اللہ والوں کی معیت میں اس سفر میں جانے کا منصوبہ بنایا تاکہ ان کی معیت کی برکت سے خدا حج مبرور کی سعادت نصیب فرمائے، ان کی نگاہ میں دو شخصیتیں اپنے زہد و تقویٰ، علم و فضل اور سلوک و معرفت کی دولت سے مالامال نظر آئیں اور ان دونوں حضرات کو ہر قیمت پر اپنے ساتھ لے جانے کا انھوں نے تہیہ کرلیا ان میں سے ایک شخصیت تو خود ان کے وطن رام پور کی تھی یعنی حکیم ضیاء الدین رام پوری (۱)،

(۱) حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوری امام ربانی حضرت گنگوہی کے ہم مشرب، ہم عقیدہ بے تکلف دوستوں میں سے تھے، آپ غدر ۱۸۵۷ء کے جہاد میں شہید ہونے والے حضرت ضامن شہید سے بیعت تھے اور ان کے خلیفہ تھے، زہد و تقویٰ میں درجہ کمال حاصل تھا حضرت گنگوہی کے کمالات روحانی کی وجہ سے عاشق زار تھے حضرت گنگوہی کے دل میں ان کا بڑا مقام تھا اور وارنٹ گرفتاری کے زمانے میں آپ انھیں کے گھر پر روپوش تھے وہیں سے گرفتار ہوئے حکیم صاحب رامپوری میں ہمیشہ رہے سال وفات معلوم نہ ہوسکا۔ (امیر اور دی)

دوسری شخصیت جو اصلاً آپ ہی کی ہم وطن تھی لیکن اس خاندان نے گنگوہ کو اپنا وطن بنالیا تھا، وہ تھے امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، انھوں نے ان دونوں کو پیشکش کی کہ میں سفر حج کا ارادہ کر رہا ہوں میری دلی خواہش ہے کہ آپ دونوں حضرات کی دینی رہنمائی میں یہ مقدس سفر کروں، سارے اخراجات میرے ذمہ ہوں گے میں صرف آپ حضرات کی معیت کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

حکیم ضیاء الدین صاحب سے تو وطن میں ہونے کی وجہ سے بالمشافہ گفتگو ہو چکی تھی، حضرت گنگوہی کے سامنے یہ پیشکش جب آئی تو آپ نے پوری بشاشت قلب سے ان کی اس پیشکش کو قبول فرمالیا کیونکہ یہ قدرت کا انعام تھا اس سے انکار ناشکری تھی۔

مولانا ابوالنصر کی رفاقت

حضرت گنگوہی کے ماموں زاد بھائی مولانا ابوالنصر صاحب جو آپ کے ہمیشہ ہمدم و ہم مجلس رہے، آپ سے کچھ کتابیں بھی پڑھی ہیں، ان دونوں میں اتنے گہرے عزیزانہ و برادرانہ تعلقات تھے کہ ایک دوسرے کی جدائی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی، مولانا ابوالنصر نے جب حضرت گنگوہی کے سفر حج پر جانے کی خبر سنی تو انھوں نے اپنے طور پر اس کی تیاری شروع کردی، کچھ زمین کچھ زیور فروخت کر کے زاد سفر تیار کیا اور حضرت گنگوہی کے ساتھ سفر حج پر جانے کا اعلان کر دیا۔

کاروان حجاز چل پڑا

اوائل ۱۲۸۰ھ - ۱۸۶۳ء میں یہ قافلہ چھکڑوں، بہلیوں اور کشتیوں کے ذریعہ کراچی پہونچا، وہاں سے بغلہ کا ٹکٹ لے کر جدہ کے لیے روانہ

ہوا، دوران سفر سمندر میں طوفان بھی آیا لیکن یہ طوفان بھی اس قافلہ کے لیے رحمت خداوندی ثابت ہوا، جو راستہ ہفتہ عشرہ میں طے ہوتا وہ ۲۴ گھنٹوں میں طے ہو گیا۔

پورا قافلہ مکہ مکرمہ پہونچ گیا اور حج و زیارت سے مشرف ہو کر مدینہ منورہ روانہ ہوا، رام پوری قافلہ کے سربراہ ڈپٹی عبدالحق رام پوری تھے انھوں نے جس نیک جذبے اور دل کی تڑپ کے ساتھ یہ سفر کیا تھا اللہ نے ان کو صلہ دیا کہ وہیں ان کا وقت موعود آگیا اور جنۃ البقیع کی مقدس سرزمین میں ہمیشہ کے لیے آسودہ خواب ہوے۔

حضرت گنگوہی پر شیخ کی نظر عنایت

حضرت گنگوہی زیارت حرمین شریفین کے ساتھ ساتھ اپنے شیخ و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی سے بھی شرف ملاقات اور مزید استفادہ کی خواہش رکھتے تھے اس لیے اس سفر میں حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوے اور ان سے اکتساب فیض کیا اور پورے ارکان حج حضرت حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی کو اپنے ساتھ رکھ کر ادا کرائے۔

دوسری شخصیت جن سے شرف ملاقات حاصل کرنے کی حضرت گنگوہی کے دل میں آرزو تھی وہ استاذ محترم استاد حدیث حضرت شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات تھی جو ایک عرصہ سے مہاجر بن کر مدینہ کی سرزمین میں اقامت گزیں تھے، ان سے بھی شرف ملاقات حاصل کیا اور دعائیں لیں۔

سرزمین پاک، الوداع

حج و زیارت سے فارغ ہو کر واپسی کی تیاریاں شروع ہوئیں، امیر

قافلہ نے مدینہ منورہ کی مقدس سرزمین کو اپنی خوابگاہ کے لیے پسند کرلی، البتہ مولانا ابوالنصر صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ حضرت گنگوہی کے ساتھ رہے۔

حضرت گنگوہی کو اس سفر میں خارش کا عارضہ لاحق ہو گیا، جب حج وزیارت سے فارغ ہوگئے تب بھی یہ مرض موجود تھا بلکہ ترقی پذیر تھا اور بیماری شدت اختیار کرتی چلی گئی، اسی حالت میں آپ جہاز پر سوار ہوے، سمندر کے سفر میں یہ بیماری یک بیک اتنی شدید ہو گئی کہ جسم بخار کی شدت سے تپنے لگا اور سرسامی کیفیت ہو گئی، اور تین دن تک مسلسل آپ پر بے ہوشی طاری رہی، پھر اسہال شروع ہو گیا، صورت حال ایسی ہو گئی کہ رفقاء سفر زندگی سے مایوس ہو گئے۔

امتحان اور آزمائش

خدا کی راہ میں مخلص سے مخلص مسلمان کی بھی آزمائش کبھی کبھی ہوتی ہے، مشکلات و مصائب کا پہاڑ اس پر ٹوٹ پڑتا ہے، صبر واستقامت جو دین کی راہ میں بہت اونچا مقام ہے اس بلند مقام تک اپنے بندے کو پہونچانے کے لیے اللہ تعالیٰ امتحان و آزمائش میں ڈالتا ہے، سفر حج سے واپسی کی راہ اسی امتحان و آزمائش کی ایک دردانگیز اور لمبی داستان ہے، میں بہت ہی اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

حضرت گنگوہی کا مرض جہاز میں سوار ہوتے ہی اور شدت اختیار کر گیا جہاز میں دوا علاج کا کوئی نظم نہیں تھا، اور نہ کوئی معمولی سے معمولی دوا بھی دستیاب تھی اس لیے تن بہ تقدیر مولانا ابوالنصر حضرت گنگوہی کے پاس ۲۴ گھنٹے بیٹھے رہتے کیوں کہ علاج کی کوئی سبیل نہیں تھی، اسی طرح جہاز میں سات دن گذر گئے، حالت انتہائی تشویشناک ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ جب بمبئی میں جہاز سے اترے تو بڑی دقتوں اور مشکلوں سے

حضرت گنگوہی کو اُتارا گیا اور ایک مکان کرایے پر لے کر قیام کیا گیا۔

حضرت گنگوہی بمبئی میں

حکیم ضیاء الدین صاحب ہمراہ تھے انھوں نے کرایہ کے مکان میں آتے ہی اپنا علاج شروع کر دیا بازار سے دوائیں منگوائیں اور استعمال شروع ہوا مگر ان دواؤں سے افاقہ کے بجائے مرض اور بڑھتا گیا، حکیم صاحب کے مشورے سے بمبئی کے ایک حکیم صاحب سے رجوع کیا گیا انھوں نے علاج شروع کیا مگر جلد ہی انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ میرے قابو سے باہر ہے، اس لیے کسی دوسرے معالج کو تلاش کیجیے، مولانا ابوالنصر صاحب نے معلوم کیا تو قریب میں ایک بید (ہندو طبیب) کا مطب بہت کامیابی سے چل رہا تھا، انھوں نے جا کر مریض کا حال بیان کیا اور کہا کہ آپ زحمت کر کے مریض کو دیکھ لیں تو مہربانی ہو گی، بید بہت بااخلاق تھا اس نے مریضوں کی بھیڑ کو جلد از جلد نمٹا کر مولانا ابوالنصر کے ہمراہ قیامگاہ پر آکر مریض کو دیکھا نبض پر ہاتھ رکھا قارورہ دیکھا، سارے حالات سننے کے بعد اس نے کہا گھبرانے کی بات نہیں مریض اچھا ہو جائے گا، اس نے بیگ میں سے چند گولیاں نکال کر دیں، ایک گولی آپ کو فوراً کھلا دی گئی۔ اس کی دوا سے ایک گونہ افاقہ ہوا اور تشویش میں ایک حد تک کمی ہوئی، لیکن اصل مرض اپنی جگہ پر رہا۔

توقع سے کہیں زیادہ پورے قافلہ کو بمبئی میں قیام کرنا پڑا، دوسری تکلیف نے تیمار داروں کو اور تشویش میں مبتلا کر دیا، آپ کو تشنج کے دورے پڑنے لگے، دن میں کئی کئی بار یہ دورے پڑتے تھے۔

بمبئی سے اندور

اب بمبئی میں رہنا بے سود تھا اس لیے فیصلہ ہوا کہ پورا قافلہ یہاں

سے کوچ کرے، یہ سفر بمبئی سے کسارا گھاٹی تک ٹرین سے ہوا پھر وہاں سے دوسری سواریوں سے اندور پہونچا۔ چھکڑے اور بیل گاڑی کے سفر نے امام ربانی کے کمزور اور نحیف جسم کو چور کر کے رکھ دیا اور حالت انتہائی خطرناک ہو گئی۔

مولانا ابوالنصر نے قافلہ والوں سے کہا کہ اب آپ حضرات وطن کو روانہ ہو جائیں میں یہاں رک کر مکمل علاج کراؤں گا میرے قیام کی کوئی متعین مدت نہیں آپ لوگ کیوں پریشان ہوں چنانچہ رام پور کا پورا قافلہ وطن کے لیے چل پڑا مولانا ابوالنصر کرایہ پر ایک مکان لے کر وہیں ٹھہر گئے۔

اس زمانہ میں ہندوستان کے مشہور ترین طبیب حکیم محمد اعظم خاں جن کی فن طب میں ایک کتاب ''اکسیر اعظم'' بہت مشہور ہے اندور میں شاہی طبیب تھے اس زمانہ میں ان کا مشاہرہ ایک ہزار روپے تھا، مولانا ابو النصر ان سے ملے مریض کی صورت حال بیان کی، تعارف کے ذیل میں حکیم صاحب رام پور کے ایک عالم کے شاگرد نکلے، اس تعلق کی بنیاد پر آپ نے امام ربانی کی قیامگاہ پر جاکر نبض دیکھی، حالات پوچھے اور نسخہ لکھا، پھر دوا کا استعمال شروع ہوا اس دوا کے استعمال کرتے ہی حیرتناک تبدیلی شروع ہو گئی اور روز بروز افاقہ محسوس ہونے لگا اور بتدریج مرض میں کمی ہوتی چلی گئی اور اب امام ربانی خود کروٹ بدل لیتے پھر از خود اٹھ کر بیٹھ جانے لگے، اب مایوسیوں کا بادل چھٹنے لگا اور اُمید ہو چلی کہ اب بہت جلد ہم وطن کو روانہ ہو سکیں گے لیکن دوسری طرف یہ الجھن ہونے لگی کہ جو زادراہ اور روپیہ سفر حج کی نیت سے ساتھ تھا طویل قیام کی وجہ سے ختم ہونے لگا، اندیشہ یہ تھا کہ جب پاس کے پیسے ختم ہو جائیں گے تو وطن کی روانگی کیوں کر ہو گی۔

بیگم بھوپال کی اندور میں آمد

جب اندور میں امام ربانی حکیم اعظم صاحب کے زیر علاج تھے، اسی زمانہ میں والیۂ بھوپال سکندر جہاں بیگم نے سفر حج کا ارادہ کیا اور وہ بھوپال سے چل کر اندور میں کچھ دن قیام کے لیے رکیں، ان کے ہمراہ شیخ عبدالکریم قلعہ دار بھوپال بھی تھے جو بیگم بھوپال کے ہمراہ سفر حج پر جا رہے تھے، وہ مولانا ابو النصر صاحب کی بیوی کے چچا تھے جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ اندور میں اس وقت اپنے شوہر کے ساتھ امام ربانی کی تیمار داری میں لگی ہوئی ہیں تو وہ ان سے ملنے کے لیے ان کی قیام گاہ پر آئے ان کے بھائی منشی خیر الدین صاحب بھوپال میں وزیر ریاست تھے مولانا ابو النصر کی اہلیہ انھیں کی صاحبزادی تھیں جب شیخ عبدالکریم کے ذریعہ سکندر جہاں بیگم کو معلوم ہوا کہ ہمارے وزیر منشی خیر الدین کی صاحبزادی اندور میں ہیں تو انھوں نے شکایت کی کہ وہ ملنے کیوں نہیں آئیں اور کہا کہ وہ آکر مجھ سے مل جائیں، جب یہ خبر مولانا ابو النصر صاحب کی اہلیہ کو ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئیں انھوں نے قاصد سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میری طرف سے یہ کہہ دو کہ:

> "میں ایک لمبے عرصے سے مسافرت کی ٹھوکریں کھا رہی ہوں ہر طرح کی پریشانیوں اور الجھنوں نے خستہ کر رکھا ہے ایسی عظیم المرتبت شخصیت کی خدمت میں حاضر ہونے کے لائق نہیں ہوں، ایسا محسوس کیا جائے گا کہ کوئی سائل حاضر ہو رہا ہے اور میری غیرت اس کو قبول نہیں کرتی اس لیے مجھے معذور سمجھ کر معاف فرما دیا جائے تو کرم ہوگا۔"

جب یہ غیرت مندانہ معذرت بیگم بھوپال کو پہونچی تو بہت متاثر

ہوئیں انھوں نے وکیل کے ذریعہ دو سو روپے بھیجے کہ میری طرف سے دعوت کے لیے یہ قبول کرلیا جائے اور اپنی ضرورتوں میں صرف کیا جائے۔

امداد غیبی

جس بے سروسامانی کے عالم میں حضرت گنگوہی نے سفر حج کیا تھا وہ معلوم ہے کہ ان کے سفر حج کے سارے اخراجات ڈپٹی عبدالحق رام پوری نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا اس لیے امام ربانی کے پاس زادراہ کے نام سے کچھ بھی نہیں تھا، مولانا ابوالنصر نے کچھ زمین اور زیورات فروخت کرکے اتنی رقم ساتھ لی تھی جو معمول کے مطابق ہونے والے سفر حج کے لیے کافی تھی لیکن اسی رقم میں اپنی اہلیہ کو بھی سفر حج میں لے گئے، اور ان کے ساتھ ایک نوکرانی بھی اپنے ساتھ رکھی یعنی تین نفر کا خرچ تھا پھر سات آٹھ مہینے میں یہ سفر ختم ہو جاتا تھا، یہاں ایک سال سے زائد لگ گئے، دوا علاج پھر بمبئی اور اندور میں کرایہ کے مکان اور دوسری ضروریات میں روپے خرچ ہوتے گئے اب اندیشہ پیدا ہو چلا تھا کہ زادراہ ایک دم نہ ختم ہو جائے، ایک ماہ اندور میں قیام کرنا پڑا ان اسباب کی وجہ سے اخراجات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا جس کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں تھا، والیۂ بھوپال کی اندور آمد اور ان کا شاہانہ عطیہ دو سو روپے جو ایک شخص کے پورے سفر حج کے اخراجات کے لیے کافی تھا یہ اس لٹے ہوئے قافلہ کے لیے نعمت غیر مترقبہ اور امداد غیبی تھی جس پر مولانا ابوالنصر اور اُن کی اہلیہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔

وطن کے لیے روانگی

امام ربانی کی صحت میں بتدریج سدھار ہوتا چلا جارہا تھا حکیم اعظم

خاں نے مشورہ دیا کہ اب آپ لوگ وطن کے لیے روانہ ہو جائیں وہاں کی آب و ہوا میں جلد از جلد صحت عود کر آئے گی، مولانا ابو النصر نے فوراً تیاری کی اور مختلف طرح کی سواریوں کے ذریعہ گوالیار اور میرٹھ ہوتے ہوئے گنگوہ پہونچے، دوا کا استعمال اب بھی جاری تھا، چھ سات ماہ بعد مکمل صحت ہوئی، حضرت گنگوہی نے اوائل ۱۲۸۰ھ - ۱۸۶۳ء میں یہ سفر کیا اور جب آپ گنگوہ واپس ہوئے ۱۲۸۲ھ میں بھی دو ماہ گذر چکے تھے۔

باب ۹

دارالعلوم دیوبند کا قیام

سفر حج سے واپسی کے بعد آپ دس سال مسلسل گنگوہ میں رہے ان دس سالوں میں تعلیم و تدریس اور بیعت وارشاد کا مشغلہ روز افزوں ہو گیا، دن طلبہ کو مختلف کتابوں کے اسباق میں گذرتا تھااور رات ذکر الٰہی میں، ان دس سالوں میں بیعت کے لیے رجوع بہت بڑھ گیا، قرب وجوار ہی سے نہیں دور دراز علاقوں سے طالبین سلوک گنگوہ حاضر ہوتے اور آپ سے سلوک و معرفت کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور بیعت ہونے کی غرض سے بھی حاضری ہوتی رہتی تھی اسی زمانہ میں مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارن پوری شارح ابوداؤد بیعت کے لیے حاضر ہوئے اوران کے اصرار پر ان کو بیعت کیا اس کے بعد اکابر علماء نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب صدر دارالعلوم دیوبند پھر ان کے بعد شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اور آپ کے برادر اکبر حضرت مولانا صدیق احمد مدنی وغیرہ بیعت ہوئے اور بعد میں یہ حضرات حضرت گنگوہی کے اجلہ خلفاء میں ہوئے۔

حضرت گنگوہی کا ایک سفر

آپ اسفار بہت کم کرتے تھے، اس دوران ایک قابل ذکر سفر کا حال معلوم ہوا وہ دارالعلوم دیوبند میں جلسہ دستار بندی میں شرکت اور

عمارت جدید کے سنگ بنیاد رکھنے کے سلسلہ میں ہوا تھا۔

دار العلوم دیوبند تو ۱۸۶۶ء - ۱۲۸۳ھ میں قائم ہو چکا تھا حضرت گنگوہی کے بچپن کے دوست اور رفیق درس حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی دار العلوم کے روح رواں تھے، دار العلوم کا قیام آپ کی تمناؤں کا مظہر تھا اور اس سے دلی وابستگی تھی کیوں کہ اصلاح اُمت کے لیے علوم اسلامی کا فروغ اور اس کی اشاعت ضروری ہے۔ دینی تعلیم کو عام کرنا خود آپ کا مشن تھا یہی وجہ ہے کہ فراغت کے بعد سے مسلسل آپ نے اپنے وطن میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ حسبۃً للہ جاری کر رکھا تھا اگر چہ یہ باقاعدہ مدرسہ نہیں تھا، لیکن یہ سلسلہ کبھی بند نہیں ہوا، بعد کے دور میں تو اس کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی اور ہر علاقے کے طلبہ نے گنگوہ کی اس درس گاہ سے استفادہ کیا۔

۱۲۹۲ھ میں دار العلوم دیوبند کا پہلا جلسہ دستار بندی ہوا جس میں خصوصیت کے ساتھ مولانا احمد علی محدث سہارن پوری تلمیذ حضرت شاہ اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کو زحمت سفر دی گئی تھی، یہ حضرات تشریف لائے اور اپنے ہاتھوں سے فضلاء دار العلوم کے سروں پر دستار باندھی، اس زمانہ میں اس جلسہ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی۔

اس جلسہ میں ممتاز اور مشہور علماء کی بہت بڑی تعداد شریک ہوئی تھی اس لیے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے حاضرین جلسہ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ مدرسہ نے اپنی ایک زمین خرید لی ہے تاکہ اس زمین پر دار العلوم کی اپنی عمارت تعمیر ہو، اتنی بڑی تعداد میں اکابر علماء کا اجتماع آئندہ بہت مشکل ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات میری تجویز کو منظور فرمائیں اور سنگ بنیاد کی جگہ پر تشریف لے چلیں۔

تمام علماء اس جلسہ سے اٹھ کھڑے ہوے، حضرت نانوتوی ان کو لے کر اس مقام پر پہونچے جہاں بنیاد کھود کر تیاری کی جا چکی تھی سنگ بنیاد کی کارروائی کی روداد تاریخ دار العلوم کے مطابق یہ ہے:

"سب سے پہلے مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے درخواست کی گئی کہ وہ بنیاد کی پہلی اینٹ رکھ دیں پھر حاجی عابد حسین صاحب سے دوسری اینٹ رکھوائی گئی اس کے بعد حضرت نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا مظہر نانوتوی نے ایک ایک اینٹ رکھی، تعمیر کا آغاز ۱۲۹۳ھ سے ہوا اس لیے کتابوں میں تاریخ ۱۲۹۳ھ لکھی جاتی ہے جب کہ سنگ بنیاد ۱۲۹۲ھ میں رکھا گیا" (تاریخ دار العلوم دیوبند ج: ۱، ص: ۱۸۳)

باب ۱۰

اکابر کا حج، دارالعلوم کی فکر اور بعض حوادث

دس برس کا عرصہ آپ نے گنگوہ میں گذارا، پھر اتفاق سے صورت حال ایسی ہوئی کہ آپ نے پھر اپنے والدین میں سے کسی ایک کنبے کے حج بدل کا ارادہ فرمالیا، پہلے کی بہ نسبت اب حالات اطمینان بخش تھے۔

۱۲۹۴ھ تک پہلے کی بہ نسبت اب سفر حج آسان ہو گیا تھا، اب سہارنپور سے بمبئی تک ریلوے کا نظام جاری ہو چکا تھا اور بادبانی کشتیوں کے بجائے بحری جہاز سمندر کی سطح پر دوڑنے لگے تھے، اس سے پہلے سفر حج میں پورا ایک سال لگ جاتا تھا، اب یہ مدت بہت کم ہو گئی تھی پھر بھی حجاج کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی، جن کے دلوں میں زیارت حرمین کا عشق شعلہ جوالہ بن جاتا وہی اس سفر کے لیے تیار ہوتا تھا، اللہ والے تو ہر دور میں اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھ کر اپنے اس جذبے کی تسکین کر لیتے تھے یا وہ لوگ جو اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس نیت سے یہ سفر کرتے تھے کہ اسی مقدس سرزمین میں ہمیشہ کے لیے پیوند خاک ہو جائیں گے۔ علماء حق اور بزرگان دین اسباب و ذرائع کے فقدان کے باوجود انتہائی دشواریوں اور مصیبتوں کے دور میں بھی برابر زیارت حرمین کے لیے جاتے رہتے تھے۔

۱۲۹۴ھ کے سال کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ہندوستان کے مشاہیر و ممتاز علماء، محدثین اور مشائخ کے دلوں میں یک بیک زیارت حرمین کا داعیہ

پیدا ہوا اور بڑی تعداد میں اس مبارک سفر کے لیے تیار ہوے اور دوسرے لوگوں کو ان اکابر کے سفر کا علم ہوا تو وہ خود بھی اس سعادت کے لیے ان علماء عظام کے ہم سفر ہونے کے واسطے بے چین ہو گئے اور شریک سفر ہو گئے، اس کاروان حجاز میں ہندوستان کے ممتاز ہمہ گیر شہرت کے مالک جو علماء شریک تھے ان میں خصوصیت کے ساتھ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۱) صدر المدرسین دار العلوم دیوبند، شاہ رفیع الدین (۲) مہتمم دار العلوم دیوبند، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی (۳) روح رواں مظاہر علوم سہارن پور مولانا حکیم محمد احسن

---

(۱) مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی وولات نانوتہ ضلع سہارنپور میں ۱۲۴۹ھ میں ہوئی دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر المدرسین ہوے آپ کے شاگردوں میں اکابر علماء دیوبند شامل ہیں۔ آپ نے بانی دار العلوم حضرت نانوتوی کے حالات میں ایک مختصر رسالہ لکھا ہے جو بہت اہم ہے، آپ مولانا مملوک علی نانوتوی استاد عربک کالج دہلی کے صاحبزادے تھے مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری کے حقیقی ماموں تھے جید عالم تھے آپ پر جذب وسلوک کا غلبہ تھا فقہ وحدیث میں کمال حاصل تھا ۱۳۰۲ھ - ۱۸۸۴ء میں وفات ہوئی۔

(۲) دار العلوم دیوبند قائم کرنے والی جماعت کے ایک رکن تھے دار العلوم دیوبند کے پہلے باضابطہ مہتمم بنائے گئے، آپ شاہ عبد الغنی مجددی محدث دہلوی سے بیعت تھے اور آپ کے خلیفہ مجاز تھے آپ کی ولادت دیوبند میں ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء میں ہوئی، دیوبندی آپ کی وفات ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء میں ہوئی، وہیں آسودۂ خواب ہیں۔

(۳) مولانا محمد مظہر نانوتوی، حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے خاندان سے ہیں، اس دور کے ممتاز علماء میں شمار تھا، مظاہر علوم سہارنپور کا مسجد میں آغاز کرنے والے تو مولانا سعادت علی سہارنپوری ہیں لیکن اس کو مدرسہ عربی سے مظاہر علوم بنانے والے یہی مولانا مظہر نانوتوی ہیں انھیں کی طرف منسوب ہو کر یہ نام مشہور بھی ہوا اسی لیے ان کو بانی مظاہر علوم بھی کہا جاتا ہے، عرصہ دراز تک یہیں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، دورۂ حدیث کی کتابیں آپ سے متعلق تھیں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے عمر میں بڑے تھے لیکن آپ سے بیعت ہوے آپ کے خلیفہ مجاز ہوئے اور خادمانہ آپ کی مجلس میں حاضری دیتے تھے آپ کی وفات ۲۴ / ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ، اکتوبر ۱۸۸۵ء میں ہوئی۔

صاحب برادر حضرت شیخ الہند، حضرت نانوتوی کے ممتاز شاگرد مولانا حافظ عبد العدل، مولانا محمد منیر نانوتوی (۱) مہتمم دار العلوم دیوبند اور مولانا احمد حسن کانپوری (۲) مع اہلیہ کے نام شامل ہیں۔ اس قافلہ کی اتنی شہرت تھی کہ ہر بڑے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر ملاقاتیوں کی بھیڑ موجود رہتی تھی، یہ قافلہ کچھ کم وبیش ایک سو افراد پر مشتمل تھا۔

اٹاوہ میں استقبال

چوں کہ اس کاروان حج کو اس وقت بہت شہرت حاصل ہوئی اس لیے میں اس کی مقبولیت، پذیرائی، استقبال و خیر مقدم کی کچھ جھلکیاں آپ کے سامنے پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں، تاکہ اندازہ ہوسکے کہ پورے ملک میں لوگوں نے اس قافلہ کو کس نگاہ سے دیکھا اور کتنی اہمیت دی اور کتنا اعزاز دیا یہ ساری تفصیلات حضرت گنگوہی کے سوانح نگار

---

(۱) مولانا محمد منیر نانوتوی مولانا مظہر نانوتوی کے بھائی اور حضرت نانوتوی بانیٔ دار العلوم کے خاندان سے تھے، بریلی کے ایک کالج میں بہت دنوں تک استاد رہے پھر آپ دار العلوم دیوبند کے مہتمم بنائے گئے، دار العلوم کے نظام کو نہایت دیانت داری سے چلایا ایک بار کچھ رقم لے کر دہلی دار العلوم کی روداد چھپوانے کے لیے گئے، روپے چوری ہوگئے تو وہیں سے نانوتہ گئے اور اپنی زمین بیچ کر روپیہ لیا اور دہلی جاکر روداد طبع کرا کے لائے اور کسی کو اس کی خبر نہ ہونے دی راز کھل جانے پر لوگوں نے بہت چاہا کہ وہ اپنی رقم واپس لے لیں مگر انھوں نے منظور نہیں کیا۔ (اسیر ادروی)

(۲) مولانا احمد حسن کانپوری کی ولادت بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب میں ہوئی اور وہیں نشو ونما پائی اور بچپن گذرا، مقامی طور پر کچھ تعلیم حاصل کر کے آپ یوپی میں آئے اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی کے شاگرد ہوئے، فراغت کے بعد ایک عرصہ تک مظاہر علوم سہارنپور میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر کانپور کے مدرسہ فیض عام میں چلے گئے، اور پھر یہیں کانپور میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور یہیں تازندگی رہے اور زندگی کے اخیر لمحہ تک اسی مدرسہ میں رہے ایک ایک دن میں چودہ پندرہ سبق پڑھانے پڑے، دین دار اور متقی تھے حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی سے بیعت تھے، منطق کی مشہور کتاب "حمد اللہ" پر اور مثنوی معنوی پر حواشی لکھے ہیں، امکان کذب اور امتناع نظیر پر بھی ان کے رسالے ہیں وفات ومدفن کانپور (۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء) میں ہے (کاروان رفتہ)

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کی ہیں میں یہ تفصیل انھیں سے مستعار لے کر آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

اٹاوہ میں منشی نذیر احمد صاحب تحصیلدار تھے ان کی ہمشیرہ یعنی مولانا مظہر نانوتوی بانی مظاہر علوم سہارن پور کی اہلیہ محترمہ بھی اس قافلہ میں شریک تھیں اس لیے انھوں نے مولانا محمد مظہر صاحب سے اصرار کیا کہ پورا قافلہ ایک دن کے لیے اٹاوہ میں قیام کرے تاکہ ہم کو میزبانی کا شرف حاصل ہو سکے۔

اٹاوہ کے رئیس کبیر ممتاز علی خاں کنبوہ شہر کے ممتاز ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور بڑے اثر و رسوخ کے آدمی تھے، دولت و ثروت حکومت و ریاست اور بزرگوں سے مخلصانہ عقیدت رکھتے تھے ان کے دل میں بھی یہ جذبہ تھا کہ اس مقدس قافلہ کی میزبانی کی عزت حاصل ہو جائے تو بڑی سعادت ہو گی۔

چونکہ حضرت گنگوہی نے ان کی دعوت منظور فرمالی تھی اس لیے ٹکٹ اٹاوہ ہی تک کا عام طور سے لیا گیا تھا، البتہ کچھ حضرات نے لاعلمی کی وجہ سے آگے تک کا ٹکٹ لے رکھا تھا جب ٹرین اٹاوہ اسٹیشن پر پہونچی تو منشی محمد نذیر اور ممتاز علی خاں کنبوہ اپنے کئی سو آدمیوں کے ساتھ اسٹیشن پر استقبال کے لیے موجود تھے، جن لوگوں کے پاس اٹاوہ تک کا ٹکٹ تھا وہ فوراً پلیٹ فارم پر اتر آئے لیکن جن لوگوں کے پاس آگے کا ٹکٹ تھا وہ ڈبے ہی میں رہے، ممتاز علی خاں صاحب کو جب اس کا پتہ چلا کہ محض ٹکٹ کی وجہ سے یہ حضرات نہیں اتر رہے ہیں تو انھوں نے جاکر ان حضرات سے کہا کہ ٹکٹ کی پروانہ فرمائیں اس کی ذمہ داری میری ہے آپ کا ٹکٹ ضائع نہیں ہوگا اس اطمینان دہی پر سب حضرات ٹرین سے اتر آئے اس کے بعد کا واقعہ تذکرۃ الرشید میں ہے:

"سارے قافلہ کی تحصیلدار صاحب اور نواب صاحب دونوں جاں نثاروں نے دعوت کی اور شرف ملازمت اور نعمت ہائے خدمت سے بہرہ اندوز اور مالا مال ہوئے آخر ان حضرات کے ارشاد کے موافق جس وقت کا حکم ہوا ریل پر سوار کرانے اسٹیشن پر حاضر ہوئے اور سارے قافلہ کو ریل میں بٹھا کر اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔" (تذکرۃ الرشید، ص: ۲۳۲)

دوران سفر نماز با جماعت کا اہتمام

ریل سے بمبئی تک کے سفر کے دوران ہمیشہ نماز با جماعت کا اہتمام ہوتا، نماز کے وقت ٹرین کسی ایسے اسٹیشن پر پہونچی جہاں قدرے دیر تک ٹھہرتی تو اسی اسٹیشن پر پوری جماعت ٹرین سے اتر جاتی اور فوراً صفیں درست کر کے فرض نمازیں ادا کرلی جاتی تھیں جو سفر کی وجہ سے قصر کی جاتی تھی، اگر نماز کا وقت ختم ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا تو ڈبے ہی میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرلی جاتی، کیوں کہ یہ حضرات جس ڈبے میں سوار تھے اس میں کوئی دوسرا مسافر نہیں ہوتا تھا یا دو چار ہوتے تو وہ خود اس کی رعایت کرتے اور جگہ بنا دیتے تھے، وضو کے لیے ایک اسٹیشن پہلے ہی سے تیاری کرلی جاتی اور حتی الامکان ایک وضو سے کئی کئی نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔

امامت زیادہ تر حضرت گنگوہی فرماتے یا مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر المدرسین دار العلوم دیوبند فرماتے، چونکہ قافلہ میں اکثریت علماء کی تھی مسائل سے ہر شخص واقف تھا، شریعت نے جو سہولتیں دی ہیں ان سہولتوں پر عمل کرتے، جماعت کے ساتھ نماز ہلکی پڑھی جاتی تھی تاکہ ٹرین کے چھوٹنے کا دلوں میں وسوسہ نہ پیدا ہو جائے۔

امام صاحب کو تنبیہ

ایک بڑے اسٹیشن پر ٹرین رکی تمام حضرات ڈبوں سے نکل آئے اور پلیٹ فارم پر صفیں درست کرلیں امامت کے لیے مولانا سخاوت انبیٹھوی صاحب آگے بڑھے انھوں نے معمول کے خلاف لمبی قرأت کی رکوع اور سجود کو بھی ضرورت سے زیادہ طول دیتے رہے، نماز پوری ہوئی امام صاحب نے سلام پھیرا تو کچھ دلوں میں ٹرین کے چھوٹنے کا وسوسہ پیدا ہونے کا لحاظ فرماتے ہوئے حضرت گنگوہی نے امام سے فرمایا

"کہیں ایسی نماز ایسے سفر میں پڑھی جاتی ہے؟"

(تذکرۃ الرشید، ج:۱، ص: ۲۳۴)

پیشین گوئی پوری ہوئی

خلاف معمول بمبئی میں بیس بائیس دن ٹھہرنا پڑ گیا کوئی جہاز نہیں تھا، حضرت گنگوہی اور رفقاء پریشان تھے، بلاوجہ وقت ضائع ہو رہا ہے حضرت نانوتوی فرماتے تھے کہ جب تک میرے رفقاء اور احباب مظفر نگر سے نہیں آجائیں گے تب تک جہاز آنے سے رہا، لوگ اسے تفریح سمجھ رہے تھے، بائیسویں دن جب مظفر نگر کا قافلہ آیا ٹھیک اسی دن ایک جہاز ساحل پر لگا اور ٹھیکیدار نے ٹکٹ تقسیم کرنا شروع کر دیا، جدہ کا کرایہ اوپر کا 45/= تھا اور نچلی سطح کا 25/= روپے، اپنی اپنی صوابدید کے مطابق لوگوں نے ٹکٹ لئے اور بکنگ کے بعد فوراً جہاز اپنے سفر پر روانہ ہو گیا اور تیرہویں دن جدہ کے ساحل پر لگ گیا۔

مرشد کی جانب سے استقبال

اس مبارک قافلہ کی اطلاع مکہ مکرمہ پہونچ چکی تھی، کیونکہ بعض

حضرات پہلے جہاز سے جاکر حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی کو اس قافلہ کی روانگی کی خبر دے چکے تھے آپ سے تعلق و نسبت رکھنے والوں میں ممتاز اور سر بر آوردہ حضرات آج تشریف لا رہے ہیں؛ آپ کو اس خبر سے ایسی خوشی ہوئی کہ فصیل شہر تک تشریف لائے اور قافلہ کے انتظار میں وہاں ٹھہرے رہے جب یہ مقدس قافلہ پہونچا تو دیکھا کہ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب اپنی پیرانہ سالی کے باوجود کمر سے پٹکا باندھے ہوئے اپنے خدام کا اعزاز بڑھانے کے لیے استقبال اور پذیرائی کے لیے موجود ہیں۔ اس قافلہ میں اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کے کئی خلفاء اور مقرب مریدین تھے، ان حضرات نے جب دیکھا کہ حضرت مرشد خود موجود ہیں تو وہ بیتابانہ بڑھے، حاجی صاحب نے ہر ایک سے سلام و مصافحہ ہی نہیں فرمایا بلکہ فرداً فرداً ہر ایک سے معانقہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ آپ حضرات ہماری رباط میں تشریف لے چلیں، اپنے شیخ کی معیت میں یہ قافلہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوا۔

پھر ایام حج آئے، مناسک حج کی ادائیگی کے بعد یہ قافلہ مدینہ منورہ پہونچا، وہاں تین ہفتے ٹھہرا اور تمام زیارت گاہوں کی زیارت سے شرف اندوز ہوا۔

ایک خاص واقعہ

ہندوستانی مہاجرین میں دو شخصیتیں جو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں مقیم تھیں وہ قافلہ والوں میں سے بہتوں کے لئے مرکز عقیدت تھیں ان میں ایک حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی جو اکثر علماء کے شیخ و مرشد تھے جن کی زیارت و ملاقات ان بزرگوں کے لیے بڑی سعادت کی بات تھی، حاجی صاحب مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، دوسری شخصیت حضرت شاہ عبد الغنی

مجددی دہلوی محدث کی تھی وہ مدینہ منورہ میں مقیم تھے اس قافلہ کے اکثر علماء کے وہ استاد تھے ان سے حدیث پڑھی تھی ان حضرات کی سند حدیث انھیں کے واسطے سے اُوپر جاتی ہے، حضرت نانوتوی حضرت گنگوہی وغیرہ نے صحاح ستہ انھیں سے پڑھی تھیں، دار العلوم دیوبند کے مہتمم مولانا شاہ رفیع الدین دیوبندی انھیں کے شاگرد بھی تھے اور انھیں کے خلیفہ بھی، مولانا رفیع الدین صاحب اپنے شیخ و مرشد کی خدمت میں مستقل رہنے کا جذبہ دل میں لے کر آئے تھے اور وہ مدینہ منورہ سے واپسی کا ارادہ نہیں رکھتے تھے اپنے اس جذبے کا حضرت شیخ سے اظہار بھی کر دیا تھا اور ان کو اجازت بھی مل گئی تھی۔

اس واقعہ سے وہ تمام حضرات تشویش میں مبتلا ہو گئے جو دار العلوم دیوبند کو مضبوط و مستحکم بنانے اور اس کو ترقی دینے کا جذبہ رکھتے تھے، مولانا رفیع الدین صاحب اس وقت دار العلوم کے مہتمم تھے اور سارے نظام کو سنبھالے ہوئے تھے، ان کے زہد و تقدس، ان کی دیانتداری اور تقوی ہر شک وشبہ سے بالاتر تھا، ان کی انتظامی صلاحیت کی وجہ سے دار العلوم روز افزوں ترقی پر تھا، ان کی عدم موجودگی میں اس کی ترقی کی رفتار رک جانے کا اندیشہ محسوس کرتے تھے، اس لئے وہ کسی قیمت پر نہیں چاہتے تھے کہ مولانا رفیع الدین صاحب یہاں ہمیشہ کے لئے قیام پذیر ہو جائیں۔

حضرت گنگوہی کا مشورہ

حضرت شاہ عبد الغنی مجددی تو قیام کی اجازت دے چکے تھے اس لیے جب دار العلوم دیوبند کے صدر المدرسین مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت! مولانا رفیع الدین صاحب کے نہ جانے سے دار العلوم کو سخت نقصان

پہونچے گا آپ ان کو قیام کی اجازت نہ دیں، ان حضرات کی بات سن کر شاہ صاحب نے حضرت گنگوہی سے مشورہ فرمایا اور صورت حال بتائی کہ مولوی رفیع الدین صاحب یہاں رہنا چاہتے ہیں اور یہ لوگ مصر ہیں کہ ان کو ہندوستان جانا ضروری ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟ حضرت گنگوہی نے استاد محترم سے ادب کے ساتھ عرض کیا کہ حضرت! دیوبند کا مدرسہ اسلام کی ایک بڑی خدمت ہے اس کے اہتمام کے واسطے مولوی رفیع الدین جیسا متدین آدمی ملنا مشکل ہے اسی لیے یہ حضرات مصر ہیں کہ مدرسہ کو نقصان نہ پہونچے، حضرت شاہ صاحب نے اس صائب مشورہ کے بعد مولانا رفیع الدین صاحب سے فرمایا کہ آپ کا ہندوستان جانا ضروری ہے، دین کی خدمت بہت بڑی بات ہے، اللہ تعالیٰ جن سے اپنے دین کی خدمت لیتا ہے یہ اس کی خوش نصیبی ہوتی ہے اس لیے آپ کے ساتھیوں کا اصرار بجا ہے اور میری بھی اب یہی رائے ہے کہ آپ ہندوستان واپس جائیں اور مدرسہ کی خدمت کریں کیونکہ یہ دین کی اہم ترین خدمت ہے۔

مولانا رفیع الدین صاحب نے اپنے شیخ اور استاد کے حکم کی تعمیل فرمائی اور جملہ رفقاء کے ساتھ ہندوستان واپس تشریف لائے، حضرت گنگوہی کی واپسی ۱۲۹۵ھ میں ہوئی اور یہاں آکر اپنے سابقہ مشغلہ میں مشغول ہو گئے۔

کچھ روح فرسا حادثے

سفر حج سے واپسی کے بعد بیعت وارشاد اور تعلیم وتدریس کا سلسلہ آپ نے جاری کردیا اور ہر طرف سے بے فکر ہو کر صرف دین کی خدمت ہی شب و روز آپ کے مد نظر تھی، خالص دینی مشغولیتوں میں

آپ مسلسل لگے رہے اور سال گذرتے رہے ان سالوں میں کئی حادثے پے در پے آپ پر پڑے۔

ماموں کی وفات

ایک حادثہ تو آپ کے گھر کا تھا۔ آپ سات برس کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے، آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے ماموں مولوی عبدالغنی نے اس طرح کی جیسے ہر باپ اپنے بیٹے کی کرتا ہے، ایسے شفیق ماموں کا انتقال بڑا ہی دلدوز حادثہ تھا۔

حضرت نانوتوی کا حادثہ وفات

دوسرا بڑا حادثہ رفیق دیرینہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کا حادثہ وفات ہے جو ۱۲۹۷ھ میں ہوا، حضرت نانوتوی سے ۱۷ سال کی عمر اور طالب علمی کے دور سے جو ساتھ ہوا تو زندگی کے اخیر لمحوں تک یکساں ہی رہا، بلکہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا گیا، چار سالہ طالب علمی کا دور جو بحث و مباحثہ علمی چہل پہل میں۔ دہلی کی گلیوں میں کتابیں بغل میں دبائے دوش بدوش آمد و رفت، دین کی سرگرمیوں میں اشاعت اسلام اور بدعات و خرافات اور مشرکانہ عقائد اور رسم و رواج کے استیصال میں ہر ایک کا دوسرے کے کام میں تعاون اور ہر ایک دوسرے کا ہم نوا اور ہم خیال ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ دونوں شخصیتیں بیک وقت اسلامی ہند میں ملت اسلامیہ کی اصلاح اور مسلمانوں کو اسلام کی صاف ستھری شاہراہ پر لانے کے لیے قدرت نے پیدا کیا ہے، دونوں میں کامل یکجہتی، دونوں میں دین کے لیے ایک ہی طرح کا جذبہ موج زن، ایک ہی طرح کی دینی سرگرمیوں میں مصروف، ذہنی و فکری اتحاد، نصب العین کی یکسانیت کارزار زندگی

میں سب سے مضبوط رشتہ اتحاد ہوتا ہے عیش وتنعم کی دوستی تارعنکبوت اور درد کا رشتہ ناقابل شکست ہوتا ہے، دونوں میں دین کے اسی درد کا رشتہ تھا کہ کس طرح مسلمانوں کو غیر اسلامی طور طریقوں سے نکالا جائے اس لیے حضرت نانوتوی کا حادثہ وفات حضرت گنگوہی کے لیے اتنا زہرہ گداز اور روح فرسا تھا کہ آپ فرماتے تھے:

”میں اپنے دوست کے جسد بے روح کو دیکھ کر زندہ رہ گیا یہی حیرتناک بات ہے، قدرت کی منشا یہ نہیں تھی ورنہ ایک کے بجائے دولاشیں ایک ہی دن اُٹھتیں“

تیسرا بڑا حادثہ، جماعت دیوبند کے سرخیل دارالعلوم دیوبند کی بنیاد میں سب سے پہلی اینٹ رکھنے والے حضرت نانوتوی کے استاد مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (۱) کا ۱۲۹۷ھ میں ہوا، ان دونوں حوادث نے جماعت دیوبند کے حلقوں میں صف ماتم بچھادی اور اجتماعی درد وغم کی ایک تیز لہر دوڑادی، اصلاح اُمت دینی تعلیم کی اشاعت کا بے پناہ جذبہ رکھنے

---

(۱) مولانا احمد علی محدث سہارنپوری جلیل القدر محدث اور انتہائی ممتاز علماء میں ان کا شمار تھا ہندوستان میں احادیث کی کتابوں کو سب سے پہلے تصحیح کراکے طبع کرانے اور عام کرنے والے اور حدیث کی کتابوں پر مفید حواشی لکھ کر شائع کرنے والے آپ ہی ہیں، حفظ قرآن سے جب فارغ ہوے تو آپ کی عمر ۱۸ سال تھی اس کے بعد عربی شروع کی اور مولانا سعادت علی سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں پھر دہلی گئے وہاں مولانا مملوک علی نانوتوی مولانا وصی الدین سہارنپوری مولانا وجیہ الدین سہارنپوری سے پڑھا حدیث حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی سے مکہ مکرمہ جاکر پڑھی، حرم میں بیٹھ کر صبح سے ظہر کے وقت تک صحاح ستہ کی کتابیں نقل کرتے اور ظہر بعد شاہ صاحب سے درس لیتے جب اس طرح پڑھ کر سند حدیث حاصل کی تب ہندوستان واپس آئے اور یہاں درس دینا شروع کیا، ساری عمر صحاح ستہ کی تدریس اور تصحیح میں گذاری آپ نے اپنا مطبع کھولا اور اپنی تصحیح کردہ صحاح ستہ کی کتابوں کو شائع کرنے لگے اب تک ہندستان میں حدیث کی کتابیں نایاب تھیں اب گھر گھر پہونچ گئیں۔ بخاری شریف کے پچیس پاروں کے حواشی خود آپ نے لکھے اور آخری پانچ پاروں کے حواشی حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم سے لکھوائے اور پھر بخاری انھیں حواشی کے ساتھ شائع کی مطبع احمدی کے نام سے دہلی میں آپ کا کتب خانہ تھا ۱۲۹۷ھ-۱۸۸۰ء میں سہارنپور میں وفات ہوئی (کاروان رفتہ)

والے اس مقدس قافلے ہی کے ایک فرد حضرت گنگوہی بھی تھے حالت سفر میں ہم سفروں سے جدائی کتنی حوصلہ شکن ہوتی ہے، کس طرح دل و دماغ کی چولیں ہلا دیتی ہے اس کا اندازہ ہر اس شخص کو ہو سکتا ہے جو اس طرح کے حالات سے گذرا ہو۔

حضرت گنگوہی ان پیہم صدمات سے بہت متاثر ہوئے۔ یہ آپ کی قوت ضبط و تحمل تھی کہ آپ ان صدمات کو سہ گئے، آپ کے زہد و تقویٰ نے رضا بالقضا کے بلند مقام پر پہونچا دیا تھا اس لیے رفقاء سفر کے چھوٹ جانے کے باوجود آپ نے سفر جاری رکھا اور جب دل کی چوٹ کی کسک کچھ کم ہوئی تو اس سفر میں تیز رفتاری آگئی اور ان تمام ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے میدان میں آگئے جو ان کے رفقاء سفر نے اپنے ذمہ لے رکھی تھیں۔ ۱۲۹۸ھ میں دار العلوم دیوبند کی مجلس انتظامیہ نے متفقہ طور پر حضرت نانوتوی کی جگہ حضرت گنگوہی کو دار العلوم کا سرپرست بنالیا۔

تیسرا حج

ان حادثات اور صدمات کے تسلسل نے دل و دماغ کو پراگندہ، قوت عمل میں اضمحلال، روح میں بے چینی، اور دل کے اضطراب کو تیز آندھی کے نذر کر دیا، کسی طرح دل کو سکون اور چین نصیب نہیں ہو تا تھا تو آپ نے دیار رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس اور سکوں بخش فضا میں اڑ جانے ہی کو اس درد و کرب کا بہترین علاج تصور فرمایا اور انتہائی عجلت میں سفر حج کا فیصلہ کر لیا، حج میں اتنا کم وقت رہ گیا تھا کہ اس وقت کے حالات اور وسائل سفر کے پیش نظر موسم حج تک پہونچنا بظاہر ناممکن نظر آرہا تھا خدام نے سفر نہ کرنے کا مشورہ دیا بلکہ اصرار کیا، لیکن آپ کے دل میں جو جذبہ کروٹیں لے رہا تھا اس نے ان مشوروں پر کان نہیں دھرا اور آپ بمبئی

روانہ ہو گئے اور بات وہی ہوئی من کان للہ کان اللہ لہ اسی دن آپ کو جہاز مل گیا اور ایک دن پہلے آپ بلدۂ حرام میں پہونچ گئے، دوسرے دن سے مناسک حج کی ادائیگی شروع فرمادی، یہ سفر اس وقت ہوا جب ۱۲۹۹ھ رخصت ہو رہا تھا یہ چند ایام سفر حج میں گذر گئے اور جب آپ سفر حج سے واپس تشریف لائے تو ۱۳۰۰ھ کا نیا سال شروع ہو چکا تھا۔

باب ۱۱

زندگی کے مصروف ترین ایام

جب تک حضرت نانوتوی زندہ تھے وہی دارالعلوم کی سرپرستی فرماتے تھے، مختلف شہروں میں اسلامی مدارس قائم کر کے ان کی نگرانی فرماتے تھے اور ادیان باطلہ کے خلاف چومکھی لڑائی لڑتے تھے، عیسائیوں، آریوں، رافضیوں کی صفوں میں زلزلہ ڈالے ہوئے تھے، دوسری طرف دارالعلوم کے دائرہ کار کو وسیع سے وسیع تر بنانے کے جدوجہد میں مصروف تھے، حضرت گنگوہی اس طرف سے مطمئن ہو کر اپنے دائرہ کار میں مصروف علم تھے اور گنگوہ سے کم ہی باہر جاتے تھے اب صورت حال یکسر بدل گئی تھی، پوری جماعت کی نگاہیں اب صرف آپ کی ذات پر لگی ہوئی تھیں، اسی لیے پہلی فرصت میں دارالعلوم دیوبند کو آپ کی سرپرستی میں دیا جاچکا تھا، اس لیے اب گنگوہ سے باہر نکلنے اور بار بار دیوبند جانے کی ضرورت تھی اور اپنا گنگوہ کا مرکز رشد وہدایت بھی سنبھالنا تھا، اور حضرت نانوتوی کے چھوڑے ہوئے کاموں کی بھی دیکھ بھال کرنی تھی۔

جلسہ دستار بندی

سفر حج سے آپ کی واپسی کے تھوڑے ہی دنوں بعد دارالعلوم کی مجلس انتظامیہ نے جلسہ دستار بندی کا فیصلہ کیا، اس سے پہلے بھی یہ جلسے ہوتے تھے، سب سے پہلا جلسہ دستار بندی ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں ہوا،

جس میں پانچ فضلاء کی دستار بندی ہوئی، دوسرا جلسہ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں ہوا اس میں جتنے فضلاء کی دستار بندی ہوئی ان کی تعداد بھی پانچ ہی تھی، تیسرا جلسہ دستار بندی ہوا تو سات فضلاء کی دستار بندی ہوئی یعنی تعداد میں صرف دو کا اضافہ ہوا۔

حضرت گنگوہی کی سرپرستی میں جو پہلا جلسہ دستار بندی ہوا وہ ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۳ء) میں ہوا اس میں گیارہ فضلاء کی دستار بندی کی گئی یعنی سابقہ تعداد دگنی ہو گئی یہ جلسہ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں بڑا اہم مانا گیا اور اس کی بڑی شہرت ہوئی۔

جلسہ کی تیاریاں

اب تک دارالعلوم میں دستار بندی کے جو جلسے ہوتے رہے ان میں کوئی خاص تیاری نہیں ہوتی تھی اور نہ عام اعلان ہی کیا جاتا تھا، سادگی کے ساتھ قصبہ کے ممتاز علماء و افراد اور باہر سے چند علماء کو بلا لیا جاتا تھا عام لوگوں کے لیے کوئی دعوت نامہ نہیں جاری ہوتا تھا، اب کی بار پورے قصبہ دیوبند کی سرگرمیاں اس میں شامل تھیں، پہلی بار پوسٹر چھپوائے گئے جو ڈھائی سو کی تعداد میں تھے، دو ہزار خطوط چھپوا کر بھیجے گئے، ان کے علاوہ دستی خطوط لکھ کر جماعت کے معزز ترین لوگوں کو جلسہ میں شرکت کی دعوت دی گئی، یہ سب باتیں نئی تھیں اور سب سے اہم بات اس جلسہ کی یہ تھی کہ پہلی بار تمام حاضرین جلسہ کے کھانے پینے کا نظم کیا گیا، یہ دیوبند کے ایک رئیس کی جانب سے تھا، دستار بھی قصبہ کے رؤسا کی طرف سے ہدیہ تھیں، یہ جلسہ چھتہ مسجد کے بجائے جہاں اب تک مدرسہ چل رہا تھا اس نئی عمارت میں ہو رہا تھا جو حضرت نانوتوی نے زمین خرید کر ۱۲۹۲ھ میں اکابر کے ہاتھوں اس کا سنگ بنیاد رکھوایا تھا وہ عمارت

آٹھ سالوں میں بن کر تیار ہو گئی تھی، جہاں آج دار العلوم کی عمارتیں ہیں۔

حضرت گنگوہی نے اس جلسہ میں شرکت فرمائی، آپ اپنے طلبہ کے ساتھ دیوبند روانہ ہوئے، آپ ہی کے ہاتھوں سے دستار بندی ہونے والی تھی چونکہ آپ مہمان خصوصی تھے اس لیے آپ کا استقبال اکابر دار العلوم نے کیا اور جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔

حضرت گنگوہی نے دستار باندھی

دار العلوم کے صدر المدرسین مولانا یعقوب نانوتوی نے اپنی تقریر سے اجلاس کا افتتاح فرمایا اور بتایا کہ دار العلوم سے دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ ہونے والے گیارہ طلبہ کی دستار بندی آج حضرت گنگوہی کے دست مبارک سے ہوگی اس کے بعد جن گیارہ فضلاء کی دستار بندی ہوئی ان کے اسماء گرامی درج ہیں:

۱۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی
۲۔ مولانا علاء الدین نانوتوی
۳۔ مولانا محمد اسحاق نہٹوری
۴۔ مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی
۵۔ مولانا عبد المومن دیوبندی
۶۔ مولانا ناظر حسن دیوبندی
۷۔ مولانا محمد صدیق دیوبندی
۸۔ مولانا محمد یحییٰ دیوبندی
۹۔ مولانا قاضی نصرت الدین نگینوی
۱۰۔ مولانا محمد مرتضیٰ دہلوی
۱۱۔ مولانا عبد الرحمٰن مراد آبادی

حضرت گنگوہی کا وعظ

فضلاء کے سروں پر دستار فضیلت باندھنے کے بعد حضرت گنگوہی سے درخواست کی گئی کہ کچھ کلمات خیر سننے کی ہماری خواہش ہے خاص طور پر مہتمم دار العلوم مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی اور صدر المدرسین

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کا اصرار جب حد سے بڑھ گیا تو آپ نے فرمایا کہ وعظ تو مولانا محمد قاسم نانوتوی کا حق تھا، میں تو قطعاً نہیں کہتا، آپ کا اصرار ہے تو نماز جمعہ کے بعد جو کچھ مناسب ہوگا کہدوں گا۔

گنگوہ واپسی

جمعہ کی نماز کے بعد آپ نے تقریر فرمائی، جلسہ کے بعد چند یوم دیوبند میں قیام فرمانے کے بعد آپ گنگوہ واپس ہوئے، سہارن پور میں مظاہر علوم کے علماء نے درخواست کی کہ حضرت! چند گھنٹے مدرسہ میں تشریف فرما ہوں تو ہمارے لئے بڑی سعادت کی بات ہوگی آپ نے منظور فرمالیا ارباب مدرسہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، مظاہر علوم میں دستار بندی کا جلسہ کبھی نہیں ہوا تھا، دیوبند میں یہ جلسہ کئی بار ہو چکا حضرت گنگوہی کی واپسی پر ارباب مدرسہ نے درخواست کی کہ ہمارے مدرسہ کے دو فارغ طلبہ کی آپ دستار بندی فرمادیں تو ان کے لیے سرمایہ فخر وسعادت ہوگا فوراً دستار کا نظم ہوا بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں مولانا فخر الدین گنگوہی اور مولانا محمد جان پنجابی قاضی ریاست ٹونک کے سروں پر اپنے ہاتھوں سے دستار باندھی، پھر اس تقریب کے فوراً بعد آپ گنگوہ واپس ہو گئے۔

باب ۱۲

شیخ الحدیث بھی اور مصلح اُمت بھی

تیسرے حج سے واپسی کے بعد آپ نے تدریسی نظام میں تبدیلی فرمائی، اس سے پہلے آپ مختلف فنون کی کتابیں طلبہ کو پڑھاتے تھے، فقہ، اصول فقہ، تفسیر وحدیث بھی۔ یونانی منطق و فلسفہ سے آپ کو نفرت تھی، اسکی تدریس آپ کو پسند نہیں تھی اور آپ چاہتے تھے کہ منطق و فلسفہ کی یہ کتابیں نصاب سے نکال دی جائیں، مدارس اسلامیہ میں منطق و فلسفہ کی جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں یا بہت سے لوگ جو خیر آبادی اسکول سے وابستہ تھے ان کی ساری توجہ اسی منطق و فلسفہ پر تھی، دہلی، رام پور، ٹونک وغیرہ میں منطق و فلسفہ کی کتابیں بڑی دھوم دھام سے پڑھائی جاتی تھیں، حضرت گنگوہی ان دونوں فنون کو لغو، بیکار بلکہ مضر اور ناپسند فرماتے تھے اور دل سے یہ چاہتے تھے کہ ان دونوں فنون کی کتابیں نصاب سے نکال دی جائیں، آپ دار العلوم دیوبند کے جب سرپرست بنائے گئے تو آپ نے دفتر تعلیمات سے کہا تھا کہ منطق و فلسفہ کی ساری کتابوں کو نصاب سے نکال دیا جائے اس حکم کی تعمیل میں دار العلوم سے کچھ دنوں کے لیے یہ کتابیں نکال دی گئیں، لیکن کچھ ہی زمانے کے بعد لوگوں نے عملاً اس فیصلہ کو بدل دیا کچھ مصلحتوں کے پیش نظر پھر وہ ساری کتابیں داخل درس ہوگئیں جو پہلے پڑھائی جاتی تھیں، آپ نے اس سلسلہ میں پھر باز پرس نہیں فرمائی لیکن خود گنگوہ میں آپ نے ایک عرصہ تک مختلف علوم وفنون کی تدریس جاری رکھی

تھی مگر کبھی بھی منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھنے والے طلبہ کو اپنے یہاں نہیں رکھا اور نہ خود یہ کتابیں پڑھائیں، ۱۳۰۰ھ کے بعد تو سوائے حدیث کے دوسرے علوم و فنون کی تعلیم بالکل بند کردی صرف صحاح ستہ کی تعلیم آپ دیتے تھے اور اتنی پابندی سے یہ اسباق پورے سال جاری رہتے تھے کہ سال بھر میں تنہا ساری کتابیں آپ ختم کرا دیتے تھے۔

آج مدارس کے نظام تعلیم کو دیکھ کر یقین نہیں ہوتا کہ ایک شخص صحاح ستہ کو ایک سال میں ختم کرادے گا لیکن یہ سچائی ہے اور جب تک آنکھوں کی روشنی قائم رہی اس معمول میں کبھی تخلف نہیں ہوا اور نہ کبھی ایسا ہوا کہ کوئی کتاب ختم ہونے سے رہ گئی، یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ درس سرسری اور رواروی میں نہیں ہوتا تھا، بلکہ پوری تحقیق کے ساتھ حدیث کا درس ہوتا تھا، سوال و جواب بھی ہوتا تھا، اعتراض اور شک و شبہ کو بھی تفصیلی بحث کے ذریعہ دور کیا جاتا تھا، اس کے ثبوت میں وہ تمام امالی پیش کی جاسکتی ہیں جو آپ کے تلامذہ دوران تقریر نوٹ کرتے تھے، خاص طور سے آپ کے دو شاگردان رشید مولانا ماجد جونپوری اور مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی نے بخاری شریف اور ترمذی شریف کی تقریریں قلم بند کی تھیں، ان میں سے مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کی ضبط کردہ تقریریں لامع الدراری اور الکوکب الدری کے نام سے شائع ہوچکی ہیں، مولانا ماجد جونپوری کی لکھی ہوئی تقریریں ان کے ورثاء کے پاس موجود ہوں گی جو تاہنوز شائع نہیں ہوئی ہیں، ان کتابوں کو آج وہ لوگ جو شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہیں اپنے مطالعہ میں رکھتے ہیں اور جہاں جہاں ان کا ذہن و مطالعہ عقدہ کشائی نہیں کرتا یہ کتابیں کلید مقصد بنتی ہیں۔

حضرت گنگوہی کے درس میں شریک ہونے والوں کی تعداد بتدریج بڑھتی چلی گئی، حضرت گنگوہی کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ دورہ حدیث میں

کبھی کبھی پچاس طلبہ ہوتے تھے جو ملک کے مختلف خطوں کے ہوتے تھے بلکہ بعض دوسرے ملکوں کے بھی طلبہ درس حدیث میں شریک رہتے تھے۔

درس حدیث کا سلسلہ بند ہوا

حضرت گنگوہی کے یہاں دورۂ حدیث کا یہ سلسلہ ۱۳۱۴ھ تک مسلسل رہا اور سیکڑوں علماء نے صحاح ستہ پڑھ کر حضرت گنگوہی سے سند حدیث حاصل کی جو آپ کے یہاں مطبوعہ تھی، جس میں نام کی جگہ خالی رہتی تھی آپ اس سند پر دستخط فرما کر مہر لگا دیتے تھے۔

۱۳۱۴ھ درس حدیث کا آخری سال تھا کیوں کہ اسی سال آپ کو ضعف بصارت کا مرض لاحق ہوا اور اتنی تیزی سے آنکھوں کی روشنی کم ہوتی جا رہی تھی کہ اندیشہ تھا کہ امسال دورۂ حدیث کی تکمیل نہ ہو سکے گی، اس لیے آپ نے بعجلت تمام، تمام کتابوں کو ختم کرایا، اگلے سال آنکھوں کی روشنی رخصت ہو گئی پھر پورے دس سال آپ نے نابینا ہونے کی حالت میں گذارے اور درس حدیث کا مبارک سلسلہ ان دس سالوں میں بند رہا۔

درس کے علاوہ دوسری مصروفیات

۱۳۰۰ھ کے سال سے جس طرح طلبہ حدیث کا رجوع بڑھا اسی طرح آپ کے پاس مختلف فیہ مسائل کے سلسلہ میں استفتاء و سوالات کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا، اس کے علاوہ آپ سے بیعت ہونے والے طالبین سلوک مختلف شہروں میں رہتے تھے اس لیے ان کے خطوط کا انبار بڑھنے لگا فرداً فرداً ہر ایک کو جواب دینا ان کو تلقین اور ہدایت دینا ایک مستقل مصروفیت تھی، استفتاء کا مدلل جواب لکھنا خود ایک بڑا کام تھا، اس لیے آپ نے تقسیم اوقات کر رکھی تھی اور پورے نظم سے ہر کام انجام دیتے تھے۔

معمول یہ تھا کہ خطوط کے جوابات روزانہ اسی دن دیے جائیں جس دن خط موصول ہوا ہے، فتاوی کے سلسلہ میں بھی حتی الامکان عجلت کی جاتی تھی اس لیے روزانہ ایک معینہ وقت تک تحریری کام جاری رہتا تھا، اسمیں تخلف نہیں ہوتا تھا، خطوط کے جوابات اور فتاوی آپ ہمیشہ خود تحریر فرماتے تھے کسی دوسرے سے مدد نہیں لیتے تھے۔

براہین قاطعہ کا قضیہ

مولوی عبدالسمیع رامپوری جو حضرت گنگوہی کے جدی وطن رامپور منہاران کے رہنے والے تھے انھوں نے تعلیم دہلی میں حاصل کی تھی، شاعر بھی تھے بیدل تخلص تھا، مرزا غالب کے شاگردوں میں تھے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکی سے بیعت تھے اور شاید خلیفہ بھی عقیدہ و مسلک کے معاملہ میں علماء بدایوں و بریلی کے ہم خیال تھے، انھوں نے میلاد، قیام، فاتحہ، عرس، نذر و نیاز، تیجہ، چہلم اور دیگر مروجہ رسم ورواج کے جواز اور حمایت میں ایک کتاب "انوار ساطعہ" کے نام سے لکھی اور ان تمام مراسم مشرکانہ، رسم ورواج، بدعات و خرافات کے لیے شرعی دلائل فراہم کیے اور اُن کو دین و شریعت کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی۔

اب تک اہل بدعت اپنے آباء و اجداد کے نقش قدم پر چل کر ان بدعتوں میں مبتلا تھے اور ثواب کا کام سمجھ کر کرتے تھے، عوام کو یہ معلوم نہیں تھا کہ شرع میں ان رسم ورواج اور بدعات کی کیا حیثیت ہے؟ اس لیے جب علماء حق ان کو سمجھاتے تھے کہ جو کام تم ثواب سمجھ کر کر رہے ہو وہ خلاف شریعت ہے اور ثواب کے بجائے اُلٹے گناہ ہوتا ہے، ان کا دل اگر علماء حق کی باتوں کو قبول کر لیتا تھا تو وہ ان بدعات و خرافات سے باز

آجاتے تھے اور ترک کر کے سچے مسلمان بن جاتے تھے، مولوی عبدالسمیع رام پوری نے انوار ساطعہ لکھ کر عوام کو بدعات و مشرکانہ عقائد پر جمے رہنے کا حوصلہ دیا اب وہ ہر رسم و رواج حتی کی رافضیوں کے مشرکانہ عقائد کے نفوذ کی ان کی دل میں راہیں کھول دیں، انھوں نے کتاب لکھی اور طبع کرا کے ہر طرف پھیلانی شروع کر دی۔

حضرت گنگوہی پر کتاب کا ردعمل

اس کتاب کے بارے میں جب حضرت گنگوہی کو خبر ہوئی تو آپ پر اس کا رد عمل بہت سخت ہوا اور دل کو شدید چوٹ پہونچی کہ آدھی صدی سے جن بدعات و خرافات کے خلاف جہاد کیا جارہا تھا یہ کتاب اُن گمراہیوں اور بد عقیدگیوں کو سند جواز فراہم کر رہی ہے، ذہنی و روحانی اتنی شدید اذیت پہونچی کہ آپ نے اپنے خلیفہ مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری (۱) کو اس کا جواب لکھنے کی ہدایت فرمائی، کہا یہ جاتا ہے

---

(۱) مولانا خلیل احمد سہارنپوری مشہور محدث جلیل القدر عالم، بہترین مناظر رد بدعت اور رد شیعیت میں متشدد تھے آپ انبیٹھہ ضلع سہارنپور میں ۱۲۶۹ھ - ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے اپنے دور کے ممتاز ترین علماء میں انکا شمار تھا صحاح ستہ کی مشہور کتاب ابو داؤد کی بہت مبسوط شرح بذل المجہود کے نام سے عربی میں لکھی جو فارسی رسم الخط میں بڑے سائز کی پانچ ضخیم جلدوں میں ہے اگر بیروت کے معیار پر شائع کیا جائے تو پندرہ جلدوں میں آئے گی، رد بدعت میں براہین قاطعہ آپ کی مشہور ترین کتاب ہے رضاخانی جماعت کے امام نے جب حسام الحرمین شائع کی تو علماء حجاز کی طرف سے علماء دیوبند کے نام ایک مفصل سوال نامہ آیا جس میں علماء دیوبند کے بارے میں سوال کیا گیا، آپ ہی نے اس کا مفصل جواب لکھ کر علماء حجاز کو مطمئن کیا، آپ ریاست بھاولپور اور بریلی میں استاد رہے، پھر دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہند کے نائب رہے اور دارالعلوم میں درس دیتے رہے آخر میں حضرت گنگوہی کے مشورے سے مظاہر علوم سہارنپور کے شیخ الحدیث ہوئے جب تک ہندوستان میں رہے آپ اسی منصب پر رہے پھر آپ نے مدینہ منورہ ہجرت کی مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث آپ کے جاں نثار شاگردوں میں تھے اور بذل المجہود کی تصنیف کی تکمیل تک آپ کے معاون بن کر رہے حضرت گنگوہی کے خلیفہ تھے آپ سے بیعت ہونے والوں کی تعداد بھی کافی ہے زندگی کے آخری ایام مدینہ منورہ کی پاکیزہ فضا میں گذرے یہیں ۱۳۴۶ھ - ۱۹۲۷ء میں وفات پائی، اسی مقدس سرزمین میں دفن ہونے کی سعادت پائی۔ (کاروان رفتہ)

کہ خود آپ نے یہ کتاب تحریر فرمائی اور حضرت سہارنپوری کے نام سے شائع ہوئی، مگر یہ بات کلی طور پر صحیح نہیں ہے دونوں بزرگوں کی تحریروں میں بہت ہی امتیازی فرق ہے، لب ولہجہ انداز بیان دونوں کے مختلف ہیں اس لیے کتاب کے مصنف مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری ہیں البتہ ہدایات، مشورے، بہت سے مضامین ومسائل حضرت گنگوہی کے ہو سکتے ہیں سب سے بڑی سند خود اس کتاب پر حضرت گنگوہی کی تقریظ ہے جس میں کتاب کو مولانا خلیل احمد صاحب کی تصنیف کہا گیا ہے۔

براہین قاطعہ کی اشاعت پر اظہار خوشی

حضرت گنگوہی نے اس کتاب کے شائع ہونے پر خوشی کا اظہار فرمایا کیوں کہ کتاب اس مشن کی ترجمانی کرتی ہے جو ہمیشہ سے آپ کے پیش نظر رہا ہے حضرت گنگوہی مولانا خلیل احمد صاحب کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

> "براہین (قاطعہ) طبع ہو چکی ہے، فروخت شروع ہو گئی ہے آٹھ آنے قیمت قرار دی گئی ہے، سترہ جزء ہوئے، حاشیہ پر انوار ساطعہ ہے، برابر فروخت ہو رہی ہے، ایک نسخہ عرب کو بھی مولوی محمود حسن (شیخ الہند) سے روانہ کر دیا ہے، دیکھیے وہاں کیا رنگ لائے۔"(۱)

مصنف انوار ساطعہ مولوی عبدالسمیع صاحب رام پوری چوں کہ حضرت حاجی امداد اللہ تھانویؒ سے بیعت تھے اور ان کے خلیفہ مجاز بھی اس لیے حضرت گنگوہی کو پیر بھائی سمجھتے تھے، ان کی رشتہ داریاں گنگوہ میں ہیں اس لیے وہ گنگوہ آتے جاتے رہتے تھے اور حضرت گنگوہی سے بھی ملنے آتے تھے، براہین قاطعہ کے شائع ہونے کے بعد خیال تھا کہ اب وہ گنگوہ آئیں گے تو شاید حضرت گنگوہی کی خدمت میں نہ حاضر ہوں

---

(۱) مکاتیب رشیدیہ مکتوب: ۴۸، ص: ۶۳

اور نہ ملاقات کریں مگر ایسا نہیں ہوا، حالانکہ یہ قلمی جنگ بڑی ہنگامہ خیز ہو چکی تھی اور ہر طرف اس کے چرچے تھے، مولوی عبدالسمیع کے سامنے بھی یہ تمام صورت حال تھی لیکن جب وہ گنگوہ آئے تو حسب معمول حضرت گنگوہی سے ملنے آئے، یہ حیرت کی بات تھی، حضرت گنگوہی نے اپنے ایک خط میں جو مولوی سید کوثر علی مہاجر مکی کو لکھا ہے اس میں تحریر فرمایا:

"پرسوں مولوی عبدالسمیع گنگوہ آئے تھے، مجھ سے ملے، مگر کوئی عذر معذرت نہیں کیا، مصافحہ وسلام، بات ہوئی جیسے پہلے ہوتی تھی، مجھ سے تو ملے مگر نہ معلوم حکیم صاحب (حکیم ضیاء الدین رامپوری) سے رامپور میں ملے یا نہیں؟ خود بندہ نے اس امر کو ذکر نہیں کیا نہ انھوں نے کچھ کہا چونکہ وہ میرے پاس بقدر ایک گھڑی کے بیٹھے تھے پھر وہ جہاں پہلے اپنے رشتہ داروں میں آتے اور ٹھہرتے تھے وہیں رہے زیادہ نوبت کلام کی نہیں آئی" (۱)

براہین قاطعہ کا لب ولہجہ قدرے سخت ہے اس لیے حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی کا وہ حلقہ جو ان افعال واعمال کو جزو ایمان سمجھتا ہے وہ برہم ہوا ان کے دلوں میں عداوت کی آگ بھڑک اٹھی، مولوی عبدالسمیع صاحب رامپوری بھی پھونک مار کر اس آگ کو اور دہکانے کی کوشش کرتے رہے، یہ بات مکہ مکرمہ اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی تک پہونچانے کی بھی انھوں نے سبیل نکالی تاکہ حضرت گنگوہی کی طرف سے حضرت حاجی صاحب کو بدگمان کردیا جائے، کچھ لوگ سفر حج میں اس کتاب کو دے کر بھیجے گئے کہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں پیش کرکے ان کے خلاف حضرت حاجی صاحب کے دل کو میلا کردیا جائے، حضرت گنگوہی بھی ان ریشہ دوانیوں سے کچھ کچھ

(۱) مکاتب رشیدیہ خط: ۵۳، ص: ۷۰

واقف تھے، آپ حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے اور اپنے لوگوں سے اس کے بارے میں استفسار کرتے رہتے تھے، مولوی سید کوثر علی مہاجر مکی کو آپ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"نہ یہ حال معلوم ہوا کہ تم پر کیا گذری اور نہ براہین کے ردو قبول کا دریافت ہوا، افسوس یہ ہے کہ مولوی رحمتہ اللہ صاحب (کیرانوی (۱) مہاجر مکی) کی نظر جاتی رہی ورنہ ان سے توقع تھی کہ بغور مطالعہ فرما کر جس امر پر مواخذہ فرماتے یا قبول فرماتے اطلاع ہو جاتی کیوں کہ رسوم و بدعات کے باب میں و مجلس مولود کے باب میں جو کچھ مولوی خلیل احمد سلمہٗ نے براہین میں لکھا ہے وہی عقیدہ بندے کا ہے اور سب ہماری جماعت کا اور جو کچھ انوار ساطعہ میں عبدالسمیع نے لکھا ہے وہ افراط و تفریط سے مملو ہے کہ حد سے بڑھ گیا ہے، مولوی رحمت اللہ صاحب سے محاکمہ ہو جاتا کہ وہ عالم بھی ہیں مگر یہ امر تقدیر سے پیش آیا، یہ جانتا ہوں کہ تم کو فرصت نہیں، خصوصاً موسم حج میں، سو اگر بعد موسم حج کے تم سے ہو سکے اور مولوی صاحب بھی قبول فرمالیویں تو ساری انوار ساطعہ اور براہین قاطعہ ان کو بتدریج سنا کر جس جس موقع کو وہ ردو قبول سے مدلل فرمادیویں تو کیا عمدہ ہو جاوے، ورنہ خیر جو کچھ ہوا، سو ہوا اور جو کچھ ہوئے گا، سو

---

(۱) مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ مہاجر مکی ایک رئیس اور جاگیر دار گھرانے کے فرد تھے اور جید عالم تھے مدرسہ حیات دہلی میں تعلیم حاصل کی، مفتی سعد اللہ مراد آبادی سے بھی تلمذ حاصل تھا، ۱۸۵۴ء میں مشہور عیسائی پادری فنڈر سے آگرہ میں مناظرہ کر کے اس کو ذلت آمیز شکست دی، پادری فنڈر کی شکست سے انگریزی حکومت تلملا کر رہ گئی، اتفاق سے تیسرے سال ۱۸۵۷ء کا ہولناک حادثہ ہو گیا حکومت کو انتقام کا موقع مل گیا اور مولانا کیرانوی کو گرفتار کر کے پھانسی کے تختے پر چڑھانے کا تہیہ کر لیا وارنٹ جاری ہوا لیکن آپ نام بدل کر خفیہ طور سے ہندوستان سے نکل کر مکہ مکرمہ جا چکے تھے، حکومت ہاتھ مل کر رہ گئی، مکہ مکرمہ کا مشہور مدرسہ صولتیہ آپ ہی کا قائم کیا ہوا ہے، رد عیسائیت میں ان کی آدھی درجن کتابیں ہیں، آخری عمر میں آپ نابینا ہو گئے تھے مکہ مکرمہ میں ۲۳ رمضان ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء میں وفات پائی اور جوار ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا میں دفن ہونے کی سعادت پائی (کاروان رفتہ مولفہ اسیر ادروی ص ۹۸)

ہوے گا بندہ کو تو اس کی پروا نہیں کہ خلق برا کہے مگر اس امر مخالفت کا ہونا البتہ برا معلوم ہوتا ہے، اب عبد السمیع کی مخالفت بہت بڑھ گئی اور یہ عہد باہم سب مبتدعین کے ہو گیا ہے کہ خواہ کوئی کچھ کہے رشید احمد کے نام سے سب و شتم کرو، ایک شخص نے بمبئی سے لکھا ہے سو واللہ اس کا کچھ اندیشہ نہیں کرتا ہوں مگر اس کی مخالفت کا بیان کرنا ہے کہ رات دن اسی فکر میں رہتا ہے اور پورب دکھن بنگالہ پنجاب جہاں جہاں مبتدعین ہیں ان سے مکاتبت و طرح طرح کے قصے کھڑا کرتا ہے (۱)

حاجی امداد اللہ تھانوی کو بدگمان کرنے کی کوشش

مبتدعین کے اس پروپگنڈہ کا سب سے اذیت ناک پہلو یہ تھا کہ حضرت گنگوہی کے خلاف پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے کان چھوٹی چھوٹی اور بے بنیاد باتوں سے بھرے جاتے تھے اور غلط فہمی اور سوء ظنی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، اسی مقصد سے مولوی عبد اللہ انبیٹھوی مکہ مکرمہ گئے تھے حضرت حاجی صاحب کے یہاں مستقل قیام پذیر تھے، اور جب بھی موقع ملتا حضرت گنگوہی کے خلاف چند جملے حاجی صاحب کے کان میں ڈال دیتے، موسم حج گذر جانے کے بعد بھی وہ محض اسی نیت سے حاجی صاحب کی خدمت میں رہ پڑے تھے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

براہین قاطعہ تو مولانا خلیل احمد صاحب نے لکھی تھی لیکن مبتدعین اپنی مصلحتوں سے یہ پروپگنڈہ کرتے تھے کہ یہ کتاب مولانا گنگوہی کی تصنیف ہے مولانا خلیل احمد صاحب کو آڑ بنایا گیا ہے اسی پہلو سے وہ حاجی

---

(۱) مکاتب رشیدیہ مرتبہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مکتوب ۵۵، ص: ۷۲

صاحب کو بدظنی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے تھے، حقیقت کیا ہے؟ سچائی یہ ہے کہ براہین قاطعہ حضرت گنگوہی کے ایماء ہی سے نہیں بلکہ ان کے مشوروں اور ہدایتوں اور رہنمائیوں کی روشنی میں لکھی گئی لیکن تصنیف حرفاً حرفاً مولانا خلیل احمد صاحب کی ہے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پوری کتاب حضرت گنگوہی کے قلم سے ہے اور مصلحتاً مولانا خلیل احمد صاحب کے نام سے شائع کی گئی ہے یہ قطعاً غلط اور جھوٹا پروپگنڈہ ہے حضرت گنگوہی کے متعدد خطوط اس کی شہادت کے لیے موجود ہیں اور پھر جس مصلحت کا یہاں دخل بتایا جاتا ہے حضرت گنگوہی کے ذہن وخیال میں دور دور اس کا گذر نہیں ہو سکتا، اسلام کی صاف ستھری سیدھی راہ کو بدعات وخرافات اور مشرکانہ عقائد اور رسم ورواج کے خس وخاشاک سے پاک صاف رکھنا آپ کی پوری زندگی کا مشن رہا ہے پھر اس میں مصلحت اندیشی کا گذر ہی کہاں ہے، حضرت گنگوہی کے مزاج کے بالکل خلاف ہے، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کو کتاب مرتب کرنے کے لیے منتخب کرنا ان کے تجربات ومشاہدات اور جذبات کے لحاظ سے موزوں تھا اس لیے خصوصیت سے ان کو لکھنے کا مشورہ دیا گیا، مولانا خلیل احمد صاحب مبتدعین کی سازشوں کا شکار رہ چکے تھے، ان کے دین ودیانت سے خوب واقف تھے، بھاولپور میں آپ کی راہوں میں کانٹے بچھائے گئے ان کے خلاف نواب بھاولپور کو ورغلا کر ان کو سزا دلانے کی شب وروز کوشش کرتے رہے حتی کہ توپ سے اڑا دینے کی افواہ پھیلاتے رہے، اسی خطرناک ماحول میں مبتدعین سے بحث ومباحثہ اور مناظرے کیے۔ ان واقعات کا آپ پر ردعمل ہونا ضروری تھا اور وہ ہوا، یہی وجہ ہے کہ براہین قاطعہ کا لب ولہجہ کافی گرم ہے، حضرت گنگوہی ان حالات اور اس ماحول سے دور تھے پھر دونوں کے انداز بیان میں جو فرق ہے وہ بھی غمازی کرتا

ہے کہ یہ کسی نوجوان عالم کے قلم کی رہین منت ہے ان اسباب کی وجہ سے قطعیت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ حضرت گنگوہی کا نہیں مولانا خلیل احمد سہارنپوری کا زور قلم ہے۔

حضرت گنگوہی کا خط

مولوی عبداللہ انبیٹھوی کو جس مقصد سے مولوی عبدالسمیع نے مکہ مکرمہ بھیجا تھا وہ حج نہیں تھا بلکہ حضرت گنگوہی کے خلاف سازش کرنی تھی اس صورت حال پر حضرت گنگوہی کے ایک خط سے روشنی پڑتی ہے جو آپ نے مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کو تحریر فرمایا ہے:

"مولوی عبداللہ صاحب نے حضرت (حاجی امداداللہ تھانوی) کے کان اس بات سے بھرے کہ رشید احمد اور سب دیوبند والے یہ کہتے ہیں کہ جو حضرت سے مل کر آتا ہے گمراہ ہو جاتا ہے اور یہ سب اشغال بدعات وضلالت ہیں اور انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو غیر مقلد اور مفسد قرار دیا مگر یہ سب امور خلوت اور پردے میں ہوئے جس سے حضرت کی طبع سب کی طرف سے برہم ہوئی، اس میں حافظ احمد حسین نے بہت کچھ مجادلہ کیا اور صفائی کی فکر میں رہے اور مولوی عبداللہ کو کلام ناگفتن حضرت کی روبرو کہے کہ سب وشتم تک نوبت آئی اور انوار ساطعہ کی تصدیق وتوثیق کرادی اور خلیل الرحمٰن رڑکوی نومسلم اور بعض دیگر مبتدعین وہاں موجود تھے سب یک زبان تھے مگر در آخر جب یہ زور شور حافظ احمد حسین کا ہوا اور انھوں نے مولوی منفعت علی کو بتاکید کلام کرنے پر آمادہ کیا کہ کلام کرائی اور مولوی کوثر علی نے بھی بہت سختی سے کلام کی تو حضرت نرم ہوئے اور ایک خط جو بنام بندہ تھا جو باعث فتنہ ہوتا اور اس کی نقلیں کرانے کا حکم ہوا تھا اس میں سے کچھ فقرے کاٹے گئے خلاصہ

یہ کہ بندہ اور بندہ کے احباب بے راہ اور معتوب اور مولوی عبد اللہ و عبد السمیع اور ان کے احباب اہل حق بتائے گئے اور ہند میں اشتہار طبع ہو گئے کہ حضرت حاجی صاحب بھی ہم کو مقبول فرماتے ہیں مگر بندہ کے نام جو خط حضرت کا آیا اس میں کچھ بھی اشارہ کسی امر کا نہیں، شاید وہ خط ذی نقول از بس آوے یا حکم فسخ ہو گیا ہو آخر کے خط سے حال معلوم ہو گا، مولوی عبد اللہ سال بھر رہنے کا قصد کرتے ہیں اور اس شہرت بے جا سے جو ہند میں ہوئی اور ہو ویگی اس عاجز کی دنیا میں نہ تفاوت ہوا اور دین تو جزماً بڑھا کہ غیبت سے کچھ مل ہی رہا، غرض محسود کوئی ضرر نہیں ہوا اور حاسد صاحب کے دو سو چار سو مخالف ہو گئے اور حضرت کو ان کی بدولت یہ ثمرہ ملا کہ مخلص خادم مستفیدین غیر معتقد ہو کر منحرف ہو گئے، یہ افسوس ہوتا ہے مگر رضا بالقضا کے سوا چارہ نہیں"۔(۱)

جہاد جاری رہے گا

براہین قاطعہ کی اشاعت کے بعد اہل بدعت میں کھلبلی مچ گئی اور سب سے خطرناک کوشش ان کی طرف سے یہ ہوئی کہ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی کو ان لوگوں کی طرف سے بدگمان کرا دیا جائے جو اُن سے بیعت ہیں یا ان کے خلفاء ہیں اور ان کو حاجی صاحب سے سرزنش کرائی جائے اور اہل دیوبند کو معتوب بنا دیا جائے اور پوری کوشش کی کہ حاجی صاحب کی اہل دیوبند کے خلاف کوئی تحریر مل جائے تو ہندوستان میں ان کے خلاف محاذ آرائی میں سہولت ہو گی، مولوی عبد السمیع مصنف انوار ساطعہ بھی حاجی صاحب کے خلیفہ تھے اس لیے ان کو بھی حاجی صاحب سے قربت حاصل تھی۔ اس لیے ان کے ہم نواؤں کی بات بھی حاجی

(۱) مکاتیب رشیدیہ از مولانا میرٹھی مکتوب ۸،۴، ص: ۶۳-۶۴

صاحب بہت توجہ سے سنتے تھے ان کے لیے بھی حاجی صاحب کے دل میں نرم گوشہ تھا پھر براہین قاطعہ کے سخت لب ولہجہ کی بھی شکایت تھی لیکن مسئلہ شریعت کے احکام کا تھا اس میں مداہنت جائز نہیں تھی اس لیے ان تمام سازشوں اور ہنگامہ آرائیوں کے باوجود اہل حق کے پائے ثبات میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوئی اور یہ عزم مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا کہ بدعات وخرافات اور مشرکانہ عقائد کے خلاف جس جہاد کا آغاز ہوا ہے وہ مستقبل میں بھی جاری رہے گا حضرت گنگوہی اپنے خلیفہ مولانا صدیق احمد امبیٹھوی کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"عبدالسمیع گنگوہ بہ تقریب فاتحہ عبدالکریم کے آئے تھے بندہ سے بہ لطف ملے، ایک وقت ان کی ضیافت بھی کی پھر چلے گئے، انوار ساطعہ مہذب ہو کر طبع ہوگئی قریب اس کی اشاعت ہوگی اگر اس میں جواب براہین کا ہوگا تو اس کا بھی رد کیا جائے گا، صلح شکنی ہوویگی اور بوقت ملاقات کسی قسم کا ذکر نہیں کیا نہ عذر نہ معذرت، بندہ نے بھی سکوت کیا۔"(۱)

فیصلہ ہفت مسئلہ

حضرت گنگوہی کے شیخ ومرشد حاجی امداد اللہ تھانوی اپنے منتسبین میں اس اختلاف کو دیکھ کر مضطرب ہوئے اور چاہا کہ صلح صفائی ہو جائے، مولوی عبدالسمیع رامپوری مصنف انوار ساطعہ اور ان کے ہم مشربوں نے حضرت حاجی صاحب کو مجبور کیا کہ ان مسائل میں آپ اپنی رائے کا اظہار فرمادیں اور کوئی تحریر عنایت فرمائیں تو بہتر ہوگا، انھیں کی طلب اور تقاضے سے مجبور ہو کر حضرت حاجی صاحب نے فیصلہ ہفت مسئلہ تحریر فرمایا اور اس کو شائع کر دیا گیا۔

---

(۱) مکاتیب رشیدیہ مکتوب ۳۶، ص: ۵۰

یہ چند ورقہ تحریر اس زمانے میں ہر طرف پھیل گئی، اس تحریر میں زیادہ سے زیادہ زور اتحاد باہمی اور رواداری پر دیا گیا، لیکن مولوی عبدالسمیع اور ان کے ہم نواؤں نے اُسے اپنے مسلک کی تائید سمجھی اور اس کی خوب تشہیر کی۔

حضرت حاجی صاحب عالی مرتبت بزرگ ضرور تھے لیکن نہ فقیہ تھے نہ محدث اس کے باوجود اس دور کے ذہین ترین علماء نے ان کو اپنا شیخ و مرشد بنایا اور غایت عقیدت وارادت کا معاملہ کرتے رہے اور نیاز مندانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے، لیکن یہ نیاز مندی اور اظہار عقیدت مرشد کے زہد و تقویٰ اور کمالات ولایت کی وجہ سے تھا، شریعت کے تقاضوں سے چشم پوشی یا اغماض ان حضرات کے حاشیۂ خیال میں بھی ممکن نہ تھی، اس لیے جہاں اظہار صداقت اور شریعت کے تقاضے مجبور کرتے تھے اس کا برملا اظہار فرماتے تھے، کہا جاتا ہے کہ مبتدعین کے بعض رسوم کے لیے حضرت حاجی صاحب کے دل میں نرم گوشہ تھا، وہ چشتیہ سلسلے کے بزرگ تھے جن کے نزدیک کچھ شرائط کے ساتھ سماع جائز ہے، ان تمام حقائق کے باوجود یہ کتنی حیرتناک بات ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے خلفاء ہی عہد اسلامی سے جاری بدعات و خرافات اور مشرکانہ رسوم اور رافضیت کے خلاف سب سے طاقتور تحریک اور ان کے خلاف معرکۂ جہاد میں سب سے پیش پیش تھے، اس معاملہ میں نہ ان کے سامنے کوئی دنیاوی مصلحت حائل ہوتی رہی اور نہ مخالفین کا سب و شتم ان کا راستہ روک سکتا تھا، رد بدعت میں ان حضرات کے سخت اور بے لچک رویہ سے پورا ہندوستان واقف تھا، اس راہ میں انھوں نے بڑی ذہنی اذیتیں اٹھائیں اور نصف صدی تک ان حضرات پر اہل بدعت کی یلغار برابر جاری رہی اور اگر بس چلتا تو راہ سے بھٹکے ہوئے

لوگ اور بدعتوں میں مبتلا جماعت ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی، حضرت گنگوہی حضرت تھانوی حضرت نانوتوی حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، حضرت شیخ الہند، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے بزرگوں نے بدعات کے خلاف نہ ختم ہونے والا جہاد چھیڑ رکھا تھا یہ سب کے سب حضرات حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے وابستہ تھے اور ہمیشہ ان کی خدمت میں نیاز مندانہ حاضر ہوتے رہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب نے اصل مسئلہ پر شرعی نقطہ نگاہ اور حدیث و قرآن سے استدلال کے بجائے اس مسئلہ پر سادہ طریقہ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جو حضرت گنگوہی اور مولوی عبد السمیع رامپوری اور ان کے ہم نواؤں کے درمیان موضوع بحث تھا اس چند ورقہ تحریر میں سات مختلف فیہ مسئلوں میں حاجی صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

فیصلہ ہفت مسئلہ میں کیا ہے؟

حضرت حاجی صاحب نے جس مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ تحریر مرتب فرمائی ہے اس کی وضاحت ابتدا ہی میں کر دی ہے وہ تحریر فرماتے ہیں:

"آج کل بعض مسائل فرعیہ میں ایسا اختلاف واقع ہوا ہے جس سے طرح طرح کے شر اور دقتیں پیدا ہو رہی ہیں اور خواص کا وقت اور عوام کا دین ضائع ہو رہا ہے، حالانکہ اکثر امور نزاع لفظی ہے اور مقصود متحد، چوں کہ عموماً مسلمانوں کی اور خصوصاً اپنے تعلق والوں کی یہ حالت دیکھ کر بہت صدمہ ہوتا ہے اس لیے فقیر کے دل میں آیا کہ مسائل مذکورہ کے متعلق مختصر سا مضمون قلمبند کر کے شائع کر دیا جائے، امید قوی ہے کہ یہ نزاع وجدال رفع ہو جائے۔"(۱)

(۱) فیصلہ ہفت مسئلہ از حاجی امداد اللہ تھانوی شائع کردہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند، ص: ۴۷

مجلس میلاد

اس کتابچہ میں سب سے پہلا مسئلہ میلاد کا اٹھایا گیا ہے، اہل بدعت جن باتوں پر اصرار کرتے ہیں اور علماء حق جن اجزاء ترکیبی کو موجب فساد عقیدہ کہتے ہیں اس کے تمام جزوں پر محاکمہ کیا گیا ہے مثلاً میلاد میں قیام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مجالس میلاد میں حاضر ہونے کا عقیدہ وخیال، اس تحریر میں حاجی صاحب نے اس فعل کو غیر مستحسن تحریر کیا ہے نہ اس کو خلاف شرع، بلکہ اس کی توجیہ وتاویل میں کہا گیا ہے کہ:

"جیسے بعض اعمال میں تخصیص ہوا کرتی ہے کہ ان کی رعایت نہ کرنے سے وہ اثر خاص مرتب نہیں ہوتا مثلاً بعض عمل کھڑے ہو کر پڑھے جاتے ہیں اگر بیٹھ کر پڑھیں تو وہ اثر خاص نہ ہوگا، اس اعتبار سے اس قیام کو ضروری سمجھتا ہے اور دلیل اس توقف کی موجدان اعمال کا تجربہ یا کشف والہام ہے"(۱)

محفل میلاد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رونق افروز ہونے کے سلسلہ میں فیصلہ ہفت مسئلہ میں اس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے:

"رہا یہ اعتقاد کہ مجلس مولود میں حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہوتے ہیں، اس اعتقاد کو کفر وشرک کہنا حد سے بڑھنا ہے کیونکہ یہ امر ممکن عقلاً ونقلاً بلکہ بعض مقامات پر اس کا وقوع بھی ہوتا ہے، رہا یہ شبہ کہ آپ کو کیسے علم ہوا یا کئی جگہ کیسے بیک وقت تشریف فرما ہوئے؟ یہ ضعیف شبہ ہے آپ کے علم اور روحانیت کی وسعت جو دلائل نقلیہ وکشفیہ سے ثابت ہے اس کے آگے یہ ادنیٰ سی بات ہے علاوہ اس کے اللہ کی قدرت تو محل کلام نہیں اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اپنی جگہ تشریف رکھیں اور درمیانی حجاب اٹھ

---

(۱) فیصلہ ہفت مسئلہ ص ۳

جاویں، بہر حال ہر طرح یہ امر ممکن ہے، اس سے آپ کی نسبت اعتقاد علم غیب لازم نہیں آتا جو خصائص ذات حق ہے" (۱)

فاتحہ مروجہ پر اظہار خیال

میلاد اور قیام کے مسئلہ کے بعد اہمیت کے لحاظ سے فاتحہ مروجہ کو دوسرے درجہ پر رکھا گیا ہے ایک فریق جملہ لوازمات اور پابندیوں کے ساتھ اس کے ادا کرنے پر مصر ہے دوسرا فریق اس کو دین میں نئی ایجاد سے تعبیر کرتا ہے جس کو عام اصطلاح میں بدعت کہا جاتا ہے، اس تحریر میں فاتحہ مروجہ کی ہیئت کذائیہ کو بتایا گیا ہے کہ اس میں بتدریج لوازم و شرائط اپنے خیال اور صواب دید کے مطابق اضافہ کیا جاتا رہا ہے آخر میں چل کر موجودہ صورت بن گئی، کسی نے ایک کام کو جو موجب ثواب ہے اس میں شامل کر لیا، دوسرے نے دوسرے کام کو باعث اجر سمجھا اس کو بھی شامل کر لیا شریعت کے تقاضوں اور اصولوں سے اس کا تعلق ظاہر نہیں کیا گیا ہے مگر یہ سب کچھ بہ نیت اجر اور بہ ارادہ ثواب کیا گیا فیصلہ ہفت مسئلہ میں اس سلسلہ میں کہا گیا۔

"سلف میں تو یہ عادت تھی کہ مثلاً کھانا پکا کر مسکین کو کھلا دیا اور دل سے ایصال ثواب کی نیت کر لی، متاخرین میں کسی کو خیال ہوا کہ جیسے نماز میں نیت ہر چند دل سے کافی ہے مگر موافقت قلب و لسان کے لیے عوام کو زبان سے کہنا بھی مستحسن ہے اسی طرح اگر یہاں زبان سے کہہ لیا جائے کہ یا اللہ اس کھانے کا ثواب فلاں شخص کو پہونچ جائے تو بہتر ہے، پھر کسی کو خیال ہوا کہ لفظ اس کا "مشار الیہ" اگر رو برو موجود ہو تو زیادہ استحضار قلب ہو کھانا روبرو لانے لگے، کسی کو خیال ہوا کہ یہ ایک دعا ہے اس کے ساتھ کچھ کلام الٰہی بھی پڑھا

---

(۱) فیصلہ ہفت مسئلہ ص ۵

جاوے تو قبولیت دعا کی بھی اُمید ہے اور اس کلام کا ثواب بھی پہونچ جاوے گا کہ جمع بین العبادتین ہے۔

چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار

قرآن شریف کی بعض سورتیں جو لفظوں میں مختصر اور ثواب میں بہت زیادہ ہیں پڑھی جانے لگیں، کسی نے خیال کیا کہ دعا کے لیے رفع یدین سنت ہے تو ہاتھ اٹھانے لگے، کسی نے خیال کیا کہ کھانا تو مسکین کو دیا جاوے گا پانی دینا بھی مستحسن ہے، پانی پلانا بڑا ثواب کا کام ہے، اس پانی کو بھی کھانے کے ساتھ رکھ لیا بس یہ ہیئت کذائیہ حاصل ہو گئی" (۱)

تاریخ اور وقت مقرر کرنے اور اسی تاریخ کے التزام کے سلسلہ میں بھی توجیہات ہیں کہ تاریخ کے تعین سے فائدہ یہ ہے کہ جب وہ تاریخ آتی ہے تو یہ کار ثواب یاد آجاتا ہے اور ہو جاتا ہے، تاریخ متعین نہیں ہوتی تو سالوں سال گذر جاتے اور اس مسئلہ پر آخر میں بہت وضاحت سے کہا گیا:

"گیارہویں حضرت غوث پاک قدس سرہ کی، دسویں بیسویں، چہلم، ششماہی، سالانہ وغیرہ اور توشہ حضرت شیخ احمد عبدالحق رُدولوی رحمۃ اللہ علیہ اور سہ منی حضرت شاہ بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ و حلوائے شب برات اور دیگر طریق ایصال ثواب کے اسی قاعدے پر مبنی ہیں مشرب اس فقیر کا اس مسئلہ میں یہ ہے کہ فقیر پابند اس ہیئت کا نہیں ہے مگر کرنے والوں پر انکار بھی نہیں کرتا۔ (۲)

عرس اور مزارات پر حاضری

تیسرا مسئلہ مزارات پر عرسوں کا ہے جو پورے ملک میں عرصہ سے رائج تھا اور آج تک اس کی رونق میں کوئی کمی نہیں نظر نہیں آتی، حضرت گنگوہی اور مصنف براہین قاطعہ نے اس کے خلاف سخت لفظوں میں اظہار خیال کیا تھا حضرت حاجی صاحب نے تیسرے نمبر پر اسی عرس

(۱) فیصلہ ہفت مسئلہ، ص: ۶ (۲) فیصلہ ہفت مسئلہ از حاجی امداد اللہ تھانوی، ص: ۷

کے مسئلہ کو رکھا اس سلسلہ میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"چونکہ ایصال ثواب بروح اموات مستحسن ہے خصوصاً جن بزرگوں سے فیوض و برکات حاصل ہوئے ہیں ان کا زیادہ حق ہے اور ہر اپنے پیر بھائیوں سے ملنا موجب ازدیاد محبت و تزاید برکات ہے اور نیز طالبوں کا یہ فائدہ ہے کہ پیر کی تلاش میں مشقت نہیں ہوتی، بہت سے مشائخ رونق افروز ہوتے ہیں ان میں جس سے عقیدت ہو اس کی غلامی اختیار کرے اس لئے مقصود ایجاد رسم عرس سے یہ تھا کہ سب سلسلے کے لوگ ایک تاریخ میں جمع ہو جائیں باہم ملاقات بھی ہو جاوے اور صاحب قبر کی روح کو قرآن و طعام کا ثواب بھی پہونچایا جاوے یہ مصلحت ہے تعیین یوم میں رہا خاص یوم وفات کو مقرر کرنا اس میں اسرار مخفیہ ہیں اظہار ضروری نہیں چونکہ بعض طریقوں میں سماع کی عادت ہے اس لیے تجدید حال اور ازدیاد ذوق و شوق کے لیے کچھ سماع بھی ہونے لگا پس اصل عرس کی یہ ہے اس میں کچھ حرج نہیں معلوم ہوتا۔(۱)

ندائے غیراللہ

فیصلہ ہفت مسئلہ میں یارسول اللہ یا غوث وغیرہ کی ندا پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے اس سلسلہ میں حضرت حاجی صاحب نے مختصر سی گفتگو کی ہے وہ فرماتے ہیں:

"اس میں تحقیق یہ ہے کہ اس سے مقاصد و اغراض مختلف ہوتے ہیں کبھی محض اظہار شوق، کبھی تحسر کبھی منادی کو سنانا کبھی اس کو پیام پہونچانا سو مخلوق غائب کو پکارنا اگر محض واسطے تذکرہ اور شوق وصال اور حسرت فراق کے ہے جیسے عاشق اپنے محبوب کا نام لیا کرتے ہیں اور اپنے دل کو تسلی کرتے ہیں تو کوئی گناہ نہیں۔(۲)

---

(۱) فیصلہ ہفت مسئلہ، ص:۸ (۲) حوالہ مذکور، ص:۹

تین مسئلے اور

فیصلہ ہفت مسئلہ میں مزید تین اور مسئلوں پر بھی گفتگو کی گئی ہے ان میں سے جماعت ثانیہ کا مسئلہ ہے دوسرا امکان کذب اور تیسرا امکان نظیر کا مسئلہ جو ان دنوں موضوع بحث بنا ہوا تھا، امکان کذب اور امکان نظیر پر حاجی صاحب نے نہ خود گفتگو کی ہے اور نہ دوسروں کو اس پر گفتگو کی اجازت دی اس طرح ان ساتوں مسئلوں کا ذکر آگیا ہے جو فریقین میں مابہ النزاع تھے آخری دو مسئلوں، امکان کذب و امکان نظیر کے بارے میں حاجی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"بوجہ نازک ہونے ایسے مسائل کے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں قیل و قال اور زیادہ تفتیش کرنا عجب نہیں کہ منع ہو، دیکھئے تقدیر کا مسئلہ چوں کہ پیچیدہ و مجمع اشکالات تھا اس میں گفتگو کرنے سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قدر سخت ممانعت فرمائی سو اس ممانعت کی علت یہی تھی اور یہی دقت و اشکال یہاں بھی ہے سو ان دو مسئلوں میں بھی جب بوجہ تعارض ظاہری ادلہ عقلیہ و نقلیہ کے اشکال شدید ہے تو قیل و قال کرنے کی کیسے اجازت ہوگی؟"۔(۱)

کف لسان کی تاکید

حضرت حاجی صاحب نے مجبور ہو کر اور قلمی جنگ کی ہنگامہ آرائیوں سے پریشان ہو کر دونوں فریق کو سمجھانے کی کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ دونوں طرف سے جو دلائل دیے گئے ہیں ان میں سے کسی کو آپ نے ہاتھ نہیں لگایا ہے نہ کسی دلیل کی تائید کی ہے اور نہ تردید، ان نو ایجاد مسائل میں جو قیود و شرائط عائد کر دی گئی ہیں حاجی صاحب نے ہر

---

(۱) فیصلہ ہفت مسئلہ، ص:۱۱-۱۲

جگہ ان کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ فقیر اس کا پابند نہیں، سیاق عبارت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب نے مولوی عبدالسمیع رام پوری اور ان کی کتاب انوار ساطعہ کے مندرجات کے لیے آپ کے دل میں ایک نرم گوشہ ہے اور بظاہر ایک گونہ تائید معلوم ہوتی ہے لیکن مسئلہ پر اظہار خیال فرماتے ہوئے آپ نے اس علت کی طرف اشارہ کر دیا ہے جس کی بنا پر حضرت گنگوہی اور ان کے اہل علم رفقاء کو اعتراض ہے، ہر جگہ اپنی براءت کا اظہار فرمایا ہے یہ علت ہی در حقیقت بنائے اختلاف ہے، یہ بات پورے یقین کے ساتھ اس لیے کہی جا رہی ہے کہ اسی رسالہ "فیصلہ ہفت مسئلہ" کے آخر میں وصیت کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے وہی حضرت حاجی صاحب کے دل کی آواز ہے، یہ ذہن میں رہے کہ اس دور میں بدعات و خرافات کے خلاف سب سے طاقتور اسلوب حضرت گنگوہی اور ان کے خلفاء ہی نے اپنایا ہے اور جو کچھ شکایات حضرت حاجی صاحب تک پہونچائی جاتی تھیں اس میں حضرت گنگوہی کا نام سر فہرست تھا، وہ فریق چاہتا تھا کہ حضرت حاجی صاحب حضرت گنگوہی کے ان خیالات کے پیش نظر ان کے بارے میں کچھ سخت الفاظ استعمال فرمادیں تاکہ ہندوستان میں اس کو شہرت دے کر جنگ جیت لی جائے مگر ان کی توقع کے بالکل برعکس حضرت حاجی صاحب نے جو لکھا اس سے ان کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا اور ان کے مشتعل جذبات پر اُوس پڑ گئی، فیصلہ ہفت مسئلہ کے آخر میں وصیت کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:

> "اس تمام تحقیق کے بعد بھی فقیر کی یہ وصیت ہے کہ ظنیات میں اپنے علم و تحقیق پر وثوق نہ کریں۔۔۔۔ اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں خصوصاً عزیزی مولوی محمد رشید احمد صاحب کے وجود بابرکت کو ہندوستان میں غنیمت سمجھیں اور نعمت عظمیٰ سمجھ کر ان سے فیوض

وبرکات حاصل کریں کہ مولوی صاحب موصوف جامع کمالات ظاہری وباطنی کے ہیں ان کی تحقیقات محض للّٰہیت کی راہ سے ہیں ہرگز اس میں شائبہ نفسانیت نہیں۔

"یہ وصیت تو مولوی صاحب کے مخالفین کو ہے اور جو موافقین اور معتقدین ہیں ان کو چاہیے کہ مولوی صاحب کی مجلس میں ایسے قصوں کا تذکرہ نہ کریں اور اپنے جھگڑے میں ان کو شریک نہ کیا کریں، اور سب پر لازم ہے کہ مفت کی بحث اور تکرار میں عمر عزیز کو تلف نہ کریں کہ یہ حجاب ہے محبوب حقیقی سے"۔

مہر فقیر امداد اللہ فاروقی چشتی (۱)

دوسرا قدم

انوار ساطعہ کے جواب میں براہین قاطعہ کی اشاعت کے بعد حضرت گنگوہی کے خلاف جو مہم چلائی گئی وہ ہندوستان میں تو تکفیری مہم کے عنوان سے تھی لیکن اس جنگ کا دوسرا محاذ مکہ مکرمہ تھا جہاں مصنف انوار ساطعہ مولوی عبدالسمیع رام پوری اور حضرت گنگوہی دونوں کے پیر ومرشد اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مقیم تھے مولوی عبدالسمیع کے حلقہ کے لوگوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ حضرت حاجی صاحب اس مہم کی تائید فرمادیں جو ہندوستان میں حضرت گنگوہی کے خلاف چلائی گئی تھی، حضرت حاجی صاحب کی مجلس میں بحث وتکرار، سخت وسست الفاظ کا استعمال، گفتگو میں گرما گرمی سب کچھ ہوا، دونوں فریق حاجی صاحب سے وابستہ تھے اس لیے آپ نے اس باہمی جنگ وجدال کو ختم کرنے یا ٹھنڈا کرنے کی غرض سے ان مخصوص مسائل پر رسالہ "فیصلہ ہفت مسئلہ" کے نام سے تحریر فرمایا جو دونوں فریق کے

---

(۱) فیصلہ ہفت مسئلہ، ص: ۱۲

درمیان مابہ النزاع تھے انداز تحریر سے اندیشہ تھا کہ حضرت گنگوہی کے مخالفین غلط فہمی میں پڑکر سب وشتم کرنے لگیں، پیش بندی کے طور پر آپ نے وصیت کے عنوان سے چند سطریں اس فتنہ پر بندش لگانے کے لیے تحریر فرمادیں کیوں کہ حالات کے اعتبار سے وہ اطمینان بخش نہیں تھا اس لیے ایک دوسرا رسالہ "ضیاء القلوب" کے نام سے حضرت حاجی صاحب نے تحریر فرماکر شائع کیا، اس میں سلوک وطریقت کے رموز و اسرار بیعت وارشاد اور تصوف کے رموز مخفیہ کی تعلیم وتلقین، اعمال و اشغال کی تفصیل تھی، اس رسالہ کی تحریر کے وقت بھی آپ نے اس قضیہ کو فراموش نہیں فرمایا جو پہلے سے چل رہا تھا، اسی وجہ سے آپ نے اپنے رسالہ ضیاء القلوب میں جو فارسی زبان میں ہے حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کے بارے میں اپنے اعتماد و یقین کی سند فراہم فرمادی، آپ کے الفاظ درج ذیل ہیں:

"ہر کسے کہ ازیں فقیر محبت و عقیدت وارادت دارد مولوی رشید احمد صاحب سلمہ، مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ، راکہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری وباطنی اند بجائے من راقم الاوراق بلکہ بدارج فوق از من شمارند اگرچہ معاملہ برعکس شد کہ من اُوشاں بجائے من و من بمقام اُوشاں شدم، صحبت اوشاں را غنیمت دانند کہ ایں چنیں کساں دریں زماں نایاب اند۔ از خدمت بابرکت ایشاں فیضیاب بودہ باشند و طریق سلوک کہ دریں رسالہ نوشتہ شد در نظر شاں تحصیل نمایند انشاء اللہ بے بہرہ نخواہند ماند اللہ تعالیٰ در عمر شاں برکت دہاد و از تمامی نعمہائے عرفانی وکمالات قربت خود مشرف گرداناد و بمراتب عالیات رساناد و از نور ہدایت شاں عالم را منور گرداناد، وتاقیامت فیض اوشاں جاری داراد بحرمۃ النبی وآلہ الامجاد۔"(۱)

(۱) ضیاء القلوب از حاجی امداد اللہ تھانوی، ص: ۶۰ مطبع مجیدی کانپور

اصل الفاظ حضرت حاجی صاحب کے نقل کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کی سہولت کے لیے اردو میں اس کا خلاصہ بھی پیش کر دیا جائے، حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی تحریر فرماتے ہیں کہ:

اور یہ بھی یاد رکھیں کہ جو شخص اس فقیر سے محبت و عقیدت اور مریدی کا تعلق رکھتا ہے وہ مولوی رشید احمد سلمہ اور مولوی محمد قاسم سلمہ کو جو تمام علوم ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع ہیں بجائے مجھ راقم الاوراق بلکہ مجھ سے بہت درجے اوپر شمار کریں اگرچہ ظاہر میں معاملہ اس کے برعکس ہو رہا ہے کہ وہ میری جگہ اور میں ان کی جگہ ہوں (یعنی میں پیر ہوں اور وہ مرید) اور ان کی صحبت کو غنیمت جانیں کہ اس زمانے میں ایسے لوگ نایاب ہیں اور ان کی بابرکت خدمت سے فیض حاصل کریں اور سلوک کا طریقہ جو اس رسالہ (ضیاء القلوب) میں لکھا گیا ہے ان کی نگرانی میں حاصل کریں انشاءاللہ محروم نہ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ ان دونوں کی عمروں میں برکت دے اور تمام عرفانی نعمتوں اور اپنی قربت کے کمالات سے مشرف فرماویں اور اونچے اُونچے مرتبوں پر پہونچائیں اور ان کی ہدایت کے نور سے سارے عالم کو نورانی بنادیں اور قیامت تک ان دونوں کا فیض جاری رکھیں بحرمت نبی پاک و آل پاک" (۱)

---

(۱) بحوالہ رسالہ الرشید دار العلوم دیوبند نمبر، ص: ۶۱۳

باب ۱۳

درس حدیث اور معمولات

حضرت گنگوہی نے تعلیم و تدریس کا سلسلہ ابتدا ہی سے جاری کر رکھا تھا اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ طلبہ گنگوہ حاضر رہتے اور تعلیم حاصل کرتے رہتے تھے، یہ تسلسل کبھی نہیں ٹوٹا، ایک ممتاز عالم نے بیان کیا کہ میں نے ہدایہ حضرت گنگوہی سے پڑھی تھی جس سال میں ہدایہ کی جماعت میں شریک ہوا تو ایک دن آپ نے ہمارے سامنے فرمایا کہ میں چودھویں بار ہدایہ پڑھا رہا ہوں یعنی چودہ سالوں سے ہدایہ آپ کے زیر درس رہی اسی طرح مختلف علوم و فنون کی بھی کتابیں پڑھاتے تھے لیکن جب آپ تیسرے اور آخری حج سے واپس تشریف لائے تو دوسرے علوم و فنون کی تدریس ایک دم بند کر دی اور صرف صحاح ستہ کا درس جاری رکھا آخری حج آپ نے ۱۲۹۹ھ میں ادا کیا تھا اور واپسی ۱۳۰۰ھ میں ہوئی یعنی چودھویں صدی کے پہلے سال سے پابندی کے ساتھ صرف احادیث کی تعلیم میں مصروف ہو گئے اور تنہا صحاح ستہ کی تمام کتابیں سال میں تمام کرا دیتے تھے اس پابندی کے ساتھ آپ نے ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۵ء) تک مسلسل دورۂ حدیث پڑھایا، اسی سال آپ کو ضعف بصارت کا عارضہ لاحق ہوا اور بہت تیزی سے نظر گرنے لگی، خطرہ پیدا ہو گیا کہ کتابیں ختم بھی ہوں گی یا نہیں، کیوں کہ روشنی روز بہ روز گھٹتی جا رہی تھی اللہ اللہ کر کے سال تمام ہوا اور شعبان میں ساری کتابیں ختم ہو گئیں اور پھر بینائی ایک دم

رخصت ہو گئی، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمتہ اللہ علیہ کے والد معظم مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی اسی سال دورۂ حدیث میں شریک تھے، حضرت گنگوہی کے سوانح نگار کے بیان کے مطابق کچھ کم وبیش تین سو علماء آپ کے درس سے فیضیاب ہوئے ان میں زیادہ تر ایسے علماء کی تعداد تھی جنھوں نے بعد میں درس وتدریس کا مشغلہ رکھا اور اپنے اپنے علاقہ میں ان کا فیض عام ہوا اور ان میں سے کچھ علماء وہ تھے جنھوں نے تحصیل علم کے بعد حضرت گنگوہی سے بیعت کی اور اجازت وخلافت بھی پائی، انھوں نے اپنے اپنے دیار میں اصلاح اُمت میں مجاہدانہ کارنامے انجام دیے اور اسلامی معاشرہ میں نفوذ کی ہوئی بدعتوں، مشرکانہ عقائد اور رسوم کے جراثیم سے پاک کرنے میں اہم کردار انجام دیا، حضرت گنگوہی کے تلامذہ میں سے ہر ایک اپنے علاقہ میں مرکز ہدایت اور ایک ممتاز عالم کی حیثیت سے جانا جاتا رہا اور اس کے کارناموں سے عام طور پر لوگ واقف بھی رہے اور ان کی ذات سے قابل ذکر اصلاح ہوئی۔

انداز درس

حضرت گنگوہی نے حدیث شیخ عبد الغنی مجددی دہلوی سے پڑھی تھی جنھوں نے اپنے والد مشہور بزرگ ومحدث شیخ ابوسعید مجددی دہلوی کے علاوہ شیخ شاہ اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکی سے بھی پڑھی تھی جو شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ابن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نواسے بھی تھے اور شاگرد بھی۔ اس خاندان کا درس حدیث بہت ہی محققانہ اور عالمانہ ہوتا تھا یہی طریقہ درس علماء دیوبند میں مولانا احمد علی محدث سہارن پوری، حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند اور حضرت گنگوہی نے اپنایا تھا، بعد میں دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارن پور، جامعہ

قاسمیہ مراد آباد کے شیوخ حدیث نے اختیار کیا اس طریقہ درس سے پورے ذخیرہ حدیث پر غور کرنے اور اس سے استخراج نتائج اور استنباط مسائل کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور حدیث کے مطالعہ کا انداز سلامتی کی راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور افراط و تفریط، کج رائی اور کج فہمی کی پرخار وادیوں سے بچ جاتا ہے، ورنہ ہر معمولی علم کا آدمی حدیث کی ایک کتاب کو پڑھ کر محدث بن جانے کا دعوی کرنے لگتا، جبکہ اس کا صراط مستقیم پر باقی رہنا بھی مشکل تھا، کیونکہ مختلف روایتوں متعارض حدیثوں کے درمیان جمع و تطبیق ہی علوم شریعت کی شہ کلید ہے حضرت گنگوہی کے درس حدیث سے ان کے شاگردوں میں یہی ملکہ پیدا ہو جاتا تھا۔

حضرت گنگوہی کا معمول

حضرت گنگوہی کا معمول یہ تھا کہ آپ سب سے پہلے صحاح ستہ کی ترمذی شریف کے درس کا آغاز فرماتے تھے اور تمام اہم اور ضروری مباحث کا ذکر اس کتاب کے درس کے وقت فرماتے اور ہر بحث اور حدیث پر عالمانہ و محدثانہ کلام فرماتے، صرف ترمذی کے درس میں حدیث کا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کرتے اور غیر مبہم الفاظ میں ترجمانی فرماتے، اگر کسی آیت قرآنی یا دوسری حدیثوں سے تعارض ہوتا تو اس کو رفع فرماتے اور سند پر کلام اور رُواۃ پر بھی گفتگو ترمذی میں ضرور فرماتے، جو بحثیں دقیق ہوتیں اس کو مختلف پیرایوں سے مکرر سہ کرر بیان فرما کر ذہن نشین کر دینے کی کوشش فرماتے تھے، اس طرز تدریس کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ صحاح ستہ کی عام حدیثوں سے متعلق مباحث پر نگاہ ہو جاتی تھی، اس لیے الگ سے ان کتابوں کے درس کے وقت مفصل گفتگو کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی تھی، حضرت گنگوہی فقہ کے امام تھے صورت

مسئلہ کے سامنے آتے ہی اس کا حل بھی فوراً ذہن میں آجاتا تھا اور اس کی دلیل بھی اور اس کی نظیر بھی شامی اور عالم گیری کے اوراق پلٹنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، اس لیے حلقۂ دیوبند میں صرف حضرت گنگوہی کو فقیہ النفس کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا تھا، اسی فطری کمال اور وہبی صلاحیت کی وجہ سے درس ترمذی کے وقت سارے مسائل کا استحضار رہتا اور حنفی مسلک کو حدیث کی روشنی میں مدلل بیان فرماتے تھے، درس ترمذی اتنا مکمل اور مدلل اور جامع مانع ہوتا تھا کہ کسی کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی، آپ کے تلامذہ میں بہ کثرت ایسے حضرات ہوئے جو حضرت گنگوہی کے فضل وکمال سے مستفید ہوئے اور ان کا بھی ذہن ومزاج حضرۃ الاستاذ کے سانچے میں ڈھل گیا۔

ترمذی شریف کے درس کے بعد صحاح ستہ کی دوسری کتابیں رواں پڑھاتے تھے سوائے ان روایتوں کے جو پہلی بار آرہی ہیں یا دوسروں نے ان روایتوں کو مستدل بنا کر علمی بحثیں اٹھائی ہیں، بس انھیں روایتوں پر کچھ کلام کرتے تھے اور ترمذی شریف کی بحث کا حوالہ دیتے تھے۔

اس طریقہ کا فائدہ یہ تھا کہ طلبہ کے ذہن آدھی درجن حدیث کی کتابوں اور مختلف استاذوں کی جداگانہ بحثوں سے منتشر نہ ہوتا، بلکہ جو بات ایک بار مدلل طور پر ان کے ذہن میں بیٹھ گئی وہ نقش کالحجر اور انمٹ ہو جاتی اور حدیث کی کوئی بھی کتاب ہوتی ذرا توجہ اور غور وفکر سے استاذ کی تقریر کی روشنی میں طلبہ کے لیے ان کا حل کر لینا آسان ہو جاتا تھا۔

شریک درس طلبہ

۱۳۰۱ھ سے آپ نے مستقل صحاح ستہ کی تعلیم اپنے لیے خاص کر لی تھی دیگر علوم وفنون کی کتابوں کا درس بالکل بند کر دیا تھا، یہ سلسلہ ۱۴

سالوں تک مسلسل جاری رہا، حضرت گنگوہی کے ایک مستند سوانح نگار نے ان علماء کی تعداد جنھوں نے حضرت گنگوہی سے صحاح ستہ پڑھ کر سند حدیث لی ہے تقریباً تین سو بتائی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد اوسطاً ہر سال بیس اور پچیس کے درمیان رہی ہوگی۔

یہ پیش نظر رہے کہ حضرت گنگوہی اپنی خانقاہ ہی میں درس دیتے تھے کوئی باقاعدہ مدرسہ نہیں تھا، نہ حضرت گنگوہی کو کہیں سے وظیفہ یا مشاہرہ ملتا تھا یہ تدریسی مشغلہ حسبتاً للہ تھا۔ اس کا کوئی معاوضہ نہیں تھا، طلبہ کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ یہ سچ مچ مہمان رسول تھے، گنگوہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا یہاں نہ ہوٹل تھے نہ ڈھابے نہ سرائے، نہ مدرسہ میں موجودہ دور کی طرح مطبخ، درس گاہ کی حیثیت اس کی تھی ہی نہیں کہ یہاں طلبہ کے لیے دار الاقامہ کے کمرے ہوتے، طلبہ کا قیام تو وہیں خانقاہ، مسجد اور سہ دری میں تھا جو حضرت گنگوہی نے درس کے لیے تعمیر کرائی تھی البتہ طلبہ کے کھانے پینے کا نظم تو بعض طلبہ کا بار خود حضرت گنگوہی اٹھاتے تھے اور آپ کے گھر سے کھانا آتا تھا اور کچھ قصبہ والے تعاون کرتے رہے بالخصوص آپ کے اعزہ اور رشتہ دار اپنے گھروں پر کھلاتے تھے حضرت گنگوہی کی خدمت میں آنے والے طلبہ علم کے شوق میں آتے تھے وہ ساری مصیبتیں جھیل کر تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ لے کر حاضر ہوتے تھے اس لیے قیام و طعام کی جو سہولت مل جاتی اُسے نعمت خداوندی اور موہبت الٰہی سمجھتے، جو روکھا سوکھا مل جاتا صبر و شکر کے ساتھ کھالیتے کبھی ان کے دلوں میں کوئی ملال پیدا نہیں ہوتا تھا قیام و طعام کی ساری مشکلات کے باوجود کوئی طالب علم بددل ہو کر وہاں سے جانے کا قصد بھی نہیں کرتا تھا، طلبہ بھی اطراف و جوانب اور قریبی اضلاع ہی کے نہیں تھے بنارس جہاں یہ کتاب مرتب کی جارہی ہے

حضرت گنگوہی کے شاگرد یہاں بھی تھے، اتر پردیش کا ایک دم مشرقی ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ مئوناتھ بھنجن کے ایک ممتاز شاگرد استاذ العلماء مولانا عبد الغفار صاحب اعظمی بھی تھے انکے مشہور شاگرد محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی ہوئے جن کی علمی شہرت عالم اسلام میں ہوئی۔

طلبہ کا اعزاز واحترام

طلبہ مختلف صوبوں کے ہوتے تھے جن کی بولیاں مختلف، لباس علیحدہ، گفتگو کا انداز بھی جداگانہ اس کے باوجود حضرت گنگوہی ہر ایک کی دلداری اور دل دہی فرماتے ان کو اپنے سے قریب تر بناتے اخلاقی تربیت فرماتے روحانی جذبات اور سلوک ومعرفت سے بھی ان کو آشنا بناتے تاکہ وہ محض علم حاصل کر کے یہاں سے نہ جائیں بلکہ سراپا عمل بن کر دوسروں کے لیے نمونہ بن کر جائیں دوران تعلیم طلبہ کی خودداری اور غیرت وانا کو ٹھیس نہیں لگاتے تھے، آپ چاہتے تھے کہ عوام ان کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھیں۔ اگر کبھی کوئی ایسا رویہ دیکھ لیتے جس سے طالب علم کا وقار مجروح ہوتا ہے تو آپ نہ اس سے چشم پوشی فرماتے نہ نظر انداز فرماتے بلکہ اس کے تدارک کی عملی کوشش فرماتے۔

ایک بار حضرت گنگوہی کی نگاہ ایک ایسے طالب علم پر پڑی جو آپ کے کسی رشتہ دار کے یہاں سے کھانا لے کر آرہا تھا، ہاتھ میں کھلی ہوئی روٹی تھی، آپ نے اس طالب علم کو بلایا اور دریافت فرمایا کہ کہاں سے کھانا لاتے ہو؟ اس نے جو نام بتایا وہ حضرت گنگوہی کے عزیز ہوتے تھے آپ نے طالب علم سے فرمایا اب تم اس گھر سے کھانا مت لانا میرے گھر سے کھانا آئے گا۔

لڑکا جب رخصت ہو گیا تو آپ نے اس رشتہ دار کے یہاں یہ بات

پہونچائی کہ تم نے مہمان رسول کو فقیر سمجھ رکھا ہے اور بھیک مانگنے والوں کو جس طرح بے وقعتی کے ساتھ روٹیاں دی جاتی ہیں اس طرح طالب علم کے ساتھ سلوک کیا جارہا ہے، آئندہ تمہارے کھانے کی ضرورت نہیں، اس کا بھی خدا ہے وہ اپنے بندے کا کوئی دوسرا انظم کردے گا۔ اس گھر کی بڑی بی حضرت گنگوہی کے گھر آئیں اور بڑی لجاجت سے کہا کہ ہم سے غلطی ہوگئی، ہم معافی چاہتے ہیں، آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی اور دستر خوان میں لپیٹ کر کھانا دیا جائے گا، حضرت گنگوہی نے معذرت قبول فرمالی اور طالب علم سے کہہ دیا کہ اب تم اس گھر سے کھانا لایا کرو۔

بظاہر یہ بہت چھوٹی سی بات ہے لیکن اس واقعہ میں سبق ہے کہ علماء کو عزت نفس ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے، غیرت و خودداری جو انسانی شرافت کا آئینہ ہے اس پر دھبہ نہیں آنا چاہیے اور عوام کو یہ سبق دیا گیا کہ جن لوگوں سے تم کو دین مل رہا ہے اگر ان کی تمہارے دلوں میں عزت اور ان کا احترام نہیں ہوگا تو تم دین کی صحیح تعلیم اور ایمان کی برکات سے محروم رہ جاؤ گے۔

اسباق بالعموم بعد نماز فجر اور اوراد و وظائف اور اشراق کی نماز کے بعد شروع فرمادیتے تھے، ۸ بجے سے شروع کر تین گھنٹے مسلسل جاری رہ کر ۱۱بجے بند کردیے جاتے تھے پھر کھانے، قیلولہ کرنے کے بعد نماز ظہر کی ادائگی اور اس کے بعد تلاوت قرآن آپ کا معمول تھا اس سے فراغت کے بعد سبق جاری ہوتا تو عصر کے وقت تک جاری رہتا اور اسی کتاب کا سبق ہوتا جو صبح پڑھائی گئی ہے، بیک وقت صحاح ستہ کی سبھی کتابیں نہیں پڑھائی جاتی تھیں، مصلی جو عصر کے وقت سے پہلے آجاتے وہ بھی سبق میں ایک طرف ادب سے بیٹھ جاتے، طلبہ کے علاوہ اگر دوسروں کو بھی سوال کرنا ہوتا تو وہ بھی اسی سبق کے دوران سوال کرتا اور آپ اُسے

خلل اندازی نہیں تصور فرماتے بلکہ اس آدمی کو بھی پوری بشاشت سے مسئلہ سمجھاتے تھے۔

حضرت گنگوہی کے معمولات

حضرت گنگوہی کے جو معمولات تھے اس کی پابندی ہمیشہ رہی، نماز فجر کے بعد مراقبہ، اوراد و وظائف، نماز اشراق کے بعد اسباق شروع ہو جاتے، پھر کھانا اور قیلولہ اور نماز ظہر کے بعد قرآن دیکھ کر تلاوت پھر درس تا نماز عصر، عصر کی نماز کے بعد مستفیدین حاضر ہو جاتے اور مجلس میں تا نماز مغرب آپ تشریف رکھتے، نماز مغرب کے بعد نفلوں کا سلسلہ دیر تک رہتا پھر کھانا اور نماز عشاء کے کچھ بعد بستر پر چلے جاتے، شب میں پچھلے پہر بیدار ہو جاتے تو نفلوں کا سلسلہ اور لمبی قرأت کا تا نماز فجر سلسلہ جاری رہتا پھر نماز فجر ادا فرماتے۔

۱۳۰۵ھ کے بعد آپ کی مصروفیات میں بے انتہا اضافہ ہو گیا، یہی وہ زمانہ ہے جب بیعت ہونے والوں کا تانتا لگ گیا بہت سے اکابر علماء وابستہ ہو گئے، سرکاری ملازمتوں کے لوگ آپ کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئے ان مستفیدین و مسترشدین کے خطوط کا ایک انبار روزانہ جمع رہتا جن میں اکثر جواب طلب ہوتے ان تمام خطوط کے جوابات اسی مصروف وقت میں اپنے قلم سے تحریر فرماتے اور جب تک آنکھوں کی روشنی قائم رہی کبھی ان خطوط کا املا نہیں کرایا۔

اسی سال کے بعد پورے ملک سے استفتا آنے لگے بالخصوص بدعات و رسوم اور عقائد کے سلسلہ میں سوالات ہوتے ان تمام سوالات کے جوابات بھی اسی دوران قلمبند فرماتے اور کوشش فرماتے کہ سارے خطوط اور استفتوں کے جوابات اسی دن لکھ دیے جائیں جس دن موصول ہوئے

ہیں، کبھی کبھی ایک دو دن کا فصل بھی ہو جاتا تھا مگر ایسا کم ہی ہوتا تھا۔

اکابر علماء کا رجوع

صحاح ستہ کے درس کے اس دور میں اکابر علماء کا رجوع ہوا سب سے پہلے مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری مصنف بذل المجہود بیعت ہوے اور خانقاہ گنگوہ آپ کی آمد ورفت شروع ہوئی۔

دوسری بڑی شخصیت مولانا محمود حسن دیوبندی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں شیخ الہند کے نام سے مشہور ہیں انھوں نے حضرت گنگوہی سے بیعت کی اور آپ کے خلیفہ مجاز ہوے اور پابندی سے ہر جمعہ کو پاپیادہ گنگوہ جاکر شیخ کی مجلسوں میں شرکت فرماتے اور شام کو پاپیادہ دیوبند واپس ہو جاتے۔

کچھ عرصہ بعد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور ان کے برادر اکبر مولانا صدیق احمد مدنی حضرت گنگوہی سے بیعت ہوے اور دونوں نے حضرت گنگوہی کے دست مبارک سے دستار فضیلت پائی، ان حضرات کی بیعت کی وجہ سے عام علماء کا رجوع حضرت گنگوہی کی جانب ہوا اور علماء کی بڑی تعداد آپ کے دامن عقیدت سے وابستہ ہوئی، عوام تو بہت پہلے ہی سے آنا شروع ہو گئے تھے اور ان کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ جاری تھا۔

آپ سے بیعت ہونے والوں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ سب کے سب بدعات مشرکانہ رسم ورواج وعقائد سے نفور تھے چوں کہ اسی دور میں آپ نے اسلامی معاشرہ کو ان خرافات سے پاک کرنے کے لیے جہاد چھیڑ رکھا تھا اس مہم کی وجہ سے بہت سے لوگ آپ کے دشمن بھی تھے لیکن آپ کے پائے ثبات میں کبھی جنبش نہیں آئی۔

چراغ تلے اندھیرا

حسن زبصرہ بلال از حبش صہیب از روم
زخاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبیست

حضرت گنگوہی اس محاذ پر فتح نہ پاسکے جو آپ کے پاؤں کے نیچے تھا یعنی شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا عرس اور اس کی خرافات برابر جاری رہیں، جب کہ آپ کا دائرہ اصلاح انتہائی وسیع ہو چکا تھا پورے ملک میں اصلاح کی ایک طاقتور تحریک چل پڑی تھی لیکن گنگوہ کا یہ عرس ابھی تمام ہنگامہ آرائیوں، رونقوں اور پورے تام جھام سے جاری تھا آپ اسی خانقاہ میں رہتے تھے، شیخ زادوں سے آپ کی رشتہ داریاں بھی تھیں اس کے باوجود چڑھاوے، نذر نیاز اور عرس کے ایام میں جو آمدنیاں تھیں جو خلاف شرع رسوم ادا کی جاتی تھیں وہ برابر جاری رہیں۔ یہی عرس، یہی مزار شیخ زادوں کا ذریعہ معاش تھا اس آمدنی کے لالچ کی وجہ سے یہ پورا خاندان جو سرائے کی پوری آبادی پر مشتمل تھا اس آمدنی کو جاری رکھنے کے لیے دوسروں سے ہاتھاپائی اور جنگ وجدال کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا، حضرت گنگوہی کی افہام و تفہیم، پند و نصیحت کے باوجود شیخ زادے وہ تمام مراسم ادا کرتے رہے جو عام طور سے عرسوں میں ادا کیے جاتے ہیں۔ حضرت گنگوہی جب عرس کو بند کرانے میں کسی طرح کامیاب نہ ہو سکے تو آپ نے معمول بنالیا کہ عرس کے ایام میں آپ وطن چھوڑ دیا کرتے تھے اور رام پور چلے جاتے تھے اور جب عرس کا ہنگامہ ختم ہوتا تھا تب واپس تشریف لاتے، اگر کسی سال ان ایام میں رام پور نہ جاسکے تو آپ خانہ نشین ہو جاتے اور گھر سے باہر نکلنا بند کر دیتے تھے اور اپنے تمام منتسبین کو تاکید فرمادیتے تھے کہ وہ ان ایام میں نہ گنگوہ آئیں اور نہ مجھ

سے ملنے آئیں اور اگر غلطی سے بھی کوئی بڑی سے بڑی شخصیت عرس کے دنوں میں گنگوہ آجاتی تو آپ ان پر خفگی اور برہمی کا اظہار فرماتے حتی کہ بلند آواز سے ان کے سلام کا جواب بھی نہ دیتے تھے اور اُلٹے پاؤں واپس کر دیتے تھے، اگر آنے والے نے عذر کیا کہ حضرت مجھے تو خبر بھی نہیں کہ گنگوہ میں شیخ عبد القدوس کا عرس چل رہا ہے یہ تو میں یہاں ذکر سن رہا ہوں، اس عذر پر بھی آپ کی برہمی ختم نہ ہوتی تھی اور فرماتے کہ ان خرافات میں آنے والوں میں تم نے اضافہ تو کیا اور ان کی رونق بڑھائی من کثر سوادھم فھو منھم، اس لیے فوراً واپس جایئے اور پھر کسی وقت آیئے گا، میں کسی طرح کی رورعایت ان حالات میں نہیں کر سکتا، مجبوراً اس شخص کو واپس ہونا پڑتا، ایسے واقعات کئی بار ہوے۔

باب ۱۴

دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی

حجتہ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی اعظم دارالعلوم دیوبند نے اس کے قیام کے وقت سے لے کر تا دم وفات ۱۲۹۷ھ سرپرستی فرمائی، ہر طرح کے حالات میں اس کی حفاظت کی اور اس کی ترقی کی کوششیں فرماتے رہے اس کی افادیت اور اس کے دائرہ کار کو ہمہ گیر بنانے کی جد و جہد فرماتے رہے، ارباب دارالعلوم کو بھی حضرت نانوتوی کی موجودگی میں ہر طرح کا ذہنی و فکری سکون حاصل رہا، لیکن حضرت نانوتوی کی وفات ہوتے ہی ان کی نگاہوں میں دنیا اندھیری ہو گئی کیوں کہ حاجی عابد حسین صاحب جو ابتدا ہی سے اس کے منتظم اور نگراں تھے وہ سادہ دل اور سادہ مزاج بزرگ تھے وہ دارالعلوم کے مستقبل کے بارے میں وسعت فکر و نظر اور اس کی ترقی کے امکانات کا جائزہ لیتے اور مال کی حصولیابی کی جد و جہد سے بے نیاز تھے اس لیے حضرت نانوتوی کی وفات سے قدرتی طور پر ارباب دارالعلوم کو تشویش تھی اس لیے ضرورت تھی کہ حضرت نانوتوی کے ذہن سے سوچنے والی کوئی شخصیت دارالعلوم کی سرپرستی فرمائے، وہ لوگ جو دارالعلوم کی تعمیر و ترقی سے ابتدا ہی سے وابستہ تھے وہ جانتے تھے کہ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی اک جان اور دو قالب کی حیثیت رکھتے ہیں اور دارالعلوم کے قیام اور تعمیر و ترقی میں حضرت گنگوہی حضرت نانوتوی کے ہم نوا اور ہم زبان تھے اور صلاح و

مشورہ میں شریک رہتے تھے، ہر اہم موقعہ پر حضرت گنگوہی کی دیوبند تشریف آوری ضروری تھی اس لیے اتفاق رائے سے ۱۲۹۸ھ میں حضرت نانوتوی کی جگہ حضرت گنگوہی کو دارالعلوم کا سرپرست بنادیا گیا تھا۔

اگرچہ یہ عہدہ کوئی آئینی و قانونی اختیارات کا حامل نہیں تھا لیکن سرپرست کا اعتماد و احترام نظم دارالعلوم میں کلیدی رول ادا کرتا تھا اور بہت کم سرپرست کی منشا اور رائے کے خلاف کام ہوتا تھا، لیکن کبھی کبھی سرپرست کی رائے کے احترام کے ساتھ سرپرست کی مرضی کے خلاف بھی مجلس شوریٰ فیصلہ کرسکتی تھی اور کرتی تھی حضرت گنگوہی کی سرپرستی کے دور میں ایک دو واقعات ایسے ملتے ہیں جن میں حضرت گنگوہی کی منشا کے خلاف مجلس شوریٰ نے فیصلے کیے لیکن اس میں دارالعلوم کی خیر خواہی کا جذبہ کار فرما تھا اور حضرت گنگوہی کی مخالفت نہیں تھی۔

دو فیصلے

مثال کے طور پر دو فیصلے یہاں تحریر کیے جاتے ہیں جن میں حضرت گنگوہی کی منشا کے خلاف فیصلے ہوے اور ان پر عمل بھی کیا گیا۔

ایک بار حضرت گنگوہی نے ارباب دارالعلوم کو مشورہ دیا کہ دارالعلوم کے نصاب سے یہ یونانی منطق و فلسفہ بالکل نکال دیا جائے، اس کا پڑھنا اور پڑھانا دونوں مضر ہیں، اس مشورہ کی تعمیل میں ارباب شوریٰ نے ان دونوں فنون کی کتابوں کو نصاب سے نکال دیا اور ایک سال تک منطق و فلسفہ کی کتابیں دارالعلوم میں نہیں پڑھائی گئیں، لیکن پھر دوسرے سال ارباب شوریٰ نے بعض مصلحتوں کے پیش نظر پھر منطق و فلسفہ کی کتابوں کو نصاب میں داخل کرلیا اور یہ کتابیں پڑھائی جانے لگیں حضرت گنگوہی نے بھی یہ فیصلہ سنا لیکن ارباب شوری کے فیصلہ پر

کوئی تنقید نہیں فرمائی اور نہ فیصلہ کرنے والوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم سرپرست کی منشا کے خلاف کام کررہے ہیں، رایوں کے قبول اور عدم قبول میں مجلس شوریٰ کا آزاد رہنا ہی اصل اصول ہے۔

اسی طرح ایک دوسرا فیصلہ بھی حضرت گنگوہی کے مشورہ کے خلاف کیا گیا حضرت شیخ الہند کے بھائی مولانا حکیم محمد حسن صاحب کو دارالعلوم کا طبیب مقرر کیا گیا، حضرت گنگوہی اس فیصلہ کو درست نہیں سمجھ رہے تھے لیکن ان کا تقرر ہوا اور ارباب شوریٰ کا فیصلہ ہی نافذ ہوا، حضرت گنگوہی نے کوئی کبیدگی محسوس نہیں فرمائی، ادارے صلاح و مشورہ سے چلا کرتے ہیں، اپنی رائے پر اصرار بالعموم غیر مفید ہوتا ہے، عمومی رائے پر اپنی رائے کو واپس لے لینا ہی ادارہ کی خیر خواہی اور اس کے ساتھ اخلاص کا ثبوت ہوتا ہے۔

اپنی رائے پر اصرار اور ضد ہمیشہ مضر اور ادارے کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے البتہ نصب العین پر اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ جمے رہنا ضروری ہے اس میں کوئی لچک نہیں آنی چاہیے۔ انتظامی امور میں چاہے جتنی تبدیلیاں ہوں لیکن نصب العین سے یک سرمو انحراف نہ ہو اصل خلوص یہی ہے، حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی اسی نقطہ نگاہ کے بزرگ تھے اسی لیے حضرت گنگوہی کے مشورہ کے خلاف کوئی کام ہوا تو اس کو آپ نے مسئلہ نہیں بنایا اور نہ اس کو گرہ باندھ لیا اور نہ کبھی بعد میں اس کا ذکر فرمایا۔

سرپرستی کے اس پورے دور میں آپ دوران سال کبھی کبھی گنگوہ سے دیوبند آکر اور ایک دو روز قیام فرما کر حالات کا جائزہ لیتے اور کچھ مشورے دیتے اور پھر تشریف لے جاتے، زیادہ قیام اسلیے ممکن نہ تھا کہ اس پورے دور میں گنگوہ میں حدیث کا جو حلقہ درس آپ نے قائم فرمایا تھا وہ برابر جاری رہا۔ اور اس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جارہا تھا، حتی کہ

بعض طلبہ دیوبند سے دورۂ حدیث پڑھ کر گنگوہ حاضر ہوتے اور وہاں دوبارہ سال بھر قیام کر کے حضرت گنگوہی کے درس حدیث میں شریک ہوتے تھے، گنگوہ کا یہ حلقۂ درس ۱۳۱۴ھ تک قائم رہا، بینائی ختم ہونے کے بعد یہ سلسلہ بند ہوا۔

دارالعلوم کی خیرخواہی

حضرت گنگوہی کی سرپرستی کے دور میں ایک اہم ترین واقعہ ہوا، اور حضرت گنگوہی کی بصیرت نے اس میں کلیدی رول ادا کیا اداروں کی زندگی میں اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں اگر اس موقع پر اخلاص اور ایثار سے کام نہیں لیا گیا تو ادارہ کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے یا اس کی افادیت ختم ہو جاتی ہے یا محدود ہو جاتی ہے۔

دینی اداروں میں بالعموم یہ فتنہ پیدا ہوتا ہے، جب چند مخلصین کوئی ادارہ قائم کرتے ہیں تو ممتاز اور سماج میں سربرآوردہ لوگوں کی طرف سے تعاون حاصل نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات یہ ممتاز افراد جدوجہد کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالتے ہیں لیکن ادارہ قائم کرنے والے اگر عزم وہمت اور ہر طرح کی پریشانیوں اور مخالفتوں سے نبرد آزمائی کر کے ادارہ کو بام ترقی پر پہونچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ادارہ اپنے نظم ونسق اپنی خدمات اور کارگذاری کے لحاظ سے لوگوں کی نگاہوں میں اہمیت اختیار کر لیتا ہے اور ادارہ سے وابستگی اب ذریعہ فخر ومباہات بن جاتی ہے تو وہی لوگ جو قیام ادارہ کے وقت اس کی مخالفت کرتے تھے، مذاق اڑاتے تھے اب خود اس ادارہ میں دخیل ہونے اور ادارہ پر قبضہ کرنے کی مذموم کوشش میں لگ جاتے ہیں، ادارہ پر یہ وقت بڑا نازک ہوتا ہے کیونکہ یہ فتنہ پرداز افراد نام تو اخلاص اور للّٰہیت کا

لیں گے لیکن مقصد اپنی سرخ روئی اور سماج میں عزت اور سر بلندی ہوتی ہے اور ادارہ کا نصب العین اور اس کے مقاصد سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا اگر ایسے لوگ ادارہ پر قابض ہو جائیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ ادارہ کی طبعی زندگی ختم ہو گئی اور کم عمری ہی میں اس کی موت ہو گئی۔ ایسے موقعوں پر ادارہ کے مخلصین کو پوری عزیمت کے ساتھ سامنے آنا چاہیے اور اس فتنہ کا قلع قمع کرنا اپنا مقصد بنا لینا چاہیے، فتنہ کے سانپ کا پھن کچل دینا ہی اخلاص وللّٰہیت کا ثبوت ہے قدم پیچھے نہیں ہٹانا چاہیے۔

دار العلوم دیوبند میں بھی ایسا ہی ایک حادثہ اس کے قیام کے ۲۷ سال بعد پیش آیا، دار العلوم دیوبند میں یہ فتنہ ۱۳۱۰ھ میں شباب پر آیا، دیوبند کے منشی فضل حق دار العلوم کے مہتمم تھے اور حضرت نانوتوی کے شاگرد رشید اور حضرت گنگوہی کے خلیفہ اجل حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی صدر المدرسین دار العلوم دیوبند اور نائب صدارت کے عہدے پر شارح ابو داؤد حضرت گنگوہی کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری فائز تھے اس فتنہ کی زد مہتمم مدرسہ کی آڑ لے کر انھیں دونوں بزرگوں پر پڑتی تھی قصبہ دیوبند میں ایک طبقہ وہ تھا جو ذی وجاہت، دنیاوی عزت وجاہ اور مال ودولت کے لحاظ سے نمایاں تھا وہ ان دونوں بزرگوں سے اندر ہی اندر پرخاش رکھتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ ان دونوں حضرات کو دار العلوم سے علیحدہ کر دیا جائے اور اسی کے ساتھ حضرت گنگوہی سے بھی وہ ذہنی وفکری طور پر بہت دور تھے، آپ کی سرپرستی بھی ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی اس لیے وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ حضرت گنگوہی کی سرپرستی ختم ہو جائے، مہتمم دار العلوم کو اپنے مقصد میں یہ حلقہ استعمال کرتا تھا، ان کے ذریعہ چاہا کہ مجلس شوریٰ میں اضافہ کیا جائے اور یہاں کے سربر آوردہ افراد کو شامل کیا جائے مہتمم

صاحب نے راہیں ہموار کرنی شروع کر دی اور نجی مجلسوں میں سازشیں ہونے لگیں، یہ خبریں ان دونوں حضرات کو بھی ملتی رہتی تھیں لیکن ان حضرات کا تعلق انتظامیہ سے نہیں تدریسی عملہ سے تھا اس لیے براہ راست ان حضرات کا دخل دینا مصلحت کے خلاف تھا لیکن فتنہ پردازوں نے جو فضا بنادی اس فضا میں ان دونوں حضرات کا دار العلوم میں قیام اور فرائض منصبی ادا کرنا دشوار ہو چکا تھا، اتنا ذہنی خلجان تھا کہ ان حضرات نے مجبور ہو کر اپنے شیخ و مرشد دار العلوم دیوبند کے سرپرست حضرت گنگوہی کو ایک تفصیلی خط لکھا، اس خط کی منشا یہ تھی کہ جو مدرسہ اخلاص کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے وہ مخلصین کے بجائے غیر مخلصین کے ہاتھوں میں نہ چلا جائے اس وقت صورت حال کچھ ایسی بن گئی تھی کہ ان میں کوئی مدرسہ کی علمی و دینی ترقی کا بہی خواہ نہیں تھا، مگر شب و روز کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے یہ خطرہ یقینی بنتا جا رہا تھا کہ یہ فتنہ پرداز جماعت مدرسہ پر قابض ہو جائے اور اندیشہ تھا کہ مدرسہ کا مقصد ہی فوت ہو جائے، ساری صورت حال اپنے خط میں لکھ دی تھی، اس کے جواب میں حضرت گنگوہی نے ان کو مفصل خط لکھ کر ہدایتیں دیں، اس خط کے جستہ جستہ ٹکڑے جو صورت حال اور ہدایات پر روشنی ڈالتے ہیں وہ میں یہاں دے رہا ہوں حضرت گنگوہی نے فرمایا۔

"از بندہ رشید احمد عفی عنہ،

برادران مکرمان بندہ، مولوی محمود حسن صاحب و مولوی خلیل احمد صاحب مد فیوضہما، بعد سلام مسنون مطالعہ فرمائند، آپ دونوں کے چند خطوط پہونچے جن سے وہاں کا حال معلوم ہوتا رہا آج مولوی خلیل احمد صاحب کا خط آیا جس سے پریشانی مدرسین دریافت ہوئی لہذا یہ تحریر ضروری ہوئی۔

مرے پیارے دوستو! تم کو کیوں اضطراب و پریشانی ہے تم تو من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ پر قانع رہو مدرسہ سے فقط آپ کو اتنا تعلق ہے کہ درس دیے جاؤ اگر مدرسہ حق تعالیٰ بند کرادے گا، تم اپنے گھر بیٹھ رہنا، اگر مفتوح رہا درس میں مشغول رہنا، جو تم سے درس کرانا اہل شہر کو منظور نہ ہوگا تو دوسرا باب مفتوح ہو جائے گا تم کس واسطے پریشان ہوتے ہو، خبر بھی مت ہو کہ کیا ہو رہا ہے اپنا کام کیے جاؤ، تمہارے برابر تو کسی کے دست و پا نہیں چلتے تم کیوں بے دست و پا اپنے آپ کو سمجھتے ہو، جس کام کے تم ہو اس میں تکرار نہیں، اب فقط نزاع یہ ہی ہے کہ اہل شوریٰ کی زیادت ہو، تمہارا کیا حرج ہے، تم اپنا کام کرو۔ حاجی صاحب مصلحت کا کام کرتے ہیں وہ اہل تدبیر میں رہیں خواہ کچھ ہو ہماری تمہاری مرضی کے موافق ہو یا مخالف اور اہل شوریٰ خود سب اختیار حاجی صاحب کو دے کر مطمئن ہو گئے تو تم پر کیا بار ہے پس تم جیسے لوگوں سے تردد کا ہونا بے موقع ہے۔ تم کسی امر میں لب کشامت ہو، کوئی پوچھے تو جواب دو کہ درس کے باب میں ہم سے پوچھو جو ہمارا کام ہے انتظام وغیرہ کو ہم نہ جانیں نہ ہم دخل دیں اور اندیشہ بدمعاشاں بھی کیوں کرو اس شعر حضرت شیخ المشائخ قدس سرہ کو مدنظر رکھو۔

قصد ظالم بسوئے کشتن ما　　دل مظلوم ما بسوے خدا
او دریں فکر تا بما چہ کند　　ما دریں فکر تا خدا چہ کند

اے عزیزان روز ازل مقدر ہو چکا ہے ذرہ ذرہ جو واقع ہو گا مدرسہ کے امور میں بھی بس وہ ہی ہو گا اور ہو کر رہے گا خواہ کوئی دفع کرے یا واقع کرے پھر تم کیوں سرگشتہ ہوتے ہو۔

ہر چہ از محبوب رسد شیریں بود

ہم کون ہیں، بے اختیار محض ہیں، اگرچہ بظاہر مختار ہیں ہم پر جو گذرے گا وہ عین لطف ہو گا اور جو عالم میں صادر ہو گا وہ عین مصلحت

ہو گا، خواہ خرابی مدرسہ ہو یا بقا، خواہ عزت و نصب ہمارا تمہارا ہو خواہ ذلت و عزل، تم یہ سب وقائع بازی گر کے سانگ سمجھ کر اپنے درس کے شغل میں بسر کرو ایں و آں کو زید، عمر پر چھوڑو ہر کس بخیال خویش خیطے دارد نہ کوئی مفسد کچھ کرسکے اور نہ کوئی مصلح کرسکتا ہے سب فاعل مختار کرتا ہے و ما تشاؤن الا ان یشاء اللہ

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم　　کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد

و ھو ارحم الراحمین، بس تمام ہوا قصہ وہاں کی خبر کا مشتاق ہوں، بشر ہوں، اپنے دوستوں کا دعا گو خیر طلب ہوں، تم کو کوئی گزند نہیں، مطمئن رہو، نہ مدرسہ کہیں جاوے ہر شخص کو اپنے اپنے خیال پر ناز اس جان کر کالاے بد برش خاوند کرو اور دم بخود ہو کر می نوش و می نیوش و چیزے مخروش۔(۱)

حضرت گنگوہی کا یہ خط پڑھنے کے بعد وہ سارے ہنگاموں، سازشوں اور افواہوں سے یکسو ہو کر صرف درس و تدریس میں مصروف ہو گئے پھر کسی مرحلہ پر نہ اپنے خیالات کا اظہار کیا اور نہ اپنی فکر مندی ظاہر کی رضا بالقضاء پر اتنی سختی سے کار بند ہو گئے کہ انھوں نے اس فتنہ کے بارے میں اپنے لب بند کر لیے کیوں کہ ان کو یہی ہدایت دی گئی تھی، اور اسی کے ساتھ یہ بھی یقین تھا کہ کارساز ما بہ فکر کار ما۔

فتنہ اپنی موت آپ مرگیا

حضرت گنگوہی تسلی و تشفی کے لیے کف لسان کی ہدایت دے کر یکسو نہیں ہو گئے چوں کہ انسان حصول مقصد کے لیے جد و جہد کا مکلف بنایا گیا ہے، لیس للانسان الا ما سعٰی کا قانون الٰہی ہے۔

۱۳۱۰ھ میں منشی فضل حق دار العلوم کے مہتمم بنائے گئے تھے، ان کے

---

(۱) تذکرۃ الخلیل از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، ص: ۱۷۳-۱۷۴-۱۷۵

مہتمم بنتے ہی یہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوا تھا، دیوبند کے ذی وجاہت لوگ جو مجلس شوریٰ میں داخل ہو کر دار العلوم پر قبضہ کر کے اپنی منشا کے مطابق چلانے کی فکر میں تھے اور وہ اس میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ حضرت گنگوہی کی سرپرستی ختم کر کے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کو دار العلوم سے علیحدہ نہیں کر لیتے۔ اس لیے اس کا راستہ انھوں نے یہی سمجھا کہ مجلس شوریٰ میں ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد آجائے، منشی فضل حق مہتمم مدرسہ کی پشت پر دیوبند کے یہ فتنہ پرور تھے جو قصبہ میں با اثر تھے اس لیے مہتمم کو اس کے عہدے سے ہٹانا خطرے سے خالی نہ تھا کیوں کہ آتش فشاں کے پھٹ پڑنے کا یقین تھا لیکن مخلصین کو اسباب سے زیادہ اپنے اخلاص اور للّٰہیت پر اعتماد ہوتا ہے وہ رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل کرنے والے بزرگ ہوتے ہیں حضرت گنگوہی اسی بلند مقام پر فائز تھے، انھوں نے نہایت شان استغناء سے منشی فضل حق کو حکم دیا کہ آپ فوراً اپنے عہدے سے استعفاء دے دیں۔

منشی فضل حق میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ انکار کر سکیں، اس لیے استعفا لکھ کر فوراً پیش کر دیا اور آپ نے فوراً اسی دن مولانا قاسم نانوتوی کے خاندان کے ایک بزرگ عالم مولانا محمد منیر نانوتوی کو ۱۳۱۱ھ میں دار العلوم کا مہتمم بنا دیا اور پھر آپ دو سالوں تک دار العلوم کے مہتمم رہے، اس دو سالہ دور میں فتنہ کا سر کچل کر رکھ دیا اور احاطۂ دار العلوم کو سازشوں سے پاک کیا فتنہ پردازوں کے پر کاٹ کر رکھ دیے اور دار العلوم اپنی ترقی کی شاہراہ چلنے کے لیے آزاد ہو گیا۔

سازش یا دناعت

فتنہ اور سازش کرنے والوں کے دلوں میں جو کھوٹ تھا وہ بعد میں

خود ظاہر ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ وہ لوگ دارالعلوم کے حق میں کتنے مخلص تھے، انھوں نے سب سے پہلے تو ہر طرف حضرت گنگوہی اور مدرسہ ان دونوں اساتذہ کے خلاف خطوط لکھے اور عوام میں جھوٹی افواہیں پھیلائیں اور ان کو بدنام کرنا چاہا اور جب خطوط سے کام نہ چلا تو پریس سے پوسٹر چھپوا کر اطراف و جوانب میں بھیجے اور طرح طرح کی بے بنیاد افواہیں شب و روز پھیلانے میں مصروف رہے حضرت گنگوہی تو اپنے وطن میں تھے لیکن یہ دونوں حضرات دیوبند میں تھے اور ہر طرح کے حالات دیکھتے رہتے تھے اور جب افواہ شدت اختیار کر لیتی تو حضرت گنگوہی کو مطلع فرمادیتے، مسلسل تشویشناک خبریں ملنے کے باوجود ان دونوں حضرات سے فرمایا کہ ان کی خاک اڑانے سے کچھ نہیں ہوگا جب تک تم دونوں کا تعلق ہے اس وقت تک تم اپنے فرائض منصبی کو نہایت اطمینان سے ادا کرتے رہو اس میں غفلت نہ ہونے پائے۔

وہ مخلص تھے یا مفسد؟

جو لوگ دارالعلوم کو اپنے اختیار میں لینے کی سازش کر رہے تھے وہ مخلص تھے اور دین کی خدمت کے جذبے سے یہ کام کر رہے تھے یا فساد کی بنیاد ڈال کر دارالعلوم کو تباہ و برباد کرنا چاہتے تھے؟

اس حقیقت کا اظہار اس وقت ہوا جب وہ ہر طرح کی سازشوں میں ناکام ہو گئے اور ان کا کوئی حربہ کارگر نہیں ہوا تو انھوں نے حکومت یوپی کو درخواست دی کہ:

> "یہ مدرسہ نہایت خراب اصول پر چل رہا ہے، ان لوگوں کے خیالات بغاوت آمیز ہیں، اسی واسطے مدرسہ میں ولایتی کثرت سے رکھے گئے ہیں، اور ایک زمانہ میں مولوی رشید احمد نے تھانہ بھون کی بغاوت

میں شرکت کی تھی یہ ہمیشہ کے باغی ہیں، ان کی مسل نکالی جائے۔

بہتر تو یہ ہے کہ اس مدرسہ کو گورنمنٹ اپنے ہاتھوں میں لے لے اور اگر یہ منظور نہ ہو تو حاجی محمد عابد اس کے سرپرست مقرر کیے جائیں جن کو جشن میں شمس العلماء کا خطاب دیا گیا ہے۔(۱)

فتنہ پردازوں کا یہ حربہ انتہائی خطرناک تھا حضرت نانوتوی اس کے بانی تھے جن کی گرفتاری کا وارنٹ غدر ۱۸۵۷ء میں جاری ہوا تھا انگریزی گورنمنٹ ان کو گرفتار کر کے تختۂ دار پر چڑھانا چاہتی تھی، مگر وہ گرفتار نہ ہو سکے، حضرت گنگوہی اس جرم بغاوت میں گرفتار ہو کر چھ ماہ جیل میں رہے اور ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا مگر اسی دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی اور ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھ میں اقتدار آیا اور عام معافی کا اعلان ہوا تو یہ حضرات پھانسی کے پھندے سے بچ سکے۔

حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کو جب مخالفین کی اس درخواست کا علم ہوا تو انھوں نے سخت خطرہ محسوس کیا اور دل میں یہ خیال آیا کہ ہمارے اکابر نے برطانوی گورنمنٹ کو کبھی برداشت نہیں کیا ان کے خلاف انگریزی حکومت میں فرد جرم پہلے سے موجود ہے اگر اس درخواست کی مخالفین نے پیروی کی تو انگریزی حکومت انتقام لے سکتی ہے، حضرت گنگوہی کے لیے بھی خطرات ہیں اور دارالعلوم بھی تباہ و برباد ہو سکتا ہے یہ دونوں حضرات سخت پریشانی کے عالم میں گنگوہ حاضر ہوئے اور حضرت گنگوہی کو پوری صورت حال تفصیل سے بتائی، مگر عزم و عمل کے کوہ ہمالیہ کو باد صرصر کا کوئی جھونکا کہاں جنبش دے سکتا ہے، آپ نے قلندرانہ شان سے فرمایا کہ

ان کی حرکات مذبوحی سے کچھ نہ ہو گا جب اس وقت کچھ نہیں ہوا تو

---

(۱) حیات خلیل مصنفہ محمد ثانی حسنی، ص: ۱۶۴

اب کیا ہو سکتا ہے۔

دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی تر ست

وسوسے اور اندیشے

نئے مہتمم حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی صرف دو سال دار العلوم کا اہتمام سنبھال کر راہی ملک بقا ہو گئے، اب پچھلے فتنے دب چکے تھے لیکن اس عہدے کے شایان شان کسی شخصیت کی تلاش تھی جو دار العلوم کی ترقی کے لیے اخلاص کے ساتھ کوشش کرے اور ہر ایک کے لیے قابل قبول بھی ہو۔

اس سلسلہ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے سب سے پہلے حجتہ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے خلف ارشد مولانا حافظ احمد صاحب کا نام تجویز کیا اور حضرت گنگوہی کی خدمت میں اپنی یہ تجویز پیش کر کے خاموش نہیں رہے بلکہ موقعہ بہ موقعہ اس کی یاد دہانی بھی فرماتے رہے، حضرت گنگوہی اس رائے سے متفق تھے اور حافظ احمد صاحب کو منصب اہتمام پر لانے کے بارے میں سرگرمی سے سوچ رہے تھے لیکن ہر کام ہر شخص کی منشا کے مطابق ہو جائے یہ ضروری تو نہیں، بعض لوگوں کی رائے مولانا خلیل احمد صاحب کی رائے کے خلاف تھی اور حافظ احمد صاحب کے بارے میں کچھ نامناسب باتیں بھی حضرت گنگوہی کے کان میں ڈال رہے تھے اور خود مولانا خلیل احمد صاحب سے بھی وہی رائے دینے والے کہتے تھے۔

"آپ سعی تو کر رہے ہیں مگر حافظ احمد صاحب کے مہتمم ہو جانے کے بعد آپ مدرسہ میں نہیں رہ سکتے، وہ آپ کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے جس نگاہ سے ان کے باپ نے آپ کے ماموں مولانا یعقوب

نانوتوی کو دیکھا۔(۱)

مولانا خلیل احمد صاحب نے مسکراتے ہوئے ان کی بات کا جواب دیا اور پورے عزم و ثبات اور اخلاص کے ساتھ صاف صاف کہا

"میں رہوں یا نہ رہوں، [illegible] کے زینے پر چڑھتا رہے، میرے لیے دوسرا دروازہ مفتوح ہوجائے گا یہ نہیں ہوسکتا کہ اپنی تنخواہ کے واسطے اس کی ترقی کا خیال چھوڑ دوں۔(۲)

حافظ احمد صاحب مہتمم ہوگئے

مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کے ایماء سے حضرت گنگوہی نے حافظ احمد صاحب کو مہتمم بنادیا اور حق بہ حقدار رسید کا مقولہ صادق آگیا، حافظ احمد صاحب پورے ۳۲ سال مہتمم رہے، حضرت گنگوہی کی وفات کے بعد ۲۴ سال مزید دارالعلوم کے اہتمام کو سنبھالا اور ٹھیک حضرت گنگوہی کی منشا کے مطابق دارالعلوم کو ترقی دینے میں مثالی کردار انجام دیا یہ حضرت گنگوہی کی فراست ایمانی تھی کہ ایسے شخص کو دارالعلوم کی ذمہ داری دی جو درحقیقت اس عظیم منصب کا اہل بھی تھا اور مستحق بھی، جس نے دارالعلوم کو کئی خطروں سے بچایا اور اس کو ازہر ہند کے بلند مقام تک پہونچانے کے لیے شاہراہ تیار کردی۔

---

(۱) تذکرۃ الخلیل از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص:۱۷۶

(۲) حوالہ مذکور

باب ۱۵

مظاہر علوم سہارنپور کی سرپرستی

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۱۲۹۷ھ کے بعد جو شخصیت مرکز نگاہ، سرچشمہ صلاح و فلاح اور مستحق قیادت بن کر منظر عام پر آئی وہ حضرت گنگوہی کی ذات گرامی تھی، کیوں کہ اس وقت کی تمام نمایاں علمی شخصیتیں علم و تفضل اور زہد و تقوی کے آسمان پر چاند سورج بن کر چمک رہی تھیں وہ سب کی سب اسی سرچشمۂ نور سے اکتساب فیض کرنے والی تھیں جیسے حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری اس دور کی ممتاز اور نمایاں شخصیتیں تھیں اور یہ سب حضرات حضرت گنگوہی سے بیعت، ان کے خلیفہ اور ان کے خدام میں شامل تھے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کان پور کے مدرسہ سے قطع تعلق کر کے تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ میں ضرور آچکے تھے اور بتدریج ان کی ذات مرجع خلائق بنتی جارہی تھی، وہ بھی حضرت گنگوہی کو اپنا بزرگ اور اپنا مربی تسلیم کرتے تھے سرخیل جماعت علماء حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری بھی ۱۲۹۷ھ میں محفل علم سونی کر کے تشریف لے جاچکے تھے، سہارنپور کی دوسری مشہور شخصیت مولانا فیض الحسن سہارنپوری (۱) پروفیسر

---

(۱) مولانا فیض الحسن سہارنپوری لاہور کے اورینٹل کالج میں پروفیسر تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بے تکلف ملنے والوں میں سے تھے، علامہ شبلی اور دوسرے اس دور کے بہت سے مشہور علماء کے استاد تھے عربی ادب کے اس وقت کے سب سے بڑے اور مشہور استاذ تھے آپ کی ادب کی مشہور کتابوں میں دیوان حماسہ دیوان متنبی سبعہ معلقہ، رسالہ اُم زرع کی شرحیں ہیں، عربی کا ایک رسالہ شفاء الصدور کے نام سے جاری کیا تھا جو ۱۸۷۵ء سے ۱۸۸۷ء تک جاری رہا، مظاہر علوم سہارنپور کی ترقی کے لیے وہ کوشاں تھے، سہارنپور میں ان کی ولادت ۱۸۱۶ء ۱۲۳۲ھ میں ہوئی آپ کی وفات ۱۳۰۴ھ - ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ (کاروان رفتہ ص: ۲۱۳)

عربی ادب اور ینٹل کالج لاہور بھی راہی ملک بقا ہو چکے تھے، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا تھا صرف حضرت گنگوہی کی ذات گرامی آفتاب و ماہتاب بن کر آسمان شہرت و عظمت پر چمک رہی تھی، وہی جماعت دیوبند کے مرکزی ادارہ دارالعلوم کے سرپرست تھے اور پوری جماعت کی نگاہیں آپ پر لگی ہوئی تھیں، ۱۳۱۴ھ میں آنکھوں کی روشنی ختم ہو جانے کی وجہ سے گنگوہ کا درس حدیث کا سلسلہ بند ہو چکا تھا اب صرف خانقاہ کی رونق قائم تھی، مختلف علاقوں کے تشنگان سلوک و معرفت گنگوہ کی حاضری کو اپنی سعادت سمجھتے تھے اور گنگوہ مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔

مظاہر علوم کو سرپرست کی ضرورت

دارالعلوم دیوبند کا نظام مستحکم ہونے کے بعد مظاہر علوم پر افتاد پڑی، جو شخصیتیں مظاہر علوم سہارنپور کے نظام کو اخلاص و للہیت کے جذبے سے چلا رہی تھیں وہ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں، ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی ایسی شخصیت مظاہر علوم کی سرپرستی کی ذمہ داری قبول کرلے جس کا حکم سب کے لیے قابل قبول ہو، سب ان کے علم و فضل، زہد و تقوی اور وسعت نظر پر کامل اعتماد رکھتے ہوں، اس نقطہ نگاہ سے جب نظر دوڑائی گئی تو صرف حضرت گنگوہی کی ذات گرامی اس بلند منصب پر فائز نظر آئی اس لیے قدرتی طور پر دینی تعلیم کے ہر بہی خواہ کی یہ تمنا بن گئی کہ حضرت گنگوہی مظاہر علوم کی سرپرستی منظور فرمالیں تو مدرسہ کے لیے فال نیک ہوگا، تاریخ مظاہر علوم کی جلد اول شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی کی مرتب کردہ میں اس موقع پر آپ نے تحریر فرمایا کہ

> ”ڈپٹی صاحب کے حادثہ انتقال کے بعد عامۃ القلوب اس طرف متوجہ ہوئے کہ مدرسہ کی خاص طور پر خبرگیری اور اعانت کی جائے

اسی ذیل میں اس طرف بھی توجہ ہوئی کہ مدرسہ کی تربیت عرصہ سے کسی اہل اللہ کے زیر سایہ نہیں ہے جس کی وجہ سے مدرسہ کی روحانی ترقی مسدود ہے اس بنا پر مرجع الکل قطب الارشاد، مجدد العصر حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہ کی ذات ستودہ صفات کی طرف دست التجا بڑھا اور حضرت کی خدمت میں سرپرستی قبول کرنے کی درخواست ممبران کی طرف سے پیش ہوئی، حضرت نور اللہ مرقدہ نے اس درخواست کو شرف قبولیت بخشا۔(۱)

حضرت گنگوہی نے ۹ر ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ کو اپنی منظوری کی اطلاع فرمادی۔

قدرت کے کرشمے

مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری دارالعلوم دیوبند میں مدرس دوم کے منصب پر تھے، انھوں نے عہدۂ اہتمام کے لیے حضرت حافظ احمد صاحب کے نام کی تحریک فرمائی تو کچھ لوگوں نے کہا تھا کہ آپ جن کو مہتمم بنارہے ہیں ان کے مہتمم ہونے کے بعد آپ دارالعلوم کے مدرس نہیں رہ سکیں گے، اس کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے اپنی مدرسی اور اپنی تنخواہ کی فکر نہیں، مجھے دارالعلوم کی ترقی عزیز ہے، میرے لیے اگر یہاں دروازہ بند ہو جائے گا تو خدا کوئی دوسرا دروازہ کھول دے گا، یہ فقرہ حالات و واقعات کے لحاظ سے الہامی فقرہ بن گیا، جس سال حضرت حافظ احمد صاحب مہتمم ہوئے اسی سال حضرت گنگوہی دارالعلوم دیوبند کے ساتھ ساتھ مظاہر علوم سہارنپور کے بھی سرپرست بنادیے گئے، حضرت گنگوہی نے سرپرستی قبول کرنے کے بعد سب سے پہلے مظاہر علوم کی علمی ترقی کے لیے ضروری سمجھا کہ اس کی صدارت تدریس

---

(۱) تاریخ مظاہر مرتبہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا، ج:۱، ص:۶۵

کے لیے مولانا خلیل احمد صاحب کو منصب صدارت پر بٹھادیا جاے
چناں چہ حکم نامہ مولانا موصوف کو پہونچا کہ آپ مظاہر علوم سہارنپور آجائیں
اور یہاں کے تعلیمی نظام کو سنبھالیں اس حکم نامہ کی تعمیل میں تاخیر کا کوئی
سوال ہی نہیں تھا ابھی مہتمم دار العلوم دیو بند نے اپنے عہدے کا چارج لے
کر کسی اقدام کا آغاز بھی نہیں کیا تھا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب
مظاہر علوم آگئے، دروازہ آپ نے خود بند کیا اور دوسرا دروازہ ان کے شیخ
نے از خود کھول دیا، حضرت گنگوہی کے حکم نامہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"... مدرسہ مظاہر علوم کی سرپرستی میرے ذمہ کی گئی ہے اور با مجبوری اس امر خیر کو گوارا کرنا پڑا چوں کہ ہر طرح اس مدرسہ کی نگرانی میرے ذمہ ہو گئی اس لیے اس وقت اس کی بہبودی اس ہی امر کو مقتضی ہے کہ آپ مدرسہ دینیہ سہارنپور کی مدرسی اعلیٰ قبول کر کے فوراً وہاں سے تشریف لے جائیں اہل دیو بند کو آپ کی مفارقت اگرچہ گوارا نہیں مگر بمقتضائے وقت یہی ضروری ہے۔ لہٰذا اس کی تعمیل میں توقف نہ کریں۔

(از گنگوہ بروز سہ شنبہ ۳ر جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ)

حضرت گنگوہی کی عظمت

حضرت گنگوہی کے سرپرستی قبول فرمانے کی وجہ سے ارباب انتظام کے دلوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، اور اسی سال بڑے پیمانے پر ایک جلسہ کا اہتمام کیا جب کہ مظاہر علوم کا یہ مزاج نہیں تھا، لیکن حضرت گنگوہی کی سرپرستی کے بعد جو اس کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہو رہا تھا اس لیے اس جلسہ کی ضرورت تھی اس جلسہ میں حضرت گنگوہی کی خدمت میں جو ہدیہ تشکر و امتنان پیش کیا گیا ہے اس کے لفظ لفظ سے روحانی مسرت جھلکی پڑتی ہے جیسے ارباب مظاہر علوم کو کوئی دولت بے بہا مل گئی ہے،

اس جلسہ میں اکثر اکابر علماء دیوبند موجود تھے بلکہ تعلیم جدید کے نمائندے نواب محسن الملک اور سید مہدی علی خاں بھی حاضر تھے اس جلسہ میں جو رپورٹ پیش کی گئی اس میں حضرت گنگوہی کا ذکر جن الفاظ میں ہے وہی قابل توجہ ہے، رپورٹ میں کہا گیا۔

"اگرچہ معنیً تمام مدارس دینیہ عربیہ کے حضرت پیشوائے شریعت مقتدائے طریقت، مخدوم العالم مولانا مولوی رشید احمد صاحب مداللہ ظلال برکاتہم مُربّی و سرپرست تصور کیے جاتے ہیں جن کے انفاس قدسیہ کی ہی برکت کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ مدارس باوجود اس قسم کے تغیرات اور حوادث کے اپنے فیض کے سرچشمہ سے عالم کو فیض پہونچا رہے ہیں لیکن اہل مشورہ مدرسہ ہذا نے ظاہر طور پر بھی یہ چاہا کہ حضرت مولانا مخدوم سلمہ اللہ تعالیٰ مدرسہ کی سرپرستی قبول فرمائیں اور مثل مدرسہ عربی دیوبند جملہ تغیرات عزل ونصب کو حضرت مخدوم سلمہ کی رائے پر منحصر کر دیا جائے اور حضرت سلمہ سے بہ الحاح اس کی التجا، استدعا کی، مولانا نے ان صاحبوں کی استدعا کو بطیب خاطر قبول فرمایا

لہٰذا اب یہ مدرسہ مثل مدرسہ دیوبند بالکل مولانا سلمہ کی رائے مبارک کا تابع ہے، حق جل وعلا شانہ، مولانا کو ہمیشہ ہمارے سر پر سایہ فگن اور عالم کو آپ کے فیوض ظاہری و باطنی سے بہرہ اندوز رکھے۔ آمین ثم آمین"

حضرت گنگوہی کا فیضان عام

دینی تعلیم کی تحریک کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وفات کے بعد اس تعلیمی تحریک کی رہنمائی و قیادت اور اس کو صحیح لائنوں پر جاری رکھنے اور ترقی کے مدارج طے کرانے کی ذمہ داری

حضرت گنگوہی پر از خود آ گئی اب حضرت گنگوہی دار العلوم دیوبند کے بھی سر پرست تھے اور مظاہر علوم سہارنپور کے بھی، یہی دونوں مدارس ان دنوں پورے ہندوستان میں ذہنی و فکری دینی و اصلاحی رہنمائی کا منصب سنبھالے ہوئے تھے، پورے ملک میں دین کی صحیح تعلیم اور مسلم معاشرہ کو صحیح اسلامی اصولوں پر چلانے کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر تھی، اور ان دونوں اداروں کی زمام قیادت و اختیار حضرت گنگوہی کے دست مبارک میں تھی، اس طرح ان دونوں مدارس کے ذریعہ پورے ملک میں حضرت گنگوہی کے دینی ذہن و مزاج اور اصلاح اُمت کے جذبے کی حکمرانی تھی، بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طرح حضرت گنگوہی کا علمی و روحانی فیضان پورے ملک میں جاری و ساری تھا، تنہا یہی ایک ذات گرامی تھی جو مرکز نگاہ تھی، شریعت و طریقت کی راہوں میں بس اسی ایک چراغ کی روشنی تھی آپ کی ذات منارۂ نور تھی جس سے ہر ایک اکتساب نور کر رہا تھا۔

معذوریاں سد راہ نہیں

حضرت گنگوہی کی سب سے بڑی معذوری آنکھوں کی روشنی کا ختم ہو جانا تھا، ۱۳۱۴ھ ہی وہ سال ہے جب سال کے آخر میں آپ کی بینائی رخصت ہو گئی، اتفاق سے اسی سال سے آپ پر ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھتا چلا گیا، لیکن دین کی تڑپ اور اصلاح امت کا بے پناہ جذبہ جو دل میں موج زن تھا اس نے ان تمام معذوریوں اور مجبوریوں کو نگاہ غلط انداز سے دیکھا اور اپنی سرگرمیوں کی رفتار کو کسی بھی لمحہ سست نہیں ہونے دیا بیعت ہونے والوں کا سلسلہ دراز سے دراز ہوتا چلا گیا، ہر طرح کے دینی مسائل میں پورے ملک کو آپ ہی کی رائے کا انتظار رہتا تھا اس لیے فتووں کا املا

کرانا مستقل ایک مصروفیت تھی خلفاء اور مستفیدین کے خطوط کا بھی ایک لمبا سلسلہ تھا ہر ایک کو اس کے حالات کے مطابق رہنمائی بھی فرمائی تھی، اوراد و وظائف کا جو معمول تھا اب اس میں مزید اضافہ ہو گیا اگرچہ گنگوہ کے باہر آپ کا سفر تقریباً بند ہو چکا تھا اور آپ خانہ نشین ہو چکے تھے لیکن فکر و نظر کی روشنی اور بصیرت کا نور دل و دماغ میں سب سے بڑا مشیر اور رہنما تھا، انھیں حالات میں زندگی کے ایام گذر رہے تھے کہ ۱۳۱۹ھ میں مظاہر علوم کا ایک فتنہ آپ کی راہ میں حائل ہو گیا۔

مدارس دینیہ کی مشکلات

ہمارے علماء و مشائخ کے تدبر و فراست کا کمال تھا کہ انھوں نے انتہائی نامساعد حالات میں اسلامی ہند میں اسلام کی بقاو تحفظ کی تدبیر کے طور پر مدارس دینیہ کا اجرا کیا تھا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے لیکن بد باطن اور ضمیر فروش جاہ پسند اور اغراض پرست افراد بھی اسی سرزمین پر بستے تھے جس سرزمین پر یہ مدارس علم دین کی روشنی پھیلا رہے تھے وہ ان مدارس کی راہ میں کبھی کبھی سدراہ بھی بن جاتے تھے۔

مظاہر علوم میں فتنہ پردازیاں

چھ سال قبل دار العلوم دیوبند میں ایک فتنہ کھڑا کیا گیا تھا محسوس یہ ہو رہا تھا کہ دار العلوم دیوبند کو اپنے مشن سے ہٹا دیا جائے گا حتی کہ انگریزی حکومت تک سے درخواست کی گئی کہ اس مدرسہ پر وہ خود قبضہ کر لے اسی سے اس فتنہ کی ہلاکت آفرینی کا اندازہ کیا جا سکتا تھا ابھی اس کی یاد تازہ تھی کہ مظاہر علوم سہارنپور میں بھی اسی نوعیت کا ایک فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مظاہر علوم کی مجلس شوریٰ میں دو طرح کے لوگ تھے، کچھ لوگ

دین پسند، علماء و مشائخ سے ربط و تعلق رکھنے والے، اسلام کی خدمت اور دینی تعلیم کے فروغ کا جذبہ رکھتے تھے، نیک اور مخلص اور دین دار تھے، اور صدق دلی سے مدرسے کی ترقی کے لیے کوشاں تھے، دوسرے وہ لوگ تھے جو صرف اپنا اعزاز، عزت و شہرت اور نام و نمود کی خاطر مدرسہ سے وابستہ تھے، مظاہر علوم کے صدر الاساتذہ مولانا خلیل احمد صاحب انتہائی ذہین و ذکی اور مردم شناس تھے، حق گو، اور بلا خوف لومۃ لائم صداقت و راست بازی کا اظہار کرنے والے تھے اس لیے ارکان کمیٹی اگر کوئی غلط فیصلہ کرتے تو آپ اس کی راہ میں حائل ہو جاتے یہ بات کمیٹی کے جاہ پسند افراد کو گراں گذرتی تھی اس لیے حضرت مولانا موصوف کے خلاف وہ ارکان فضا بنانے میں لگ گئے، اتہامات بہتانات اور افترا پردازی کی مہم نے مولانا موصوف کو دل شکستہ کر دیا، مخلص سے مخلص انسان کی بھی ایک محدود قوت ضبط و تحمل ہوتی ہے، جب طلبہ میں انتشار، بدتمیزی، اندر باہر افواہوں کا طوفان برپا ہو گیا تو مولانا موصوف نے اپنے شیخ و مربی اور مظاہر علوم کے سرپرست حضرت گنگوہی کے یہاں مفصل حالات لکھ کر بھیج دیے، آپ نے اس فتنہ کو فرو کرنے کے لیے اپنا فوری استعفا ضروری سمجھا۔

حضرت گنگوہی کا استعفاء

کاروان عمر اپنی آخری منزل کے قریب پہونچتا جا رہا تھا آنکھوں کی روشنی نے بہت پہلے ہی ساتھ چھوڑ دیا تھا، جسمانی کمزوری اور عمر کے تقاضوں کی وجہ سے چلنا پھرنا بھی دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا تھا، لقاء محبوب حقیقی کی گھڑی قریب آتی جا رہی تھی اس لیے شوق وصال کی آگ سینہ میں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی، ذوق عبادت، رجوع الی اللہ دل و

دماغ پر حاوی ہوتا جارہا تھا اس لیے ہنگامہ آرائیوں اور فتنہ پردازیوں سے طبعی تنفر شدید سے شدید تر ہوتا جارہا تھا اس لیے پہلی فرصت میں آپ نے اس سے یکسو اور کنارہ کشی اختیار کرنے ہی کو قرین مصلحت تصور فرمایا اور مظاہر علوم کی سرپرستی سے استعفاء کا فیصلہ فرمالیا، استعفاء کا مطلب کشتی کو طوفان میں گھرا ہوا دیکھ کر اُسے ڈوب جانے سے بے فکری نہیں بلکہ اس کی حفاظت اور ساحل تک پہونچانے کی تدبیر بھی پیش نظر تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ مجھ سے تعلق رکھنے والے جو عزم جواں اور ہمت بلند کے مالک ہیں وہ میدان میں آئیں اور کشتی کو طوفانی حوادث سے نکال کر ساحل کی طرف لے جائیں۔ ان کے بازوؤں میں طاقت ہوگی اور دماغوں میں روشنی، بادبان بدل دیا جاے اور نئے چپوار تیار کیے جائیں اور مضبوط ہاتھوں میں یہ چپوار آجائیں بس یہی تدبیر کشتی کو غرقاب ہونے سے بچاسکتی ہے، یہی سوچ کر آپ نے ارباب شوریٰ کے نام تحریر فرمایا:

> "بخدمت ارباب شوریٰ مدرسہ سہارنپور، بعد سلام مسنون اس عاجز کو آپ صاحبوں نے سرپرست بنایا تھا سو بندہ چھ سال تک رہا، اب آپ کے مدرسہ کی سرپرستی سے معذوری ہے لہٰذا استعفاء گذران کر امید معافی رکھتا ہے آپ صاحب بھی قبول فرماویں"

(بندہ رشید احمد عفی عنہ مورخہ ۲۹ر رجب ۱۳۱۹ھ)

استعفاء کی منظوری کے بعد

اغراض پرست کمیٹی پر چھائے ہوے تھے انھوں نے پہلی فرصت میں استعفاء منظور کرلیا ان کی خود غرضی کی راہ کا سب سے بھاری پتھر ہٹ گیا، یہ ان کی پہلی کامیابی تھی اور اب ان کا نشانہ حضرت گنگوہی کے خلیفہ مولانا خلیل احمد صاحب کی ذات گرامی تھی، جو مظاہر علوم میں

صدر الاساتذہ تھے، ان بدباطن اور خود غرض ممبران کے سامنے ہندوستان کے مشہور ترین غدار میر صادق کا مقولہ تھا جو اس نے سلطان ٹیپو کے خلاف غداری کر کے انگریزوں کو سلطنت خداداد میسور پر قبضہ کرایا تھا اس نے سلطان ٹیپو کے شہید ہو جانے کے بعد اس کے خاندان کا صفایا کرانے کا انگریزوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا:

"افعی کشتن و بچہ اش رانگاہ داشتن کار خردمنداں نیست"

مظاہر علوم کے بدخواہ ممبران نے اپنے پیر و مرشد میر صادق کے اسی قول کو پیش نظر رکھا، حضرت گنگوہی کا استعفاء رجب میں منظور کیا اور شوال میں محدث سہارنپوری کو جبراً برخاست کر کے اپنا راستہ صاف کر لیا، مظاہر علوم سے دونوں بزرگوں کا سایہ اٹھ گیا، ہما اڑ گیا زاغ و زغن مظاہر علوم پر چھا گئے۔

پورے شہر میں شورش پھیل گئی

مظاہر علوم کی مجلس شوریٰ میں اس کے خیر خواہ اور مخلص ممبران بھی تھے لیکن فتنہ پردازوں کے مقابلہ میں کمزور تھے لیکن انھوں نے صف آرائی نہیں چھوڑی اور مظاہر علوم کی حفاظت میں اپنی صوابدید کے مطابق جد وجہد کرتے رہے، اندیشہ یہ ہوا کہ دونوں فریق میں دست بدست جنگ نہ شروع ہو جائے محدث سہارنپوری کو حکم معزولی ملنے کے بعد حضرت گنگوہی کا حکم ملا کہ آپ مدرسہ کسی حال میں نہ چھوڑیں، ان نامساعد حالات میں بھی جب قدم قدم پر ذلت و رسوائی کا خطرہ تھا آپ نے شیخ کے حکم کے مطابق مدرسہ نہیں چھوڑا اور وہیں مقیم رہے، حضرت گنگوہی کا یہ بھی حکم تھا کہ سارے حالات سے مجھے مطلع کرتے رہیں، حضرت گنگوہی نے اسباب دنیوی سے صرف نظر کر کے اللہ کی بارگاہ میں فریاد پہنچائی کہ دعاء سحر گاہی میں خدا سے التجا کرتے رہے کہ ہم عاجز بندوں نے تیرے دین کی بقا کے لیے جو

کچھ ممکن تھا کیا اب اس کی حفاظت تو ہی کر سکتا ہے ہم بندے عاجز ہیں۔

مردے از غیب بروں آید...

جب شہر میں ہر طرف شورش بڑھی اور ہنگامہ پھیل گیا تو شہر کے انتظام کے ذمہ دار صاحب علی انسپکٹر نے امن و امان قائم کرنے کے ارادے سے اس فتنہ کو فرو کرنا اپنا فرض منصبی سمجھا، انسپکٹر بڑا سخت گیر اور تند مزاج مشہور تھا اس کے نام سے شہر کے سماج دشمن عناصر کانپ جاتے تھے جب شورش حد سے زیادہ بڑھ گئی تو وہ فورس کے ساتھ ایک دن یک بیک مدرسہ میں آگیا، یہاں اس نے دیکھا کہ ایک فرشتہ صورت بزرگ چند لڑکوں کو درس دے رہے ہیں، یہ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری تھے، مدرسہ میں سناٹا چھایا ہوا ہے، اس نے تمام ممبران کو بلایا اور دھمکی دی کہ آپ لوگ صلح کرلیں ورنہ انجام کے لیے تیار رہیں، اس کی شکل یہ ہے کہ آپ دونوں فریق کسی کو ثالث مان لیں، وہ جو فیصلہ کرے دونوں فریق اس کو تسلیم کریں۔ مظاہر علوم کے فتنہ پرداز ممبران حکام رس تھے اور ذی وجاہت تھے، انسپکٹر صاحب علی بھی ان کو جانتا اور پہچانتا تھا اس لیے ان ممبران نے ہی کہا کہ ہم آپ کو اور نسیم اللہ خاں مجسٹریٹ کو ثالث مانتے ہیں، مظاہر علوم کے ہوا خواہ اور خیر خواہ ممبران نے خاموش رہ کر بدرجہ مجبوری اپنی رضامندی کا بھی اظہار کر دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ ذی وجاہت ممبران صاحب علی انسپکٹر اور نسیم اللہ خاں مجسٹریٹ سے اپنی منشا کے مطابق فیصلہ کرالیں گے۔

ثالث کا فیصلہ

شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب تاریخ مظاہر میں اس موقع پر تحریر

فرماتے ہیں کہ :

"خدا کی رحمت اور مدد بارش کی طرح آئی اور تھوڑی دیر میں راستے کے سارے خس و خاشاک صاف ہو گئے اور جو حضرات کل تک صرف اپنی ممبری کے زعم میں حضرت کو مدرسہ سے علیحدہ کرنے پر مجبور کر رہے تھے وہ خود ہی برطرف کر دیے گئے (۱)

صاحب علی انسپکٹر اور نسیم اللہ خاں مجسٹریٹ کو جب دونوں فریق نے حکم مان لیا اور اقرار نامہ پر دستخط ہو گئے تو ان دونوں نے تجاویز سرپرستان کا رجسٹر منگوا کر اپنی تجویز تحریر کی اور مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی علیحدگی کو ناجائز رکھتے ہوئے اپنی تجویز لکھی:

"ہماری رائے میں اس مدرسہ کے سرپرست مولوی ذوالفقار علی دیوبندی اور مولوی اشرف علی تھانوی اور مولوی عبدالرحیم رائے پوری مقرر کیے جائیں تاکہ تعلیم و تقرر اور برخواستگی و ترقی و تنزلی مدرسان مدرسہ ان کی رائے سے ہوا کرے اور طریقۂ تعلیم کے وہ نگراں اور سرپرست رہیں اور دیگر روسا و عمائدین شہر بطور ممبر کے رہیں جو ترقی چندہ و انتظامات مدرسہ کے کوشاں رہیں (۲)

اس فیصلہ نے فتنہ پردازوں کا سارا نشہ ہرن کر دیا انھوں نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا، وہ سمجھتے تھے کہ حکام سے ہمارے روابط ہیں وہ ہماری منشا کے مطابق فیصلہ کریں گے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، قدرت کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں، حکومت کے کارندوں کی سازباز سے ایک دینی ادارہ کو تباہ و برباد کرنے کا ارادہ کرنے والوں کو انھیں ہمدردوں اور دوستوں کے ذریعہ ناکام بنا دیا گیا

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

---

(۱) تاریخ مظاہر، ج:۱، ص:۶۷

(۲) ایضاً، ص:۸۸

حضرت گنگوہی کی کرامت

حکم نے تین سرپرست تجویز کیے اور نام ان بزرگوں کے تجویز کیے جو حضرت گنگوہی کو اپنا شیخ و مربی اور اپنی جماعت کی سب سے محترم شخصیت تصور کرتے تھے، کچھ ہی دنوں کے بعد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادۂ محترم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی ان کی جگہ رکھے گئے، اس طرح سرپرستی کی ذمہ داری حضرت گنگوہی کے بجائے ان کے خلفاء کے کندھوں پر آگئی، اگر پدر نتواند پسر تمام کند، اس موقع پر شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب تاریخ مظاہر میں رقم طراز ہیں:

"ان ثالث حضرات سے بعض مخالف ممبران نے جو دنیاوی اعتبار سے بااثر اور ذی وجاہت تھے فیصلہ تحریر کرنے کے بعد دریافت کیا کہ تم نے یہ کیا کر دیا؟ ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہمیں کچھ خبر نہیں کہ ہم نے کیا لکھا، ہم نے جو فیصلہ تحریر کیا وہ اپنے اختیار سے نہیں لکھا بلکہ کوئی طاقت ہم سے لکھوا رہی تھی اور ہم اس کے کہنے پر مجبور تھے یہ حضرت گنگوہی کی کھلی کرامت ہے کہ حضرت سہارنپوری کو علیحدہ کرنے والے حضرات خود ہی علیحدہ ہو گئے۔"(۱)

یہ غیر مرئی طاقت ان کے ضمیر کی آواز تھی جو کبھی ظالم سے ظالم انسان کو سچ بولنے پر مجبور کر دیتی ہے، وہ تجربہ کار افسران تھے پچھلی کارروائیاں پڑھ چکے تھے سچائی کا سورج اتنا تابناک نگاہوں کے سامنے تھا کہ اس سے صرف نظر کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا اس لیے وہی لکھا جو حضرت گنگوہی اور ان کے متعلقین کی منشا تھی۔

حضرت گنگوہی کا یادگار کارنامہ

حضرت گنگوہی اپنی پیرانہ سالی، آنکھوں کی مجبوری کے باوجود

---

(۱) تاریخ مظاہر ج:۱، ص:۸۸

ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے نقیب تھے، دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور جو فتنہ پردازوں کے نرغے میں آکر تباہی وبربادی کی طرف بڑھ رہے تھے اور خطرہ تھا کہ اگر کوئی طاقتور ہاتھ ان دونوں اداروں کو تباہی کے اس راستہ سے ہٹا کر صراط مستقیم پر نہیں لگا سکا تو ان دونوں سرچشمہ ہدایت کا تباہ ہونا یقینی ہے۔ دنیا پرست، خود غرض اور بدباطن افراد ان کو دین کی خدمت کے بجائے دنیاوی مقاصد کا آلہ کار بنا کر رکھ دیں گے، قدرت کو حضرت گنگوہی سے یہ کام لینا تھا اور لیا، اس وقت پورے ملک کی نگاہیں حضرت گنگوہی پر لگی ہوئی تھیں، ان کے رفقاء کار ایک ایک کر کے سفر آخرت پر جا چکے تھے، تمام رفقاء کار کی ذمہ داری تنہا حضرت گنگوہی کے کندھوں پر آچکی تھی، لیکن دنیا نے دیکھا کہ اس ضعف پیرانہ سالی کے باوجود باطل اور فتنہ پرداز طاقتوں کا مقابلہ پوری جواں مردی سے کیا، محمد بن قاسم اور طارق بن زیاد کی خارا شگاف تلواروں کی کارکردگی کی طاقت مستعار لے کر سارے فتنوں کو پیروں سے روند کر پامال کردیا اور ان کا وجود مٹادیا اور دونوں اداروں کو مخلص اور قابل اعتبار بزرگوں کے ہاتھوں میں ان کی زمام اختیار دے کر ان کا مستقبل محفوظ کردیا۔

بعد میں ان دونوں اداروں نے پورے ہندوستان میں جس طرح مذہب حق کی وکالت کی، دین کی تعلیم، احکام شریعت اور اصولوں کو مختلف قسم کی آلائشوں سے پاک صاف رکھا، باطل قوتوں سے جس طرح ٹکر لے کر ان کو پسپائی پر مجبور کیا، یہ ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جانے والا کارنامہ ہے جو دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کی تاریخ کا روشن اور تابناک باب ہے۔

باب ۱۶

حضرت گنگوہی اور ان کے شیخ حاجی امداد اللہ تھانویؒ

مظاہر علوم سہارنپور کا قضیہ ۱۳۲۰ھ کی ابتداء میں طے ہوا اور حق پرستوں کو دلی سکون حاصل ہوا، اب حضرت گنگوہی جسمانی اعتبار سے انتہائی کمزور ہو چکے تھے آپ کی عمر ۷۶ سال کی ہو چکی تھی، ادھر پچھلے تین سالوں سے جو گذرے ہر طرح کے دنیاوی علائق سے یکسوئی بڑھتی جا رہی تھی، کھانے پینے، سونے جاگنے کے نظام میں تبدیلی ہو چکی تھی جسے آپ نے محسوس فرمالیا تھا کہ میں بہت جلد یہاں سے رخصت ہونے والا ہوں، ان تین سالوں میں ملک کے مختلف خطوں سے بیعت ہونے والوں کا سلسلہ بہت بڑھ گیا تھا، پہلے بہت انکار اور امتحان کے بعد جب طلب صادق پاتے تھے تب بیعت فرماتے تھے، اب یہ حال ہو گیا کہ جس نے درخواست کی آپ نے اس کو بیعت کر لیا، عبادتوں میں اضافہ اس قدر ہو گیا جیسے کسی دوسرے کام سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔

حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی کی وفات

حضرت گنگوہی کے شیخ و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا مکہ مکرمہ میں ۱۳۱۷ھ - ۱۸۹۸ء میں انتقال ہو گیا، اس حادثہ کا غم ان لوگوں سے پوچھئے جو کسی شیخ و مرشد سے وابستہ رہے ہوں، جس ذات سے نجات اُخروی کی راہ ملتی ہے، جس کی نگرانی سے قدم قدم پر معرفت

خداوندی کی دولت بے بہا حاصل ہوتی ہے ایسی بابرکت اور محترم ذات کا جدا ہو جانا بڑا ہی روح فرسا حادثہ ہے، حضرت گنگوہی نے اس حادثے کو کیسے برداشت کیا اس کے بارے میں حضرت گنگوہی کے سوانح نگار کا بیان ہے:

"جس وقت اعلیٰ حضرت کے وصال کی خبر وحشت اثر ہندوستان میں پہونچی اور حضرت امام ربانی کے کانوں میں پڑی اس وقت صدمہ سے جو حال ہوا وہ پاس رہنے والوں نے دیکھا.... کئی وقت آپ کھانا نہ کھا سکے نہ کسی سے بات کر سکے، مجمع میں بیٹھنا آپ کو گوارا نہ ہو سکا آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے، ہر چند آپ ضبط فرماتے مگر بے تاب ہو ہو جاتے تھے۔" (۱)

حضرت گنگوہی پر حضرت شیخ کا اعتماد

براہین قاطعہ اور انوار ساطعہ دونوں کتابوں کے معاملہ میں جو فتنہ برپا ہوا تھا اور حضرت حاجی صاحب کے کان بھرے گئے تھے، تو حضرت گنگوہی نے حضرت حاجی صاحب کو خط لکھ کر یہ تصدیق چاہی تھی کہ ہندوستان میں یہ افواہ اڑائی گئی ہے کہ ہمیں آپ کے حلقہ سے خارج کر دیا گیا ہے، اس کے جواب میں حضرت حاجی صاحب کا جو خط آیا تھا وہ اعلیٰ حضرت کے انتقال سے کچھ ہی پہلے آیا تھا، یہ حاجی صاحب کا حضرت گنگوہی کے نام آخری خط تھا حضرت حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی کو تحریر فرمایا کہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم، از فقیر امداد اللہ عفی عنہ بخدمت فیض درجت جامع شریعت و طریقت عزیزم مولانا مولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہی متع اللہ بطول حیاتہ ودمر اعداءہ، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ، مکتوب برکت اسلوب مورخہ چہاردہم رمضان

(۱) تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص: ۱۸۷

شریف بدست مولوی ممتاز علی صاحب ورود سرور لایا، ممنون و مسرور ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کو بہ ایں عنایت و محبت مکروہات دارین سے محفوظ رکھ کر کونین میں درجات عالیات قرب و رضا عطا فرمائے، مولانا! آپ کی تحریر باعث انشراح قلب و موجب جمعیت خاطر فقیر ہے اس لیے آرزو ہے کہ ہمیشہ اپنی خیر و عافیت و حالات ظاہر و باطن وغیرہ سے مسرور و مبتہج فرماتے رہو۔

آپ کے اس خط کے ہر لفظ اور فقرہ سے عجب کیفیت و شگفتگی پیدا ہوئی، اے وقت تو خوش کہ وقت ناخوش کردی، مولانا! ضیاء القلوب میں جو کچھ آپ کی نسبت تحریر ہے وہ آپ سے نہیں لکھا گیا ہے جیسا القاء ہوا ہے ویسا ہی ظاہر کیا گیا ہے پس بدیہیات کو نہ ماننا اور اپنے ذریعہ نجات و وسیلۂ فلاح دارین سے علیحدگی اختیار کرنا سخت جہالت و محرومی و ادبار ہے، خارج کرنا چہ معنی، فقیر تو تم علماء صلحاء کی جماعت میں اپنا داخل ہو جانا موجب فخر دارین و ذریعہ نجات و وسیلۂ فلاح کونین یقین کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بھی یہی دعا ہے کہ تم صالحین کی محبت میں جلاوے و مارے وہ شخص مُدبَّر ہے جو تم مقدس و مقتدائے زماں سے کچھ دل میں کینہ یا سوء ظن یا بد عقیدگی یا عداوت و رنج رکھے، فقیر تو آپ کی سب حرکات و سکنات و اقوال و افعال کو منبع حسنات و برکات و موافق شریعت و طریقت سمجھتا ہے اور کل اُمور میں مخلص و صادق یقین کرتا ہے،... اس لیے فقیر نے مسائل مختلف فیہا کے باب میں کوئی آپ کی تحریر دیکھی نہ پڑھی نہ اس کی تفتیش کی غرض کیا ہے کیوں کہ فقیر تو آپ کے سب اقوال کو موافق شرع جانتا ہے اگرچہ بعض مسائل میں موافق نہ سہی اور اس اختلاف کو صحابہ کا اختلاف سمجھتا ہے اور آپ کے ہر قول کی تاویل و توجیہ میرے دل میں نہایت جمعیت بخش و تسلی دہ ہے۔(۱)

---

(۱) تذکرۃ الرشید، ج: ۲، ص: ۱۸٦-۱۸۷

حضرت گنگوہی کا اضطراب

اختلاف و شکایت کے پورے دور میں جو دل پر غم و فکر کے بادل چھائے ہوئے تھے اس خط کے آتے ہی وہ سب چھٹ گئے تھے اور یہ یقین حاصل ہو گیا کہ جس کے ہاتھوں میں ہاتھ دیا ہے اس کا دل ہماری طرف سے صاف ہے کیوں کہ اس کے بغیر اس کا فیضان معرفت مسدود ہو جاتا ہے اور یہ بہت بڑی محرومی تھی، یہ خط جس سے شیخ و مربی کا کامل اعتماد ظاہر ہوتا ہے وہ غمزدہ دل کے لیے نسخۂ شفا ثابت ہوا مگر کیا معلوم کہ یہ خط وصیت بن جائے گا اور شیخ کی جدائی کا نقطۂ آغاز ثابت ہو گا، مستقبل میں ازدیاد التفات کی بے پناہ مسرتوں کے حصول کی اُمیدیں پیدا ہوئیں تو وہ چمن ہی اجڑ گیا جس میں بہار آنے کو تھی اسی لیے حضرت گنگوہی پر حضرت حاجی صاحب کے حادثہ وفات کا صدمہ دو چند ہو گیا، آپ کے سوانح نگار بتاتے ہیں کہ مدتوں یہ کیفیت رہی۔

"جب مجلس میں اعلیٰ حضرت کا تذکرہ ہوتا یا کوئی نووارد مہمان تعزیت کے کلمات کہتا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور بے چین ہو جاتے تھے... یہاں تک کہ آپ کی یہ حالت دیکھ کر واقفین و حاضرین نے اس تذکرہ سے احتیاط کر لی جو نووارد یا اجنبی شخص آتا اس کو پہلے ہی منع کر دیا جاتا کہ اعلیٰ حضرت کے وصال پر ملال کا ذکر مذکور نہ فرماویں۔(۱)

---

(۱) تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۱۸۸

باب ۱۷

حیات مستعار کا آخری سال

حضرت گنگوہی کی جسمانی کمزوری روز افزوں تھی، اسفار بالکل بند ہو چکے تھے اب آمد و رفت خانقاہ اور مسجد کے دائرے میں محدود ہو کر رہ گئی تھی طالبین سلوک کو بیعت کر لیتے، توبہ کرا دیتے اور تعلیم و تلقین فرما دیتے تھے، عمر شریف کا آخری سال چل رہا تھا اب حیات مستعار کے بہت مختصر ایام رہ گئے تھے کہ بھوپال ریاست کی حکمراں سلطان جہاں بیگم کی بیعت کے لیے عرض داشت آئی۔

بھوپال کی ریاست ایک باوقار مسلم ریاست تھی جس کی حکمراں ہمیشہ بیگمات ہوتی رہیں۔ اس ریاست کی خصوصیت یہ تھی کہ اس پر دین و شریعت کی چھاپ ہمیشہ رہی نواب سلطان جہاں بیگم بھی اسی حکمراں سلسلہ کی خاتون تھیں ولی عہدی کے دور میں بھی وہ مذہبی رجحان اور دین و شریعت کے تقاضوں پر عمل کرنے والی خاتون تھیں جب وہ حکمران ہو کر تخت حکومت پر بیٹھیں تو کسی بزرگ سے بیعت ہونے اور تزکیۂ نفس کا جذبہ شدید ہو گیا، مرشد کی تلاش میں ان کی نگاہ انتخاب حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی پر پڑی، مگر وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، انھوں نے ان سے منسلک ہونا چاہا، لیکن حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ۱۳۱۷ھ میں انتقال ہو گیا، دل کی یہ آرزو دل ہی میں رہ گئی اور دل کے ایک گوشے میں سالوں پڑی رہی آخر ایک

دن آپ نے اپنے دربار کے علماء سے دریافت کیا کہ اس وقت ہندوستان میں ایسے کسی مرشد ومربی کی نشاندہی کریں جن سے بیعت کر کے دلی سکون حاصل ہو، ریاست بھوپال کے قاضی القضاۃ قاضی محی الدین مراد آبادی نے مشورہ دیا کہ اس وقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی حضرت حاجی صاحب کے اجلہ' خلفاء میں ہیں اور خود حضرت حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی کے بارے میں بہت بلند کلمات ارشاد فرمائے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کو میری جگہ سمجھو، ان کی ذات آج کے زمانہ میں مرجع خلائق ہے۔

مراسلت کا سلسلہ

نواب سلطان جہاں بیگم نے ریاست کے میر منشی منصب علی صاحب کو حکم دیا کہ حضرت گنگوہی سے بذریعہ خط اجازت طلب کریں اور میری طرف سے درخواست بھیج دیں، میر منشی نے حسب الحکم ایک عرض داشت لکھی کہ والیہ' بھوپال آپ کے دامن بیعت سے وابستگی کا ارادہ رکھتی ہیں اور جواب باصواب کی اُمید رکھتی ہیں اور اجازت کی طالب ہیں۔

حضرت گنگوہی نے جواب خط میں تاخیر فرمائی تو یاد دہانی کے لیے دوسرا خط آنے پر حضرت گنگوہی نے جواب تحریر فرمایا، یہ جواب علماء ومشائخ کے لیے نمونہ' عمل ہے، اس لیے یہ جواب نقل کر رہا ہوں آپ نے تحریر فرمایا کہ:

۱۰۔ از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

عنایت فرمائے برحال بندہ! بعد سلام مسنون اور سلام مطالعہ فرمایند، بندہ بخیریت ہے آپ کے لیے دست بدعا ہے آپ کا عنایت نامہ مشتمل بر استدعاے بیعت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کئی روز ہوے آیا تھا مگر چوں کہ بتقاضاے سبق و بوجہ عروض

عوارض مختلفہ میری طبیعت مضمحل رہتی ہے نیز دربارۂ تحریر جواب مجھے تردد بھی تھا اس لیے تحریر جواب کی ہنوز نوبت نہ آئی تھی کہ آپ کا دوسرا عنایت نامہ بغرض تقاضائے جواب آگیا اس لیے اب جواب لکھ رہا ہوں کہ بیعت دو وجہ سے کی جاتی ہے۔

ایک تو بغرض تحصیل نسبت و حصول برکات طریقت اس کے لیے ایک مدت دراز مرشد کے پاس رہنا ضروری ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نہ میں وہاں آسکتا ہوں نہ بیگم صاحبہ کی یہاں تشریف آوری مناسب ہے اور بدون اس کے بیعت بے کار ہے۔

دوسری بیعت بغرض شرکت و تعلق بزرگاں، جس میں محض دخول سلسلہ ہوتا ہے اور اس کو اول تو بندہ کچھ مفید نہیں جانتا دوسرے اس وجہ سے رئیسہ دام اقبالہا کو جو میرے حال پر نظر عنایت و توجہ اور التفات ہو گی اس سے مجھے سخت ندامت ہو گی، نیز اس کی شہرت سے اہل حاجات بھی بندہ کو روز روز تنگ کریں گے جن میں سے کسی کی سعی و سفارش مناسب ہو گی کسی کی غیر مناسب پھر یہ کہ جب رئیسہ دام اقبالہا کو میرے ساتھ محبت و اخلاص ہے تو یہ تعلق و اتحاد حاصل ہے بایں ہمہ اگر اصرار ہو تو دو شرط سے مجھے منظور ہے ایک یہ کہ میرے ساتھ قدیمی برتاؤ میں کوئی تفاوت نہ آوے اور میرے ساتھ کسی قسم کی مروت و احسان نہ ہو، اور دوسرے یہ کہ اس امر کا اظہار نہ ہو۔

اگر یہ دونوں امر منظور ہوں تو میں ان کی بیعت اس امر پر قبول کرتا ہوں کہ اتباع سنت اور اجتناب بدعت کو اپنا شعار رکھیں، حق پرستی و عدل گستری انصاف سے رعایا پروری میں مصروف ہوں۔ والسلام"

شانِ استغنا

اس جواب کے لفظ لفظ سے جو استغنا و بے نیازی ظاہر ہوتی ہے وہی

اہل حق مشائخ اور بزرگوں کا طرۂ امتیاز ہے یہی ان کے مقام بلند کا نشان ہے کسی بھی حکمراں کے حلقہ بیعت میں آجانے کے بعد شیخ کو دنیاوی منفعت کے جو امکانات پیدا ہوتے ہیں اس سے احتراز اور اس کا سد باب ہی اخلاص و کمال کی کسوٹی ہے، حضرت گنگوہی نے دنیاوی مفادات کو آپ کے قدموں کو چومنے کے لیے آگے بڑھنے سے پہلے اس کے سارے راستے بند کرنے کا اہتمام ہی نہیں فرمایا بلکہ بطور شرط تحریر فرمادیا کہ اگر شرط منظور ہے تب بیعت ممکن ہے۔

آج بہت سے مشائخ کے حالات کی جستجو کریں تو بسا اوقات آپ کو یہ حیرت ناک تجربہ ہوگا کہ جس شہر میں مریدین ہیں جو سب سے زیادہ دولت مند ہوگا، شیخ کا قیام صرف وہیں ہوگا، سلوک و معرفت کی راہ کی یہ سب سے گہری کھائی ہے اگر شیخ خندق سے الگ ہو کر اپنی راہ نہیں بناتا اور اسی راہ پر چلتا ہے جس میں یہ خندق واقع ہے تو یقین کر لیجئے کہ اس کا انجام بخیر نہیں ہے۔

حکمراں افراد کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتے اگر ان کی دلی منشا کے خلاف ایک معمولی بات بھی ہو جاتی ہے تو ان کی پیشانی پر بل آجاتا ہے، تواضع و انکسار اس طبقہ کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے، حضرت گنگوہی نے بیگم بھوپال کی درخواست بیعت کو جس شان استغنا سے قبول کرنے سے انکار فرمادیا یہ وہی کر سکتا ہے جس کے دل و دماغ کو عشق الٰہی اور تعلق مع اللہ کے جذبے نے سارے دنیاوی خدشات سے پاک صاف کر دیا ہو۔

اس جواب کے بعد مشاہدات و تجربات کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ بیگم بھوپال نے بیعت ہونے کا خیال دل سے نکال دیا ہوگا، لیکن جو لوگ بھوپال کے حکمراں خاندان کے حالات سے واقف نہیں ہیں وہی یہ

بات سوچ سکتے ہیں اس خاندان کی حکمرانی ہی دین و شریعت پر عمل آوری کے صدقے میں ہے اس خاندان میں ہر ہر فرد کا حافظ قرآن ہونا ضروری رہا ہے اوراد و وظائف کی پابندی بھی اس خاندان کی ایک بڑی خصوصیت رہی ہے، چوں کہ یہ خاندان افغانی النسل ہے اس لیے دینداری ہی نہیں اہل سنت والجماعہ کے مسلک پر سختی سے کاربند رہا ہے انھیں خصوصیات کی وجہ سے اس خاندان کے افراد جانتے ہیں کہ شیخ و مرشد وہی ہو سکتا ہے جو دنیاوی مفاد کو حقارت کے پاؤں سے ٹھوکر مار دیتا ہے، اس لیے نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ نے اس جواب باصواب کے بعد اپنا جواب لکھوا کر قاضی بھوپال مولانا محی الدین صاحب مراد آبادی کو براہ راست گنگوہ حضرت گنگوہی کی خدمت میں بھیجا کہ طالب مطلوب کے پاس چل کر جاتا ہے سالک کے لیے شیخ کے حکم کی تعمیل واتباع ضروری ہے۔

بیگم بھوپال نے اپنا وکیل و سفیر قاضی بھوپال کو بنا کر گنگوہ بھیجا ان کے ساتھ بیگم صاحبہ کے دستخط اور مہر سے مزین جواب تھا جو ایک بادشاہ کا ایک فقیر گوشہ نشین کے نام تھا طلب صادق کے اس نمونہ کو ملاحظہ فرمائیں، بیگم بھوپال لکھتی ہیں:

"بجناب فضائل مآب حقیقت انتساب حضرت مولانا رشید احمد صاحب دام فیوضہ بعد سلام سنت الاسلام انجاح مرام آنکہ مکرمت نامہ سامی میرے منشی سید منصب علی کے نام صادر ہوا اس کے جواب میں منصب علی کا عریضہ اور مولوی محی الدین احمد صاحب قاضی ریاست حاضر خدمت سراپا برکت ہوتے ہیں، میرا مدعا منصب علی کی نگارش اور قاضی صاحب معزز کی زبانی گذارش سے مبرہن خاطر عاطر ہوگا۔

امید کہ انشاء اللہ تعالیٰ فیضان والا سے ضرور مستفید ہوں گی باقی والسلام مع الاکرام فقط۔

مورخہ دوئم ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ (مہر)

بیعت کا پس منظر

بیگم بھوپال سلطان جہاں بیگم اسی سال سفر حج سے واپس آئی تھیں، واپسی کے بعد بیعت ہونے کا دل میں شدید داعیہ پیدا ہوا، یہ حج مبرور و مقبول کی علامت تھی طہارت نفس میں حج معرفت الٰہی کے نتیجہ میں ایک عاشقانہ عبادت ہے اگر یہ عبادت مقبول ہو جائے تو دل و دماغ کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ کار خیر میں تیز روی آجاتی ہے کچھ ایسا ہی حال بیگم صاحب کا بھی تھا۔ سفر حج سے واپسی کے بعد فوراً بیعت کے لیے سلسلہ جنبانی ہوئی اور جب تک بیعت قبول نہیں کی گئی تب تک دل کو سکون حاصل نہیں ہوا، شاید اس کے پس پشت یہ حقیقت بھی کار فرما ہی ہو کہ حضرت گنگوہی بہت جلد اس دنیا سے رخت سفر باندھنے والے ہیں اس لیے تاخیر باعث محرومی ہوتی اور کلک قدرت نے بیگم صاحبہ کے مقدر میں حضرت گنگوہی سے بیعت لکھ دی تھی اس لیے بہ عجلت تمام یہ کام پایہ تکمیل کو پہونچا، ۶/ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ کو حضرت گنگوہی نے بیعت منظور فرمائی اور قاضی بھوپال یہ خوش خبری لے کر بھوپال واپس گئے اور اس کے دو ماہ بعد ۸/ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ کو حضرت گنگوہی سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

باب ۱۸

زندگی کے آخری ایام اور سفر آخرت

نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال کی بیعت کا واقعہ حضرت گنگوہی کی زندگی کے بالکل آخری ایام کا واقعہ ہے، عمر طبعی کو پہونچ جانے کی وجہ سے قوی میں اضمحلال فطری تھا، مزید مجبوری یہ تھی کہ ۱۳۱۴ھ سے بینائی ایک دم ساتھ چھوڑ چکی تھی، لاٹھی کے سہارے گھر سے خانقاہ اور خانقاہ سے مسجد تشریف آوری ہوتی تھی، چوں کہ خدام کی ایک جماعت خانقاہ میں ہمیشہ رہتی تھی اس لیے حوائج ضروریہ کی انجام دہی میں کچھ زیادہ دشواریاں نہیں ہوتی تھیں، عوارض جسمانی سے خدا نے آپ کو محفوظ رکھا تھا، کسی طرح کا کوئی عارضہ لاحق نہیں تھا صرف عمر کے لحاظ سے جو ضعف نقاہت اور کمزوری تھی وہی رہی، بستر علالت پر آپ ایک دن کے لیے بھی نہیں لیٹے، عمر کے آخری لمحات تک خانقاہ سے مسجد تک تشریف آوری اور نماز کی امامت جاری تھی، ہر دم کان اذان کی طرف لگائے رہتے تھے، خدام کے دلوں میں بھی کبھی کوئی کھٹک نہیں پیدا ہوئی، کیوں کہ کسی بیماری یا کسی تکلیف کی کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

زندگی میں آخری بار عیدگاہ تشریف آوری

جس سال آپ کا وصال ہوا اس سال عید گاہ جا کر نماز بھی پڑھائی اور خطبہ بھی دیا، وہ منظر ناقابل فراموش بن گیا اور حضرت گنگوہی کے ادب

واحترام اور عظمت و مقبولیت کا مظہر بھی جب آپ پالکی پر سوار ہو کر عید گاہ کے لیے چلنے پر تیار ہوے تو اس پالکی کو اٹھانے والے حضرت گنگوہی کے خلفاء، صلحاء مشائخ اور عابد و زاہد افراد کی مقدس جماعت تھی اور ہر شخص کاندھا دینے کے لیے آگے بڑھتا، دھکے کھاتا لیکن حضرت گنگوہی کی پالکی کو کاندھا دینا اپنی سعادت تصور کرتا تھا اور ہر ممکن کوشش کرتا تھا کہ چند منٹوں ہی کے لیے سہی پالکی کو کاندھا لگادوں، اس طرح آپ عید گاہ تشریف لے گئے اور اسی ادب واحترام سے علماء و مشائخ کے کاندھوں پر سوار ہو کر خانقاہ واپس تشریف لائے، یہ حضرت گنگوہی کی محبوبیت کا بڑا دلکش منظر تھا۔

گزندپا کا حادثہ

آپ حسب معمول خانقاہ میں قیام پذیر تھے، فجر کی سنتیں ادا کر کے جماعت کے وقت مسجد تشریف لائے اور فجر کی نماز پڑھائی، نماز سے فراغت کے بعد جب آپ نے کھڑاؤں نکال کر بستر پر قدم رکھا تو کسی خادم کی نگاہ آپ کے پاؤں پر پڑ گئی تو دیکھا کہ پاؤں کی انگلیوں پر خون جما ہوا ہے فوراً لوگ اس جانب متوجہ ہو گئے، بستر دیکھا گیا تو اس پر بھی خون کے کچھ کچھ دھبے تھے، ایک خادم نے فوراً مسجد میں جا کر مصلی دیکھا تو وہ خون میں تر تھا یہاں تک کہ مصلی سے گذر کر اس کے نیچے والے قالین پر بھی خون کے اثرات تھے، یہ دیکھ کر خدام کو تشویش بڑھ گئی۔

دریافت کرنے پر حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ مجھے تو کوئی خبر نہیں اور اسی وقت جہاں زخم تھا ایک کاغذ کا پرزہ لے کر لعاب دہن لگا کر زخم پر چپکا دیا، آپ نے فرمایا کہ مجھے تو کسی موذی جانور کے کاٹنے کا احساس بھی نہیں ہوا، کب اور کہاں کاٹا، تفتیش اور تلاش و جستجو کے بعد یہ خیال مستحکم

ہو گیا کہ حضرت گنگوہی خانقاہ کے خلوت خانہ میں جو ہمیشہ نیم تاریک رہتا تھا اسی میں اوراد و وظائف، تہجد و نوافل ادا فرماتے تھے اس میں سانپ یا اور کوئی زہریلا جانور تھا جس نے فجر کی سنتیں ادا کرتے ہوئے ڈس لیا ہو گا نماز کی مشغولیت نے احساس نہ ہونے دیا اور زہر سریع التاثیر نہیں تھا اس لیے اس کے اثرات ظاہر نہیں ہوئے۔

حادثہ کے اثرات

لوگ مختلف الخیال تھے، کسی کا ذہن سانپ کی طرف گیا لیکن سانپ کے ڈسنے کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ فوری طور پر نمایاں نہیں ہوئے اس لیے کچھ لوگوں نے کہا کہ کسی دوسرے جانور نے کاٹا ہے بعض حضرات نے کہا کہ انگلیوں کے پاس کی ایک باریک رگ اس زخم کی وجہ سے کٹ گئی ہے اس لیے اتنی بڑی مقدار میں خون نکل گیا ہے چوں کہ حضرت گنگوہی نے اس حادثہ کو کوئی اہمیت نہیں دی اس لیے ایک دو دن کے بعد خدام نے بھی اس طرف توجہ دینی چھوڑ دی لیکن اس حادثہ گزند پا کے اثرات بعد میں مرتب ہونا شروع ہوئے۔ دوسرے دن سے ضعف اور کمزوری کا احساس بڑھنا شروع ہوا، اور نیند کا غلبہ ہونے لگا جو عام طور سے سانپ کے زہر کے اثرات ہیں، آپ اکثر وظیفہ پڑھتے پڑھتے لیٹ جاتے اور جوں ہی سر تکیہ پر رکھا غفلت کی نیند سو جاتے اور خراٹے سنائی دینے لگتے، جب مسلسل یہ اثرات ظاہر ہونے لگے تو خدام نے کیفیت مزاج پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ بدن میں بلغم کی زیادتی ہے جس کی وجہ سے نیند کا غلبہ ہے اور کوئی بات نہیں، حالانکہ چند دنوں قبل ایسا کچھ نہیں تھا۔

کمزوری اور ضعف اتنا بڑھ گیا کہ شب و روز اوراد و وظائف کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں رہ گیا تھا، اسی طرح بار بار نیند کا غلبہ جاری تھا یہ

حیرتناک بات تھی کہ نماز کے اوقات میں آنکھیں از خود کھل جاتیں اور فوراً دریافت فرماتے کہ اذان ہو گئی؟ آپ اُٹھ بیٹھتے، وضو فرماتے سنتیں ادا فرماتے اور خدام کے سہارے مسجد میں تشریف لاتے اور امامت فرماتے یہ سب علامات خطرے کی آگاہی تھیں لیکن حضرت گنگوہی کی بے نیازی کی وجہ سے علاج کا کوئی سلسلہ شروع نہیں ہوا، لیکن حادثہ کے اثرات اندرونی طور پر اعضاء رئیسہ کو مضمحل کرتے جارہے تھے لیکن ظاہری صورت حال کی وجہ سے کوئی تشویش نہیں تھی کہ ایک دن یک بیک حالت متغیر ہو گئی۔

حیاتِ مستعار کے چند لمحے

۲۷/جمادی الاول ۱۳۲۳ھ مطابق ۳۱/جولائی ۱۹۰۸ء یوم دوشنبہ کو آپ بعد نماز عشاء بستر پر تشریف لے گئے، خدام پاؤں دابنے لگے کہ لرزہ شروع ہو گیا، پھر اس کے بعد تیز بخار ہو گیا، یہ تپ لرزہ تھا، کچھ دیر کے بعد جاڑے کی شدت میں کمی آگئی مگر حرارت ۱۰۴ ڈگری پر تھی، پورا دن بخار کی شدت میں گذرا جو علاج گھریلو ہو سکتا تھا وہ کیا گیا۔ تیسرے دن بھی جب بخار میں کوئی کمی نہیں ہوئی تو صاحبزادۂ محترم جو سند یافتہ حکیم تھے، مولانا حکیم مسعود احمد صاحب نے پورے انہماک سے اپنا علاج شروع کیا، پانچویں دن جمعہ تھا اس دن حکیم محمد اسماعیل صاحب جو بمبئی میں رہتے تھے اتفاقاً وہ آگئے وہ تجربہ کار حکیم تھے اب انھوں نے دوائیں تجویز کیں اور ان کا علاج شروع ہوا۔

چوں کہ انگلیوں پر جہاں زخم تھا وہاں نیلگوں چھالے پڑ گئے تھے اس لیے عام طور پر یہ خیال ہوا کہ یہ سانپ کے کاٹنے کے اثرات ہیں اس کی بھی تدابیر اختیار کی گئیں، ایک بار کسی بدباطن نے سحر کیا تھا، سحر کا دفعیہ

کیا گیا، اس بار بھی شک گذرا، علاج معالجہ دعا، دوا کا سلسلہ جاری تھا، لیکن وقت موعود آچکا تھا، قدرت کو امام ربانی حضرت گنگوہی سے اپنے دین کی جتنی خدمت لینی تھی، لے چکی تھی، اس لیے یہ سارے مراحل سفر آخرت کی پہلی منزل کے طور پر تھے، پاؤں پر ورم بڑھتا چلا گیا اور اُوپر چڑھتا رہا یہاں تک کہ دس دن گذر گئے ۹ر جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ر اگست ۱۹۰۸ء کو جمعہ کا دن تھا، جمعہ کی اذان ہو چکی تھی ساڑھے بارہ بج چکا تھا کہ فرشتۂ اجل آگیا اور آپ ۷۸ سال ۷ ماہ ۳ یوم کی عمر میں سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

تاریخی مادّے

اکابر علماء و مشائخ میں سے تین بزرگوں نے جو تاریخیں نکالی ہیں چونکہ بہت معنی خیز ہیں اس لیے ان کو یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی جو حضرت گنگوہی کے خلیفہ تھے آپ نے ایک آیت سے تاریخ نکالی إنه فی الآخرة لمن الصالحین (۱۳۲۳ھ) حضرت گنگوہی کے دوسرے خلیفہ مشہور شیخ طریقت حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب رائے پوری نے اس جملہ سے تاریخ وفات نکالی کنت حمیدا لمتّ شهیدا (۱۳۲۳ھ) حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی نے اس جملہ سے تاریخ وفات بر آمد کی مولانا عاش حمیدا مات شهیدا (۱۳۲۳ھ) عارف کامل مفتی اعظم دار العلوم دیوبند مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی نے بھی تاریخ اس جملہ سے بر آمد کی وحیٌ دخل الخلد (۱۳۲۳ھ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حصہ دوم

اوصاف و کمالات اخلاق و عادات معمولات خدمات اور تصنیفات

باب ۱۹

اخلاق و عادات اوصاف و کمالات اور معمولات

حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کا قران السعدین منشاء الٰہی معلوم ہوتا ہے، تاریخ کے ایک انتہائی نازک اور خطرناک موڑ پر دہلی عربک کالج میں استاذ العلماء مولانا مملوک علی نانوتوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کے لئے دو نوعمر لڑکے ایک نانوتہ اور ایک گنگوہ سے پہونچے دونوں آبادیاں الگ الگ اور دور دور تھیں لیکن دہلی جا کر ان دونوں آبادیوں کے مطلع سے طلوع ہونے والے دو جگمگاتے ستارے مل گئے اور دو مبارک ستاروں کا ملنا روئے زمین پر بسنے والوں کے لئے باعث خیر و برکت بنتا ہے، تعلیم حاصل کرتے ہوئے دونوں کا آپس میں طالب علمانہ مباحثہ کرنا، گرما گرمی کا مظاہرہ کرنا، اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے لئے دلائل و براہین کے اسلحہ فراہم کرنا معرکہ آرائیوں کا یہ سلسلہ ایک ایسے شاندار مستقبل کی علامت تھا جو ابھی انسانی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔

دونوں حضرات سلسلۂ تعلیم مکمل کر کے ابھی کاروبار زندگی کے آغاز کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ ہندوستان کی فضا میں ایک زبردست اور ہولناک دھماکے کی پرشور آواز گونجی کہ لوگوں کے ہوش و حواس گم ہوگئے، خوف و دہشت سے آنکھیں بند ہوگئیں جب دل کچھ ٹھہر اور ہوش کی آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ اسلامی ہند کا سارا اثاثہ جل چکا ہے، ہر

طرف ویرانی ہر سمت ایک خوفناک سناٹا، مسجدیں ویران اسلامی مدرسوں کی عمارتیں زمیں بوس اور کھنڈر بن چکی ہیں، اسلام کی سر بلندی کے لئے سر فروشانہ جد و جہد کرنے والوں کی لاشوں سے زمین پٹی ہوئی اور ان کے مقدس خون سے دہلی کی سڑکیں لالہ زار بن چکی ہیں، یہ غدر ۱۸۵۷ء کا حادثہ تھا، حضرت نانوتوی کی عمر ۲۵ سال کی تھی اور حضرت گنگوہیؒ عمر کی اٹھائیسویں منزل میں تھے۔

فرشتۂ غیب نے دلوں میں القاء کیا کہ تخریب کے مرحلے گذر چکے میدان جہاد میں غزوۂ احد کے انجام کا سناٹا در آیا، اب تلواریں ہاتھ سے پھینک دو، تخریب کے بجائے اب قوم و ملت کی تعمیر کے مرحلے سامنے ہیں، قدرت نے تم دونوں کو اسی وقت اور اسی کام کے لئے پیدا کیا ہے، اٹھو اور اپنی اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالو۔

حضرت نانوتوی اسلامی ہند میں اسلام کے تحفظ قرآن و حدیث کے لاہوتی نغموں کو فضاؤں میں بکھیر کر نئی زندگی کی نئی توانائیاں پیدا کرنے کے لئے ازہر ہند دار العلوم دیوبند کی عمارت کھڑی کرنے لگے اور اپنے ساتھ اپنے دور کے تمام دور اندیش ذہین و فطین علماء کی صف بندی کر کے ان کو تعمیر ملت کے مشقت طلب کام میں لگادیا، زندگی کے اخیر لمحوں تک اس کی تعمیر و ترقی کے خاکے بناتے رہے اور ان میں جد و جہد کے خون سے رنگ بھرتے رہے اطراف و جوانب میں دینی تعلیم کے مراکز قائم کرتے رہے تاکہ دار العلوم دیوبند سے جو سورج طلوع ہو چکا ہے اس کی روشنی کو دور دور تک پھیلانے کے لئے ذیلی مراکز بن جائیں، ۱۲۹۷ھ میں حضرت نانوتوی علم و عمل کے اس کارواں کو مرتب و منظم کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکے تھے اور قدرت نے ان کو اپنے جوار رحمت میں بلا لیا تو حضرت گنگوہی نے امیر کارواں بن کر ۲۶ سالوں تک اس کی

رہنمائی فرمائی اور جب آپ نے اس خاکدانِ ارضی سے سفر آخرت اختیار فرمایا تو دین و شریعت کا دمکتا ہوا سورج نصف النہار پر آچکا تھا، تاریکیوں میں ڈوبا ہوا اسلامی ہند دین کی روشنی سے بقعۂ نور بن چکا تھا۔

قدرت جب اپنے کسی بندے کو اپنے کسی خاص کام کے لئے منتخب کرلیتی ہے تو اس کو ضرورت کے مطابق ان تمام صلاحیت واستعداد سے نوازدیتی ہے، جس کی اس کو جدو جہد کی راہ میں ضرورت ہوتی ہے، حضرت گنگوہی کی تفصیلی سوانح عمری پڑھنے سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ داعی کو اپنی دعوت کا ایک مثالی پیکر ہونا چاہئے تاکہ ساری دنیا دیکھ لے کہ جس زندگی کی ہمیں دعوت دیجاری ہے اس کا ایک مکمل نمونہ ہمارے سامنے موجود ہے، داعی کی شخصیت دوسروں کے لئے اسوۂ حسنہ بن جاتی ہے، حضرت گنگوہی کی شخصیت بھی قدرت نے اسی اصول پر تعمیر کی تھی ان کا زہد وتقویٰ، علم وفضل، معرفت وسلوک خشیت الٰہی، انابت الی اللہ، تعلق مع اللہ کے ساتھ ساتھ ذکاوت وفطانت دور اندیشی ومصلحت بینی، ادراک واحساسات کی ہمہ جہتی توانائیوں کا جوہر آپ کی ذات میں موجود تھا اور قدم قدم پر اس کا ظہور بھی ہوتا تھا آپ ایک طرف گنگوہ کی خانقاہ میں شیخ طریقت ،مرشد برحق کی نازک ترین ذمہ داریوں کو سنبھالے ہوئے ہزاروں بندگانِ خدا کو توبہ کرانے کی مہم میں لگے ہوئے ہیں اور جو صراطِ مستقیم پر آگئے ان کی تعلیم وتربیت کی جاں گسل ذمے داری سنبھالے ہوئے ہیں تو دوسری طرف علوم ظاہر کے مراکز دارالعلوم دیوبند مظاہر علوم سہارن پور میں بدباطن طاقتوں کے پیدا کردہ فتنوں کو بھی عزم وعمل کی تلواروں سے فتح کرتے جارہے ہیں ان تمام کاموں کے لئے جس ذہانت و فراست کی ضرورت ہے بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت گنگوہی کو قدرت نے بڑی فیاضی سے عطا فرمائی تھی۔

ذکاوت و فطانت

حضرت گنگوہی کے سوانح نگار ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک پریشان حال شخص حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے بیعت کی درخواست کی آپ نے فرمایا تم کو بیعت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس لئے میں بیعت نہیں کرسکتا، وہ رونے لگا لیکن آپ نے اس کو مجلس سے اٹھادیا اور اب اس نے حضرت گنگوہی کے خدام سے رورو کر خوشامدیں کرنی شروع کیں اور کہا کہ آپ لوگ میرے حال پر رحم کریں میری سفارش کردیں کہ حضرت مجھے بیعت فرمالیں، اس کی حالتِ زار دیکھ کر سفارش کرنے والوں نے سفارش بھی کردی مگر حضرت گنگوہی کے انکار کو اقرار میں نہ بدلوا سکے اور یہی فرمایا کہ میرے گھر سے اس کا کھانا نہیں آئے گا، اس کو یہاں سے نکال دو، اسکے باوجود وہ شخص نہایت بے تابی کے ساتھ اپنی تمنا اور اپنی آرزو کا لوگوں سے اظہار کرتا رہا اور بسا اوقات روتا رہتا تھا اس کی اس حالت پر قریب قریب تمام متوسلین کو ترس آجاتا تھا حتی کہ حضرت گنگوہی کے ایک مقرب ترین خادم نے اس کو اپنے گھر پر ٹھہرالیا اور اس کے ہر طرح کے آرام کا بندوبست کیا اور اس کو بیعت کرانے کا وعدہ کیا لیکن وہ اپنی سفارش میں کامیاب نہ ہوسکے بلکہ زجر و توبیخ کا سامنا کرنا پڑا تب ان کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی اور اس کا راز جاننے کی کوشش کی وہ ایک کتاب جزدان میں رکھ کر ہمیشہ اپنی گردن میں لٹکائے رہتا تھا ایک دن اس کو کتاب میں کچھ لکھتے ہوئے دیکھ لیا جب اس شخص کی نظر ان پر پڑی تو جلدی سے کتاب بند کر کے جزدان میں ڈال لیا اور گردن میں حمائل کر لیا میزبان کا شک قوی ہو گیا، جب وہ ایک دن بے خبری کی نیند سو رہا تھا تو بہت آہستگی سے اس کی جزدان نکالی اور کتاب کھول کر دیکھی

تو وہ کتاب نہیں وہ اس کی ذاتی ڈائری تھی جس میں وہ روزمرہ کی یادداشت لکھا کرتا تھا اس میں اس نے افسران بالا کو جواب تک رپورٹیں بھیجی تھیں اس کا بھی اندراج تھا ان تمام حقائق کا انکشاف ہوا تو ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی وہ محکمۂ سی. آئی. ڈی کا آدمی تھا، وہ حضرت گنگوہی کی ذکاوت و فطانت پر حیرت زدہ رہ گئے اور انکار بیعت کی وجہ از خود سمجھ میں آگئی۔

ایک نوجوان صالح

ایک بار ایک نام نہاد جوان صالح بزرگوں کی وضع کا لباس زیب تن کئے ہوئے تشریف لائے سلام و مصافحہ کے بعد مؤدبانہ بیعت کر لینے کی درخواست پیش کی، حضرت گنگوہی نے کچھ تامل فرمایا انہوں نے دوبارہ درخواست کی آپ نے نہایت ملائمت سے فرمایا آپ کسی اور کے پاس تشریف لے جائیں، مجھے کیا آتا ہے، آپ جیسے جیسے انکار فرماتے ویسے ویسے ان کا اصرار بڑھتا جارہا تھا آخر میں حضرت گنگوہی نے صاف انکار فرمادیا اور فرمایا میں بیعت نہیں کروں گا، اب اس کے بعد گفتگو کی گنجائش نہیں رہی، تو وہ مایوس ہو کر اداس شکل و صورت بنا کر مجلس سے اٹھے اور چلے گئے۔

کچھ دنوں کے بعد ڈاک آئی، مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی ایک ایک خط نکال کر آپ کو سناتے اور پھر رکھ دیتے، پھر ایک لمبا چوڑا خط اٹھایا اس کی چند سطریں سنائیں پھر سرسری نظر پورے خط پر دوڑائی تو دیکھا کہ پورا خط سب و شتم گالیوں اور ناشائستہ الفاظ سے بھرا ہوا ہے حضرت گنگوہی نے فرمایا سناؤ کیوں خاموش ہو گئے؟ انہوں نے عرض کیا حضرت! یہ تو مغلظات سے بھرا ہوا ہے حضرت گنگوہی نے فرمایا کیا یہ اسی شخص کا نہیں ہے جو چند دنوں قبل بیعت ہونے کے لئے آیا تھا اور تم نے اس کی سفارش کی تھی؟ اس کے دل میں جو تھا وہ اس کی زبان پر آگیا اور اس کے قلم نے اگل دیا۔

لطافت ذوق

حضرت گنگوہی کا ذوق لطیف حیرت انگیز تھا آپ کے ادراکات و احساسات اتنے طاقت ور تھے کہ آپ فوراً محسوس کر لیتے اور خدام حیرت زدہ رہ جاتے تھے خاص طور پر آنکھوں کی روشنی ختم ہو جانے کے بعد اس میں اور اضافہ ہو گیا تھا، آپ ۱۳۱۴ھ میں نابینا ہو گئے اور پھر پورے نو سال اس کے بعد زندہ رہے جب مکمل طور پر آپ کی آنکھوں کی روشنی جا چکی تھی، اس دور کا واقعہ ہے کہ ایک بار مولانا محمد یحییٰ صاحب اپنے بھتیجے مولانا محمد الیاس صاحب (بانیٔ تبلیغ) کو لے کر آئے اس وقت ان کی عمر نو دس سال کے قریب رہی ہوگی بھتیجے کو مجلس کے ایک کنارے چپکے سے بٹھا دیا تاکہ حضرت کو علم نہ ہو، جمعہ کا دن تھا اس دن خاص طور سے ملاقاتیوں کی کثرت ہوتی تھی، تھوڑی ہی دیر بعد حضرت گنگوہی نے گردن اٹھائی اور فرمایا کہ بچے کا سانس معلوم ہوتا ہے تب بتانا پڑ گیا کہ مولانا یحییٰ صاحب کا بھتیجا آیا ہوا ہے۔

اسی طرح کا ایک اور حیرت ناک واقعہ ہوا ایک بار بعد نماز مغرب نمبر دار فضل حق صاحب کا لڑکا اکرام الحق بھی لوگوں کے ساتھ حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوا آپ تو نظر سے معذور تھے آپ کو خبر نہ تھی کہ کون کون موجود ہے جب مجلس سے اٹھ کر مکان تشریف لے جانے لگے اور ادھر سے گذرے جہاں اکرام الحق بیٹھا ہوا تھا تو آپ وہاں ٹھہر گئے اور فرمایا کہ نمبر دار کی بو آرہی ہے تب لوگوں نے بتایا کہ حضرت نمبر دار کا لڑکا اکرام الحق ہے۔

ایک بار مسجد میں تشریف لے گئے فرش پر قدم رکھتے ہی فرمایا "مسجد میں گندھک کی بو کیوں ہے، لوگ حیرت زدہ ادھر ادھر تلاش کر رہے

ہیں کہیں کوئی چیز نہیں ملی، کچھ دیر کے بعد اس راز سے پردہ اٹھا کہ مسجد کے اندر جس سے چراغ جلایا جاتا تھا اسی کی یہ بو تھی، اس طرح کے متعدد واقعات ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔

ذوق لطیف

آپ کا ذوق بہت ہی لطیف تھا عبد الرحمٰن نام کے ایک متوسل چائے بناتے تھے، حضرت گنگوہی جب بھی چائے پیتے تو فرماتے کہ کچے پانی کا ذائقہ ہے انھوں نے ایک دن پانی کو خوب ابالا اور پانی بھاپ بن کر اڑنے لگا اسی پانی سے چائے بنا کر پیش کی، آپ نے ایک گھونٹ پی کر فرمایا پانی تو اب بھی کچا ہی ہے۔

ایک بار مہتمم دار العلوم دیوبند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب خانقاہ میں قیام پذیر تھے اور حضرت گنگوہی کے لئے وہی چائے بناتے تھے لیکن ہر بار یہی فرماتے تھے کہ کچے پانی کا ذائقہ ہے وہ بہت پریشان ہوئے یا اللہ کیا بات ہے پانی کو خوب جوش دیتا ہوں دودھ خوب ابال کر ڈالتا ہوں پھر بھی کچا پانی کیسا، آخر بہت غور فکر کے بعد پتہ چلا کہ جس پیالی میں چائے نکالی جاتی ہے وہ دھو کر خشک نہیں کی جاتی اس دن مہتمم صاحب نے پھر چائے بنائی پیالی دھو کر کپڑے سے خوب صاف کیا ذرا بھی نمی نہیں رہنے دی تب اس میں چائے انڈیل کر حضرت گنگوہی کو پیش کی آپ نے چائے پی تو فرمایا کہ آج کچے پانی کا ذائقہ نہیں ہے۔

مہمان نوازی اور اکرام ضیف

آپ کے یہاں بتدریج مہمانوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی سارے مہمانوں کا کھانا دونوں وقت آپ کے گھر ہی سے آتا تھا تین دروں کا جو

کمرہ آپ نے تعمیر کر لیا تھا وہی آپ کا مدرسہ تھا اور وہی مہمانوں کی قیام گاہ بھی اسی میں دستر خوان لگا دیا جاتا، آپ ہمیشہ مہمانوں کے ساتھ باہر ہی کھانا کھاتے تھے، لیکن جب آنکھوں سے معذور ہو گئے تب سے آپ گھر میں کھانا کھانے لگے باہر مہمانوں کے ساتھ نہیں بیٹھتے تھے، اس معذوری کے زمانہ میں بھی کبھی کبھی انکی تمنا کا اظہار ہوتا تو آپ ان کے ساتھ بھی شریک طعام ہو جاتے تھے۔

ایک بار حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری اور قطب وقت مولانا عبد الرحیم صاحب رائپوری اور حضرت حافظ قمر الدین صاحب تینوں حضرات حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے، کھانے کا جب وقت آیا تو حضرت گنگوہی کی درسگاہ سہ دری میں دستر خوان بچھا دیا گیا اور کھانا لا کر مہمانوں کے سامنے رکھ دیا گیا ان حضرات نے حضرت گنگوہی کے خادم خاص مولانا یحییٰ کاندھلوی سے فرمایا کہ مولوی یحییٰ! آج حضرت کے ساتھ کھانا کھلاؤ تو جانیں انہوں نے فرمایا بہت اچھا، یہ کون بڑی بات ہے اب اس لذیذ داستان کا آخری حصہ حضرت گنگوہی کے سوانح نگار کی زبانی سماعت فرمائیے۔

> ''مولوی یحییٰ اندر جا کر بیٹھے اور قلم ہاتھ میں لے کر اس طرح لکھنا شروع کیا کہ حضرت قدس سرہ نے محسوس کر لیا اور بولے کون مولوی یحییٰ؟ عرض کیا جی حضرت، آپ نے فرمایا کیوں تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟ کہنے لگے حضرت! کوئی کھانے بھی دے، یوں فرماویں کہ اگر حضرت کو ہمراہ کھلا رہے ہو تو کھا، ورنہ تو بھی اٹھ جا، حضرت امام ربانی نے مولوی یحییٰ کا یہ فقرہ سنا تو مسکرا کر یہ فرماتے ہوئے اٹھے
>
> ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر
>
> باہر تشریف لائے اور مہمانوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے (۱)

---

(۱) تذکرۃ الرشید، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، ج: ۲، ص: ۴۷۔

ضبط و تحمل

آپ میں ضبط و تحمل بہت تھا، کتنی ہی خلاف مزاج بات ہوتی مخالفین کی طرف سے کتنا ہی تکلیف دہ رویہ ہوتا ان کے خلاف کچھ کہہ کر اپنی زبان آلودہ نہیں کی "براہین قاطعہ" کی اشاعت کے بعد مبتدعین کی طرف سے سب و شتم کا جو طوفان اٹھا آپ کو علم ہوتا رہتا تھا کہ کس نے کیا بد زبانی کی لیکن آپ نے نہ کبھی غصہ کا اظہار فرمایا نہ ان کے لئے بد دعا کے الفاظ زبان پر آئے، بلکہ سب و شتم کرنے والوں کو حضرت کے خدام میں سے کوئی سخت لفظ استعمال کرتا تھا تو آپ اس کو سختی سے منع فرماتے، مولوی احمد رضا خان بریلوی کی جانب سے آپ کو بہت ہی ذہنی و روحانی اذیتیں پہونچیں شاید اتنی ذہنی اذیت اور کسی دوسرے سے نہیں پہونچی ہوگی، مگر ان کے بارے میں بھی آپ نے کوئی سخت لفظ نہیں استعمال فرمایا بلکہ جس زمانے میں مولوی احمد رضا خان صاحب کو جذام اور فساد خون کا عارضہ لاحق ہوا تو بعض متوسلین نے کہنا شروع کیا کہ علماء حق کو سب و شتم کرنے کا ثمرہ دنیا ہی میں مل گیا انہیں میں سے کسی نے حضرت گنگوہی کے سامنے کہا کہ مولوی احمد رضا خاں (۱) کوڑھی ہو گئے تو حضرت گنگوہی برہم ہو گئے کہ ایسی بات زبان سے نہیں نکالنی چاہئے اور ہدایت

---

(۱) مولوی احمد رضا خاں بریلوی ہندوستان کی مشہور ترین شخصیتوں میں سے ہیں ان کے والد کا نام مولوی علی نقی خاں تھا بریلی میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم حاصل کی انھیں کی جانب رضاخانی فرقہ منسوب ہے ان کی مشہور کتاب "حسام الحرمین" ہے جس میں علماء حق کی عبارتوں میں کتربیونت کر کے ان کو کافر ثابت کیا گیا ہے، اس کو خود ہی اردو سے عربی میں منتقل کر کے استفتاء کی شکل میں مرتب کیا اور حجاز جا کر مکہ و مدینہ کے علماء سے اس فتویٰ پر دستخط لیا ہے سیکڑوں رسالوں اور کتابوں کے مصنف ہیں انھوں نے اردو میں قرآن کا ترجمہ بھی کیا ہے وہ اردو کے قادر الکلام شاعر بھی تھے ان کی نظمیں شائع ہو چکی ہیں بریلی میں ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔ (کاروان رفتہ)

فرمائی کہ میاں! کسی کی مصیبت پر خوش نہیں ہونا چاہئے، خدا جانے کس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے۔

حضرت گنگوہی کے ایک شدید مخالف مولوی ہدایت رسول بمبئی میں رہتے تھے حضرت کی شان میں مغلظات لکھا کرتے تھے اس کی خبریں حضرت گنگوہی کو پہونچتی رہتی تھیں مگر سن کر آپ خاموش رہ جاتے تھے، ان کے خلاف کبھی کوئی لفظ اپنی زبان سے نہیں نکالتے تھے، انھیں مولوی ہدایت رسول کو یہاں عدالت نے اس جرم پر سزا دی ہے کہ اس نے ایک شادی شدہ عورت سے جب کہ اس کا شوہر موجود ہے شادی کرلی تھی، جیل جانے کی خبر سن کر بعض حاضرین کو اس لئے خوشی ہوئی کہ یہ حضرت گنگوہی کی شان میں بدزبانی کیا کرتا تھا، آپ کی زبان سے صرف یہی نکلا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غلط مسئلہ بتانے پر برہمی

مولانا محمد اسماعیل گنگوہی نے لال مسجد میں نماز پڑھائی اور باہر کی محراب صحن سے باہر کھڑے ہو کر نماز پڑھائی تو کسی نے کہا کہ محراب میں کھڑا ہونا جائز ہے، کسی نے کہا کہ حضرت گنگوہی نے بھی اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے مولانا اسماعیل صاحب حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تصدیق چاہی کہ آپ نے فتویٰ دیا ہے آپ کو غصہ آگیا کہنے والے کو فوراً بلوایا اور فرمایا

"میں نے کب فتویٰ دیا ہے؟ میری زندگی ہی میں مجھ پر بہتان باندھتے ہو؟(۱)

مسجد کے امام ایک حافظ صاحب تھے انھوں نے بھی مولوی اسماعیل صاحب سے کہا تھا کہ محراب میں کھڑے ہونے کی ممانعت نہیں ہے ایک

---

(۱) تذکرۃ الرشید ج ۲ ص ۴۳۔

دن وہ حافظ صاحب آئے تو آپ نے بیٹھتے ہی ان سے دریافت فرمایا

"کیوں جی! تم نے صلوٰۃ فی المحراب کا فتویٰ کہاں سے دیا؟ حافظ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت فلاں اردو کتاب میں لکھا ہے آپ نے ترش روئی کے ساتھ فرمایا، بس اپنی کتاب رہنے دو امام کو محراب کے اندر کھڑے ہو کر نماز پڑھانا خواہ محراب اگلی ہو یا پچھلی بہر حال مکروہ ہے (۱)

پیر جی محمد حسن صاحب ایک بزرگ تھے حضرت گنگوہی سے بیعت تھے ایک گاؤں میں رہتے تھے اور گاؤں کی مسجد میں امامت کرتے تھے ایک دن گاؤں والوں کے سامنے یہ کہہ دیا کہ جمعرات کو روحیں چھٹی پاتی ہیں اور وہ اپنے گھروں میں آتی ہیں، گاؤں کے کسی آدمی نے آکر حضرت گنگوہی سے یہ مسئلہ دریافت فرمایا اس وقت گاؤں کے پیر جی محمد حسن صاحب بھی مجلس میں موجود تھے، آپ نے سائل سے دریافت فرمایا، یہ مسئلہ کون بیان کرتا ہے؟ سائل نے کہا یہ پیر جی جو حضرت کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں انھوں نے ہی گاؤں میں بیان کیا ہے آپ نے پیر جی سے مخاطب ہو کر پوچھا تو انھوں نے عرض کیا کہ حضرت "مقاصد الصالحین" میں یہ لکھا ہے، حضرت گنگوہی نے برہمی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ ایسی غلط سلط غیر معتبر کتابیں دیکھ کر غلط مسئلے بتاتے ہو؟ سن لو آئندہ کبھی بھی کوئی بات ایسی نہ بیان کرنا جو معتبر ذریعہ سے نہ ملی ہو۔

منطق و فلسفہ کی کتابوں سے بیزاری

درس نظامیہ میں ابتداء عربی سے انتہا تک منطق و فلسفہ کی کتابیں نصاب میں شامل تھیں اور پڑھائی جاتی تھیں، ایک بار جب آپ دار العلوم دیو بند کے سر پرست تھے ارباب انتظام سے فرمایا کہ ان تمام کتابوں کو

(۱) تذکرۃ الرشید ج ۲ ص ۴۳۔

نصاب سے نکال دو، ان سے کوئی فائدہ نہیں البتہ گناہ کا احتمال ضرور ہے چنانچہ ایک سال یہ جملہ کتابیں نصاب سے نکال دی گئیں لیکن دوسرے سال پھر تمام کتابیں داخل نصاب کر دی گئیں منطق و فلسفہ کی کتابوں سے آپ کی نفرت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ آپ نے ایک بار فرمایا کہ میرا جو مرید یا شاگرد ان کا شغل رکھے گا وہ میرا مرید یا شاگرد نہیں۔

"اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی بہتر ہے کہ اس سے دنیا کے نفع کی امید ہے" (۱)

شائبہ بدعت پر برہمی

آپ نے پوری زندگی مشرکانہ عقائد اور بدعات کے خلاف جہاد کرتے ہوئے گذاری، مبتدعین کا نشانہ مولانا اسماعیل شہیدؒ دہلوی کے بعد حضرت گنگوہی کی ذات تھی، آپ نے جس مقام کو بطور خانقاہ اختیار فرمایا اور جس مسجد میں پنجوقتہ نمازیں ادا فرماتے تھے اور جہاں سہ دری بنوا کر آپ نے بطور درس گاہ اس کو استعمال کیا یہ سب شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب ہی تھے بلکہ ان کے دور میں بھی یہ خانقاہ تھی یہ محلہ سرائے کہا جاتا تھا اس آبادی میں شیخ زادوں کی بھی کثرت تھی وہ شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا عرس سالانہ خوب دھوم دھام سے کرتے تھے، حضرت گنگوہی اس کو بند کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے، ان کا ذریعہ معاش بن چکی تھی اس لئے وہ کسی قیمت پر بھی اس کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھے بلکہ اسی کی وجہ سے حضرت گنگوہی سے اندر اندر بغض رکھتے تھے اس کا مظاہرہ سہ دری کی تعمیر کے وقت ایک بار وہ کر بھی چکے تھے جب عرس کے دن آتے تھے تو اکثر آپ اپنے قدیم وطن رام پور چلے

(۱) تذکرۃ الرشید ج ۲ ص ۵۰۔

جاتے تھے اور کبھی کبھی گنگوہ میں بھی رک جاتے تھے لیکن اپنے تمام متوسلین کو ہدایت فرمادیتے تھے کہ ان دنوں میں کوئی گنگوہ ہرگز نہ آئے جن لوگوں کو یہ حکم تھا وہ لوگ اس کی پابندی کرتے تھے اور گنگوہ کی حاضری ترک کردیتے تھے، جن کو یہ حکم نہیں معلوم تھا وہ کبھی غلطی سے انہیں دنوں میں اپنے شیخ ومرشد کی ملاقات کے لیے گنگوہ آجایا کرتے تھے، عرس کے دنوں میں ان کی حاضری آپ پر انتہائی گراں گذرتی تھی۔ سوائے سلام کا جواب دینے کے کوئی بات نہیں کرتے تھے۔

ایک بار مولوی محمد صالح صاحب جو حضرت گنگوہی کے متوسلین میں سے تھے شیخ کی زیارت وملاقات کے ارادے سے گھر سے چل پڑے حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے، سلام عرض کیا، آپ نے سلام کا جواب دیکر چہرہ پھیر لیا حسب معمول نہ کھانے کو پوچھا نہ پانی کو اور نہ یہ پوچھا کہ کس غرض سے آئے ہو یہ دو دنوں تک رہے دل میں سوچتے رہے کہ خدا جانے مجھ سے کیا غلطی ہوئی بہت غور فکر کے بعد بھی ان کو اپنی کسی غلطی کا پتہ نہیں چلا سخت پریشان۔ آخر تیسرے دن روتے ہوئے خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ حضرت مجھ سے کیا غلطی ہوئی؟ اس کو معاف فرمادیں، حضرت گنگوہی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا میری غلطی نہیں کی ہے، خدا کی خطا کی ہے، خدا سے معافی مانگو تب ان کی سمجھ میں آیا کہ یہاں عرس چل رہا ہے اس موقعہ پر میرا آنا حضرت کو ناگوار گذرا ہے انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے عرس وغیرہ سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ آج کل یہاں عرس چل رہا ہے اس لاعلمی میں میں یہاں حاضر ہو گیا، میں بالکل بے قصور ہوں حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ ٹھیک ہے کہ تمہاری نیت عرس میں شرکت کی نہیں تھی تب بھی تم بری الذمہ نہیں ہو سکتے کیونکہ دو آدمی عرس

میں شرکت کی نیت سے آرہے ہیں اور تم ان میں شامل ہو گئے یا ان کے ساتھ آئے تو دیکھنے والے تو یہی کہیں گے کہ یہ سب عرس میں جارہے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے من کثر سوادھم فھو منھم۔

رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل

مرض وفات میں جب کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی بدن میں طاقت نہیں رہی پھر بھی حتی الامکان کھڑے ہو کر ہی نماز پڑھنے کی کوشش فرماتے رہے اور بیٹھ کر نماز نہیں پڑھی مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری کا بیان ہے۔

"مرض وفات میں جب تک اس قدر حالت رہی کہ دو آدمیوں کے سہارے سے کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکیں اس وقت تک اسی طرح نماز پڑھی کہ دو تین آدمیوں نے بمشکل اٹھایا اور دونوں جانبوں سے کمر میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہو گئے اور قیام رکوع و سجود انہیں کے سہارے نماز ادا کی، ہر چند خدام نے عرض کیا کہ حضرت بیٹھ کر نماز ادا کر لیجئے مگر نہ کوئی جواب دیا اور نہ قبول کیا ایک روز مولوی یحییٰ نے عرض کیا کہ حضرت! اگر اس وقت بھی جائز نہیں تو پھر وہ کون سا وقت اور کون سی حالت ہو گی جس میں بیٹھ کر نماز پڑھنا شرعاً جائز ہے

"آپ نے فرمایا امام صاحبؒ کے نزدیک قادر بقدرۃ الغیر تو قادر ہوتا ہے اور جب میرے دوست ایسے ہیں کہ مجھ کو اٹھا کر نماز پڑھاتے ہیں تو میں کیونکر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہوں، آخر جب نوبت ضعف اس قدر پہنچ گئی کہ دوسروں کے سہارے بھی کھڑے ہونے کی قدرت نہیں رہی تو اس وقت چند وقت کی نمازیں آپ نے بیٹھ کر پڑھیں (۱)

(۱) تذکرۃ الرشید، ج: ۲، ص: ۶۴

بدعات سے احتراز میں شدت

بدعات سے احتراز میں اس قدر شدت تھی کہ آپ ان مباح کاموں سے بھی بچتے تھے جن کو دیکھ کر دوسروں کو بدعت کی جانب میلان ہونے کا شبہ ہوتا ہو اس سلسلہ میں اپنے متوسلین پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ کو اطلاع دی کہ حضرت شملہ کی مسجد بوچر اں میں جو امام ہیں وہ آپ سے بیعت ہیں اس کے باوجود وہ مجلس میلاد مروجہ تیجہ فاتحہ وغیرہ میں شرکت کرتے ہیں اور کوئی اعتراض کرتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے حضرت نے اس کی اجازت دی ہے۔ چونکہ امام نے غلط بیانی کی تھی اور حضرت گنگوہی پر افترا کیا اس لیے آپ کو غصہ آیا اور سخت برہمی کا اظہار فرمایا اور فوراً ان کو لکھا کہ

> "جو شخص ان امور کو کرے اور میرا نام لے وہ کاذب ہے اس کو اسی پرچہ کے ذریعہ سے فہمائش کرو اگر باز آجائے بہتر، ورنہ بیعت فسخ ہو جائے گی(۱)

استاد زادہ کا ادب واحترام

آپ نے دوران تعلیم بیشتر کتابیں عربک کالج دہلی میں مولانا مملوک علی نانوتوی سے پڑھی تھیں، انہیں مولانا مملوک علی نانوتوی کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی دارالعلوم دیوبند میں صدر المدرسین ہوئے، حضرت گنگوہی جب بھی ان سے ملتے تو ان کا نہایت درجہ ادب واحترام فرماتے مولانا یعقوب صاحب نانوتوی پر بسا اوقات جذب کی کیفیت طاری رہتی تھی نہایت سادگی کے ساتھ رہتے، بہت ہی معمولی لباس

---

(۱) تذکرۃ الرشید ج ۲ ص: ۱۷۶

استعمال کرتے دیکھنے والے دیکھ کر ان کو عالم بھی نہیں سمجھتے لیکن حضرت گنگوہی جب ان کو دیکھ لیتے تو بڑے ہی احترام سے ان کا استقبال کرتے اور اپنی جگہ پر ان کو بٹھاتے اور حضرت خادمانہ معاملہ فرماتے، اسی سلسلہ کا ایک واقعہ ہے کہ۔

"حضرت گنگوہی ایک بار عصر کی نماز پڑھانے کے لیے مصلیٰ پر کھڑے ہوئے پیچھے کے مصلیوں میں سے کسی کا یہ کلمہ آپ کے کان میں پڑا مولوی صاحب آگئے مولوی صاحب آگئے

"آپ نے رخ پھیر کر دیکھا تو مولانا محمد یعقوب صاحب تشریف لا رہے تھے چونکہ پیدل راستہ قطع کر کے تشریف لا رہے تھے اس لیے پیروں پر غبار چڑھا ہوا تھا حضرت امام ربانی اپنے استاد زادے کو دیکھتے ہی مصلیٰ سے سر کے اور یہ دریافت فرماتے ہوئے پیچھے ہٹ آئے کہ مولوی صاحب! وضو ہے؟ مولانا نے فرمایا جی ہے اور اسی سادگی کے ساتھ مصلیٰ پر آگئے حضرت امام ربانی کی نظر قدموں پر پڑی تو پنڈلیاں تک غبار آلودہ تھیں اپنے کپڑے کا دامن لے کر آپ نے مولانا کے پاؤں کا غبار جھاڑنا شروع کر دیا حضرت مولانا پر بھی اس وقت کوئی حالت طاری تھی کہ کھڑے ہوئے پاؤں صاف کراتے رہے حضرت امام ربانی نے خوب اچھی طرح غبار صاف کیا اور بعد میں مسرت کے ساتھ فرمایا کہ مولوی صاحب کے پاؤں صاف کر کے میرا جی بڑا خوش ہوا، زیادہ تر اس وجہ سے کہ انہوں نے تکلف نہیں کیا(۱)

حضرت گنگوہی کے معمولات

حضرت گنگوہی کے شب و روز کا کیا معمول تھا؟ اس کے متعلق سب سے مستند بیان حضرت گنگوہی کے خلیفہ اجل حضرت مولانا خلیل احمد

---

(۱) تذکرۃ الرشید، ج: ۲، ص: ۱۹۴

صاحب محدث سہارنپوری مصنف بذل المجہود کا ہے چونکہ انہوں نے سارے معمولات کو بچشم خود دیکھا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کے الفاظ میں حضرت گنگوہیؒ کے معمولات کی تفصیل پیش کر دی جائے مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"جب بھی مجھے حاضری کا شرف حاصل ہوا آپ کا معمول اس طرح دیکھا کہ نماز فجر سے فارغ ہو کر آٹھ نو بجے تک ذکر و فکر میں خلوت کے اندر مشغول رہتے تھے، بعد ازاں نوافل پڑھتے اس کے بعد طلبہ کا سبق شروع کرا دیتے تھے آپ ابتداءً صرف علوم دینیہ یعنی فقہ، اصول تفسیر، حدیث کی تعلیم و تدریس فرماتے اور آخر میں دورۂ صحاح ستہ کی تدریس پر انحصار رہ گیا تھا لیکن جب ظاہری بینائی نہیں رہی تو تدریس ترک ہو گئی اور ارشاد و تحقیق کا باب زیادہ کھل گیا تھا اثناء سبق میں کوئی مریض دوا پوچھتا تو اس کو دوا بھی بتلا دیتے تھے .... تدریس کا مشغلہ زیادہ بڑھ گیا تو مطب ترک کر دیا تھا۔

"تدریس سے فارغ ہو کر خطوط اور استفتاء کے جوابات تحریر فرماتے۔ آپ کی عادت تھی کہ جو خطوط اور استفتاء خدمت میں آتے تو ان کا جواب جلد بھیجتے تھے، آپ کی خدمت میں اس قدر خطوط اور استفتاء آتے تھے کہ باوجود اس قدر مشاغل کثیرہ کے سب کا جواب لکھنا اور دن کے دن کام کا نمٹا دینا آپ ہی کا کام تھا۔ جب تک بینائی قائم رہی تمام جوابات اور فتاویٰ اپنے قلم سے تحریر فرماتے، بعد ذہاب بصر مولوی محمد یحییٰ کاندھلوی آپ کی طرف سے جوابات خطوط و فتاویٰ لکھنے لگے، تحریر سے فارغ ہو کر آپ کھانا کھاتے اور پھر تھوڑی دیر قیلولہ و استراحت فرماتے تھے نماز ظہر سے فارغ ہو کر قرآن شریف میں دیکھ کر تلاوت فرماتے اور ظاہری بینائی نہیں رہی تو حفظ پڑھتے تھے پھر تا نماز عصر تدریس ہوتی تھی عصر سے مغرب تک مجلس عام ہوتی تھی حسب موقعہ کلمات نصائح اور

قصص اکابر بیان فرما کر عوام وخواص کی تربیت فرماتے تھے بعد نماز مغرب نوافل اوابین پڑھ کر مکان تشریف لے جاتے اور بعد فراغ عشاء استراحت فرماتے تھے اس کے بعد جس وقت اللہ تعالی چاہتا آپ بیدار ہوتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر نوافل تہجد میں مشغول ہو جاتے تھے۔ ابتداء میں آپ آٹھ رکعات پڑھتے تھے اور آخر میں دس رکعات آپ کا معمول تھا۔ رکعات آپ کی طویل ہوتی تھیں قرآن شریف ان میں زیادہ زیادہ پڑھتے تھے قبیل صبح تک آپ نوافل سے فارغ ہوتے بعد فراغ اگر کچھ کسل طبع محسوس ہوتا تو ذرا لیٹ رہتے تھے ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے علی الدوام اسی طرح آپ کا معمول تھا۔ البتہ رمضان المبارک میں آپ کی مشغولی عبادت کے اندر خصوصاً شب کو زیادہ بڑھ جاتی تھی“ (۱)

---

(۱) تذکرۃ الرشید، ج: ۲، ص، ۶۲-۶۳۔

باب ۲۰

بیعت وارشاد وتزکیہ باطن اور تعلیم وتربیت

شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے علماء پر حضرت گنگوہی کو سبقت حاصل ہے اور یہ بھی ایک حیرتناک حقیقت ہے کہ بیعت اسی پہلی زیارت وملاقات اور چند روزہ قیام میں حضرت حاجی صاحبؒ کے محبوب ومکرم ہی نہیں ہوگئے بلکہ خلعت خلافت سے سرفراز بھی کردیے گئے یہ موہبت الٰہی اور خداداد صلاحیت اور استعداد کا ثمرہ تھا مرشد کی نگاہ میں مسترشد کی اہمیت اور عزت حاصل ہوجائے یہ کمال معرفت الٰہی شریعت وطریقت کے انوار واسرار سے واقفیت کی دلیل ہوتی ہے۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے حضرت گنگوہی کو کیا مقام دیا ان کی عظمت کا کیسا اعتراف کیا یہ حضرت حاجی صاحب کے مکہ مکرمہ سے حضرت گنگوہی کے نام آنے والے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے حضرت حاجی صاحب ۲۶ ر شوال ۱۳۰۹ھ کے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"عزیزم امیر شاہ خانصاحب آپ کے نہایت معتقد اور نہایت ارادت اور محبت رکھتے ہیں کچھ وجہ ایسی ہوگئی کہ چلتے وقت آپ کی زیارت سے مستفیض نہ ہوسکے آپ صدیقوں کی وجہ سے مجھ سے بھی محبت رکھتے ہیں اس پر کچھ شبہ نہیں کہ تم عزیزوں کے کمالات کی وجہ سے فقیر کے نقصان وعیوب چھپ گئے ہیں۔ تمہاری محبت

نے اکسیر کا کام کیا ہے، انشاء اللہ تعالی قیامت میں بھی ایسی ہی
ستاری کی امید ہے، تمہاری محبت کا بڑا وسیلہ ہے، والسلام(۱)

۱۳۱۶ھ میں ''انوار ساطعہ'' کے جواب میں حضرت گنگوہی کے حکم سے ''براہین قاطعہ'' لکھی گئی تھی، حضرت حاجی صاحب کے متوسلین میں ایسے لوگ بھی تھے جو میلاد، عرس فاتحہ، تیجہ، قبروں پر چراغاں اور دوسری بدعات میں مبتلا تھے خود مولوی عبد السمیع مصنف انوار ساطعہ جو حضرت گنگوہی کے ہم وطن تھے ان کا بھی عقیدہ علماء بدایوں و بریلی کے عقیدے کے مطابق تھا، علماء دیوبند ان خرافات کے خلاف اعلان جہاد کر چکے تھے براہین قاطعہ اس کا نقطۂ آغاز ہے، مخالفین نے حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حضرت گنگوہی پر بہت سے جھوٹے اتہامات لگائے اور حضرت حاجی صاحب کو بدگمان کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے حضرت گنگوہی کو اس ریشہ دوانی سے سخت تشویش تھی اس لیے آپ نے حضرت حاجی صاحب کو اس معاملہ میں ایک خط تحریر فرمایا تھا اور اپنی تشویش کا اظہار فرمایا تھا اس کے جواب میں حضرت حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی کے نام یہ خط تحریر فرمایا۔

"ایک ضروری اطلاع یہ ہے کہ فقیر آپ کی محبت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے اور الحمد للہ تعالی نے آپ کی محبت کو میرے دل میں ایسا مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی شے اس کو ہلا نہیں سکتی اور میں اپنے سب احباب کی محبت کو اپنے لیے وسیلۂ نجات جانتا ہوں اور یقین جانو کہ مجھ کو دنیا میں کسی سے ملال و کدورت نہیں ہے تو پھر اپنے عزیزوں سے جو اس گنہگار کے عقبیٰ کے حامی ہیں کیوں کر کدورت رکھوں گا اول تو کسی کو مقدور نہیں کہ فقیر کے سامنے آپ کے خلاف زبان ہلا دے کیوں کہ اس بارے میں اس کو سوائے میرے رنج

(۱) مکاتیب رشیدیہ، ج:۱، ص:۸۔

وملال کے کیا فائدہ ہوگا، دوسرے جو کوئی فقیر کو دوست رکھتا ہے وہ آپ سے محبت رکھتا ہے تو اس کے خلاف کبھی کوئی تحریر آپ کے پاس جاوے تو اس کو باور نہ کرنا عزیزم! دل محل ایمان و معرفت و محبت ہے نہ محل کینہ کدورت، آپ کی دعا میرے حق میں مقبول ہے، دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ اب اس اخیر زمانہ میں میرے دل کو نور محبت وایمان ومعرفت نور علی نور فرمادے(۱)

ایک بار مکہ مکرمہ سے مصنف انوار ساطعہ کے ہم مسلک وہم خیال کچھ لوگ حضرت حاجی صاحب سے مل کر آئے اور انہوں نے ہندوستان میں یہ افواہ پھیلادی کہ حضرت حاجی صاحب نے مولانا رشید احمد گنگوہی کو بیعت سے خارج کردیا ہے اور خلافت سلب کرلی ہے، یہ افواہ حضرت گنگوہی کے کانوں تک پہنچی صورت حال کے استفسار کے لیے آپ نے شیخ و مرشد حضرت حاجی صاحب کو ہندوستان میں پھیلائی ہوئی افواہ سے باخبر کیا اور دریافت فرمایا کہ حقیقت کیا ہے؟ اس کے جواب میں حضرت حاجی صاحب نے ایک مفصل خط تحریر فرمایا اس خط کے کچھ پیراگراف میں یہاں پیش کررہا ہوں۔ آپ نے تحریر فرمایا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدهٗ ونصلی علی رسوله الکریم

از فقیر امداد اللہ عفی عنہ بخدمت فیض درجت جامع شریعت وطریقت عزیزم مولانا مولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہی حفظہ اللہ بطول حیاتہ ودمر اعداءہ، السلام علیکم، ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

"مکتوب برکت اسلوب مورخہ چہاردہم رمضان شریف بدست مولوی ممتاز علی صاحب وردو سرور لایا، ممنون ومسرور ہوا اللہ تعالیٰ آپ کو بایں عنایت ومحبت مکروہات دارین سے محفوظ رکھ کر

---

(۱) مکاتیب رشیدیہ، ج:۱، ص:۶۔

دارین میں درجات عالیات قربت و رضا عطا فرماوے مولانا! آپ کی تحریر باعث انشراح قلب و موجب جمعیت خاطر فقیر ہے اس لئے آرزو ہے کہ ہمیشہ اپنی خیر و عافیت و حالات ظاہر و باطن وغیرہ سے مسرور و مبتہج فرماتے رہو، آپ کے اس خط کے ہر لفظ اور ہر فقرہ سے عجب کیفیت و شگفتگی پیدا ہوئی اے وقت تو خوش کہ وقت ماخوش کردی۔

مولانا! ضیاء القلوب میں جو کچھ آپ کی نسبت تحریر ہے وہ آپ سے نہیں لکھا گیا، جیسا القاء ہوا ہے ویسا ہی ظاہر کر دیا گیا ہے پس بدیہیات کو نہ ماننا اور اپنے ذریعہ نجات اور وسیلۂ فلاح دارین سے علیحدگی کرنا سخت جہالت و ادبار ہے خارج کرنا چہ معنی؟ فقیر تو تم علماء و صلحاء کی جماعت میں اپنا داخل ہو جانا موجب فخر دارین وذریعہ نجات و وسیلۂ فلاح کونین یقین کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بھی یہی دعا ہے کہ تم صالحین کی محبت میں جلاوے و مارے وہ شخص مدبر ہے جو تم مقدس اور مقتدائے زماں سے کچھ دل میں کینہ یا سوء ظن یا بدعقیدگی یا عداوت و رنج رکھے۔

فقیر تو آپ کی سب حرکات و سکنات و اقوال و افعال کو منبع حسنات و برکات موافق شریعت و طریقت سمجھتا ہے اور کل امور میں مخلص اور صادق یقین کرتا ہے(۱)

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ باضابطہ عالم نہیں تھے اس کے باجود حیرت ہے کہ اس دور کے اکابر علماء آپ سے بیعت ہوئے قرآن واحادیث سے جو احکام مستنبط ہوتے ہیں اور حالات پر ان کا انطباق ذہین ترین علماء کرتے ہیں کم تعلیم یافتہ اشخاص کو اس میں لب کشائی نہیں کرنی چاہیے حاجی صاحب کا مرتب کردہ فیصلۂ ہفت مسئلہ میں میلاد، قیام، فاتحہ کے مروجہ طریقے کی طرف جو رجحان ملتا ہے وہ مبتدعین کے عقیدہ و نقطۂ

(۱) تذکرۃ الرشید حصہ دوم، ص: ۱۸۶۔۱۸۷۔

نگاہ کے مطابق نہیں ہے وہ اس معاملہ میں حضرت گنگوہی کے نقطۂ نگاہ کے موافق تھے مگر طریقۂ اصلاح میں حضرت حاجی صاحب تشدد کے قائل نہ تھے اور حضرت گنگوہی کا نظریہ تھا کہ بغیر سخت رویہ کے اصلاح ممکن نہیں، مسئلہ اور نقطہ نگاہ میں اختلاف نہیں طریقہ کار میں تھوڑا سا اختلاف تھا، حضرت گنگوہی محقق وفقیہ عالم اور محدث ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری اور اپنے فرض سے واقف تھے حکم شریعت کے بیان میں مداہنت جائز نہیں، شیخ کے دل میں اگر کوئی نرم گوشہ ہے تو ضروری نہیں کہ ایک مسترشد جو عالم بھی ہے اور فقیہ بھی وہ صحیح مسئلہ کا بیان ترک کر کے اپنے شیخ کی رعایت کرے، سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصول بنادیا ہے **لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق**، یہی وجہ ہے کہ حضرت گنگوہی نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا کہ

"ہم نے کئی بار حضرت کو لکھا کہ مسائل میں آپ گفتگو نہ فرماویں، البتہ حقائق جو اس کے اہل ہوں ان کے سامنے بیان فرمائے جائیں (۱)

طالبین سلوک کے ساتھ

باہر سے آنے والے ہر شخص کو فوراً بیعت نہیں کرتے تھے، آنے والے لوگوں میں کچھ تو ایسے لوگ ہوتے تھے جن کو بیعت کرنے سے قطعاً انکار کردیا جاتا تھا۔ کچھ ایسے لوگ ہوتے تھے جن کی طلب صادق کا امتحان لیا جاتا اگر ان کی طلب صادق ہوتی تو آپ ان کو نماز استخارہ پڑھنے کا حکم فرماتے اگر استخارہ کے بعد بھی وہ اپنے عزم وارادہ پر قائم رہتے تب آپ ان کو بیعت فرمالیا کرتے تھے سیکڑوں مثالوں میں سے صرف ایک مثال حضرت گنگوہی کے معزز ترین خلیفہ حضرت مولانا خلیل احمد

---

(۱) تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۸۷۔

صاحب محدث سہارنپوری مصنف بذل المجہود کی ہے ان کو تمام امتحانات
سے گذرنا پڑا۔ محدث سہارنپوری ایک جگہ مدرس تھے وہاں حجۃ الاسلام
حضرت نانوتوی کسی سلسلے میں تشریف لائے تو آپ نے ان سے بیعت کے
سلسلہ میں مشورہ کیا تو آپ نے حضرت گنگوہی کا نام لیا کہ اس دور میں
ان سے بہتر کوئی شیخ طریقت نہیں ہے تم ان سے بیعت ہو جاؤ، اس مشورہ
پر محدث سہارنپوری نے عرض کیا کہ وہ آسانی سے بیعت نہیں کرتے
ہیں اور عام طور پر انکار کر دیا کرتے ہیں۔ اگر آپ سفارش فرمادیں تو بڑی
عنایت ہوگی۔ حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ میں جب کبھی گنگوہ آؤں تو تم
بھی آجاؤ میں سفارش کر دوں گا کچھ ہی دنوں بعد محدث سہارنپوری کو
خبر ملی کہ حضرت نانوتوی گنگوہ تشریف لائے ہوئے ہیں یہ فوراً گنگوہ حاضر
ہوئے اور وعدہ یاد دلایا، حضرت نانوتوی نے حسب وعدہ ان کی سفارش
بھی فرمادی یہ تینوں حضرات ایک ہی مجلس میں تشریف فرما تھے سفارش
کے بعد حضرت گنگوہی نے محدث سہارنپوری سے فرمایا کہ تم شیخ زادے
ہو پیر زادے ہو تم کو مجھ سے بیعت ہونے کی کیا ضرورت ہے مجھ سے تو
یہ معمولی لوگ بیعت ہوتے ہیں جن کو نہ دین معلوم ہے نہ دین کے تقاضوں
سے واقف ہیں، بیچارے ان پڑھ اور جاہل ہیں میں انہیں لوگوں کو توبہ
کرا دیتا ہوں اس بات پر محدث سہارنپوری نے عرض کیا کہ حضرت! میں
تو ان لوگوں سے بھی بدتر ہوں حقیر اور ذلیل اور سیاہ کار ہوں، اس لیے مجھے
تو آپ بیعت کر ہی لیں، پھر بھی حضرت گنگوہی نے حامی نہیں بھری آپ
نے فرمایا کہ اگر تم اب بھی اپنے عزم پر قائم ہو تو آج شب میں استخارہ
کر لو اس کے بعد مجھے جواب دو چنانچہ نماز استخارہ پڑھی، دوسری بار جب
مجلس میں حاضر ہوئے تو حضرت گنگوہی نے دریافت فرمایا کہ کیا تم اب
بھی اپنے عزم پر قائم ہو؟ تو محدث سہارنپوری نے جواب دیا کہ میرے

ارادہ میں کوئی تزلزل نہیں، میری طلب طلب صادق ہے میں اسی جذبے اور لگن کے ساتھ حاضر ہوا ہوں اس جذبے میں کوئی کمی نہیں آئی، ان مراحل سے گذر جانے کے بعد آپ نے ان کو بیعت فرمایا، جو بعد میں حضرت گنگوہی کے اجلہ خلفاء کی فہرست میں شامل ہوئے اور ایک دنیا کو ان سے فیض پہنچا۔

انکار ہی انکار

کچھ ایسے لوگ بھی آپ کی خدمت میں آتے تھے جو بڑی بیتابی کا اظہار کرتے اور بیعت کے لیے اصرار کرتے لیکن آپ انکار فرمادیتے بار بار کے اصرار اور بار بار کی سفارش کے باوجود آپ ایسے اشخاص کو بیعت نہیں کرتے تھے، بعد میں پتہ چلتا کہ آنے والا مخلص نہیں تھا بلکہ کسی اور جذبے سے حاضر ہوا تھا حضرت گنگوہی اس کے اندرون دل میں جیسے جھانک لیتے تھے اور سمجھ لیتے تھے کہ اس میں طلب صادق نہیں اور نہ بیعت ہونے میں نیک نیت ہے کبھی کبھی تو اہل مجلس کو اس شخص پر ترس آجاتا تھا جو بیعت کی درخواست کر رہا ہے حضرت گنگوہی کے انکار کی چوٹ ان کے دلوں پر پڑتی تھی اس کے باوجود آپ اپنے انکار پر قائم رہتے تھے بہت دیر میں یہ راز کھلتا کہ حضرت گنگوہی نے کیوں بیعت نہیں فرمائی شاید حدیث میں اسی کو فراست مومن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله۔

ایک بار ایک آدمی آیا وضع قطع اور لباس دینداروں جیسا شکل وصورت سے بھی نیک معلوم ہوتا تھا اس نے بیعت کی درخواست کی آپ نے فرمایا کہ آپ کسی اور سے بیعت کرلیں میں بیعت کرنے سے معذور ہوں اس نے پھر اصرار کیا اور لجاجت سے اپنی درخواست پیش کی

اس کے باوجود آپ نے انکار فرمادیا اس شخص نے مولانا یحییٰ کاندھلوی خادم خاص حضرت گنگوہی سے سفارش کرائی حضرت گنگوہی نے پھر بھی اس کو بیعت نہیں کیا وہ شخص ناکام واپس چلا گیا لوگ اس واقعہ کو بھول گئے کچھ دنوں کے بعد حضرت گنگوہی کے نام ایک خط آیا جو سب وشتم اور گالیوں سے بھرا ہوا تھا مولوی یحییٰ صاحب حضرت گنگوہی کو خطوط پڑھ کر سنا رہے تھے اس خط کی دو تین سطریں پڑھ کر خاموش ہو گئے حضرت گنگوہی کے دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا کہ حضرت! یہ تو مغلظات سے بھرا ہوا ہے۔ حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ کیا وہی شخص نہیں ہے جس کو بیعت کرنے کی تم نے سفارش کی تھی انہوں نے بتایا کہ جی حضرت آخر میں اسی شخص کا نام ہے۔ مولانا یحییٰ سخت شرمندہ ہوئے۔

طلبہ کو دوران تعلیم بیعت نہیں کرتے تھے

پانی پت سے ایک طالب علم گنگوہ آیا اور اس نے بیعت ہونے کی درخواست کی آپ نے فرمایا کہ بھائی پہلے تعلیم مکمل کر لو اس کے بعد آؤ گے تو دیکھا جائے گا اس وقت بیعت ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا اس نے سوال وجواب شروع کر دیا جو طالب علموں کی عادت ہوتی ہے اس نے کہا کہ فراغت کے بعد خدا جانے کون کہاں ہو گا، معلوم نہیں حضرت سے ملاقات ہو گی یا نہیں آپ نے فرمایا کہ دین کا کام بند نہیں ہو گا مجھ سے نہیں تو کسی دوسرے اللہ کے بندے کے ہاتھ پر توبہ کر لینا اس نے کہا ہو سکتا ہے کہ میں ہی اس دنیا سے چلا جاؤں تو آپ نے فرمایا کہ اگر تمہارا جذبہ صادق اور طلب سچی ہو گی تو تم کو اس پر اجر ملے گا مگر وہ طالب علم خاموش نہیں ہوا آخر میں اس نے کہا کہ حضرت میں تو تہیہ کر کے آیا ہوں کہ یہاں سے بیعت ہو کر ہی جاؤں گا اس کے اصرار اور بے جا ضد پر آپ

کو غصہ آگیا آپ لیٹے ہوئے تھے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ:

"مرید کا معنی بھی نہیں معلوم اور چلے آئے بیعت ہونے، بتاؤ مرید کے کیا معنی ہیں، اس نے کہا ارادہ کرنے والا آپ نے فرمایا جبھی تو کہتا ہوں کہ تم کو مرید کے معنی نہیں معلوم یہ باب افعال سے ہے ہمزہ سلب کا ہے مرید کے معنی میں مسلوب الارادہ کہ جو شیخ کہے وہی مان لے اپنی طرف سے ارادہ ہی نہ کرے (۱)

اس کے بعد وہ طالب علم خاموش ہو گیا، چپکے سے اٹھا اور چلا گیا۔

حیرت ناک انکشاف

باہر سے آنے والوں کو آپ بہت آسانی سے بیعت نہیں فرماتے اکثر انکار فرمادیتے تھے، کبھی کبھی تو کسی کی سفارش بھی نہیں سنتے تھے اور بہت سختی سے انکار فرماتے تھے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کا بیان ہے کہ ایک بار ایک شخص آیا انتہائی عقیدت اور اخلاص کا اظہار کیا اس کی ہر بات اور ہر حرکت سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ وہ حضرت گنگوہی کا دیوانہ اور والہ وشیدا ہے بڑی لجاجت اور منت وسماجت سے بیعت کی درخواست کی اس نے اپنے اندرونی درد وکرب کا اتنے موثر انداز میں اظہار کیا کہ تمام حاضرین مجلس کے دل اس کی ہمدردی سے بھر گئے مگر اس ملتجیانہ درخواست کے جواب میں حضرت گنگوہی نے بیعت کرنے سے صاف انکار فرمادیا اور فرمایا کہ مجھ سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اس لیے میں تمہیں بیعت نہیں کروں گا وہ رونے لگا اور اتنا غمزدہ نظر آنے لگا کہ ہر ایک کے دل پسیج گئے، بعض مقربین نے اس کی حالت پر ترس کھا کر حضرت گنگوہی سے اس کی سفارش بھی کی مگر حضرت گنگوہی کی طرف سے انکار ہی رہا آپ نے فرمایا کہ اس کو یہاں سے رخصت کر دو حکیم یوسف صاحب کو اس پر رحم آیا

(۱) تذکرۃ الرشید، ج: ۲، ص: ۹۷۔

انہوں نے اپنے گھر پر اس کو ٹھہرایا اور کہا کہ کسی مناسب موقعہ پر میں تمہاری سفارش کر کے تم کو بیعت کرادوں گا لیکن کئی بار ارادہ کے باوجود حکیم صاحب کو سفارش کرنے کی ہمت نہیں ہوئی مجلس سے اٹھ کر جب گھر آئے تو دیکھا کہ وہ شخص کوئی کتاب کھولے ہوئے کچھ لکھ رہا ہے حکیم صاحب کو دیکھتے ہی اس نے کتاب بند کر دی اور جزدان میں ڈال کر گردن میں حمائل کر لی حکیم صاحب کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی کیا لکھ رہا تھا اور کتاب کو گلے میں کیوں لٹکائے رہتا ہے، دل میں کہا کہ کتاب دیکھنی چاہیے اس لیے انہوں نے اس دن کھانا کھلا کر بہت دیر تک گفتگو کی رات کا بڑا حصہ گذر گیا جب اس کی نیند سے آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور غنودگی آنے لگی اور سونے کے لیے بے چین ہو گیا تو حکیم صاحب نے کہا کہ اب آپ سویئے چناں چہ چند ہی منٹوں میں وہ گہری نیند سو گیا، جب اطمینان ہو گیا کہ وہ بے خبر سو رہا ہے تو آہستہ سے انہوں نے اس کے گلے سے جزدان اتاری اور کتاب نکال کر اس کے اندراجات پڑھنے لگے وہ اس شخص کی ذاتی ڈائری تھی وہ روزانہ کے حالات اور اپنی کارگذاری کا اندراج کرتا تھا ڈائری میں بعض انگریز افسران کے نام تھے اس کی رپورٹیں پڑھ کر ان کو اندازہ ہوا کہ یہ شخص انگریزی حکومت کا جاسوس ہے اور وہ اپنے مشن پر بھیس بدل کر آیا ہوا ہے پھر کتاب جزدان میں ڈال کر اس کی گردن میں پہنا دی، صبح سویرے ایک کرایہ کا ٹٹو منگا کر دروازہ پر کھڑا کر دیا اور کہا کہ آپ کی سواری کے لیے ٹٹو حاضر ہے ٹھنڈے ٹھنڈے آپ چلے جائیں اس طرح اس کو نکال کر جب حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا مہمان کو رخصت کر دیا؟ حکیم صاحب نے بڑی شرمندگی سے کہا کہ جی حضرت اس کو رخصت کر کے آرہا ہوں، حضرت گنگوہی نے مسکرا کر فرمایا میں نے تم سے پہلے ہی دن

کہا تھا کہ اس کو یہاں سے نکال دو، تم ہی نہیں مانے۔(۱)

مخلص کی پذیرائی

دور دراز گاؤں اور دیہاتوں کے رہنے والے لوگ ناخواندہ سیدھے سادے مخلص اور سچے ہوتے ہیں وہ شہری تیزی وطراری سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں، جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر ہوتا ہے وہ باتوں کو بنا سنوار کر گفتگو کرنے کا فن نہیں جانتے، ایسے لوگوں کو اگر دین کی راہ پر لگا دیا جائے تو پورے اخلاص اور لگن کے ساتھ اس راہ پر چل پڑتے ہیں، حضرت گنگوہی کے نزدیک ان کی سادگی کی بڑی قیمت تھی گاؤں کے لوگ جمعہ کے دن نماز جمعہ پڑھنے گنگوہ کبھی کبھی آتے تھے تو حضرت کی مجلس میں بھی آتے اور بیٹھتے تھے یہ سیدھے سادے لوگ سلام کر کے بیٹھ جاتے، کوئی مسئلہ پوچھنا ہوتا تو پوچھ لیتے اور پھر سلام کر کے رخصت ہو جاتے اور اگر کوئی بیعت ہونے کی درخواست کرتا تو بلا تکلف اس کو بیعت بھی کر لیتے تھے، ایک بار گاؤں کے چند آدمی آئے اور بیعت کی درخواست کی آپ نے ان کو توبہ کرائی دو ایک نے ایک دو مسئلہ پوچھے اور اٹھ کھڑے ہوئے، لاٹھیاں کندھوں پر رکھیں سلام کیا اور رخصت ہو گئے، سلام کا جواب دیتے ہوئے حضرت گنگوہی کے چہرے کی بشاشت دیدنی تھی، چہرے سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی ان کے جانے کے بعد حاضرین سے فرمایا، بیعت تو ان کی ہے، کہ سہارا ڈھونڈھ لیا اور بے فکر ہو گئے۔(۲)

حضرت گنگوہی کے اس جملہ سے مجھے وہ روایت یاد آ گئی جس میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک اعرابی آیا اور ایمان قبول کیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نماز، روزہ اور زکوۃ کے احکام بتائے تو اس اعرابی

---

(۱) تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۹۳۔ (۲) تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۱۰۱

نے کہا کہ کیا اس کے علاوہ بھی مجھے کرنا ہے آپ نے فرمایا کہ نہیں مگر یہ کہ نفل نماز پڑھو، نفل کے روزے رکھو، زکوٰۃ کے علاوہ غریبوں، محتاجوں کی مدد کرتے رہو اگر کرو گے تو خدا کے یہاں اس کا مزید اجر ملے گا، یہ سن کر اس دیہاتی بدو نے قسم کھا کر کہا کہ میں اس میں نہ کمی کروں گا اور نہ زیادتی، اس سے اس کے عزم بالجزم کا پتہ چلتا تھا، وہ اٹھا، کندھے پر لاٹھی رکھی اور سلام کر کے رخصت ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر فرمایا قد افلح ان صدق اس مسرت کی وجہ یہی تھی کہ وہ علمی موشگافی سے دور رہا اس کے دل میں جو بات اتر گئی اب اس سے سر مو تجاوز نہیں کرے گا اور یقیناً پوری صدق دلی سے اس پر عمل کرتا رہے گا۔

اخلاص کی قدر

گاؤں کے سیدھے سادے باشندوں کی طرح نیک عورتیں بھی اپنی فطرت میں سیدھی سادی ہوتی ہیں ان کو احکام شریعت کی تفصیلات کا علم نہیں ہوتا لیکن خدا و رسول پر ان کا ایمان اتنا پختہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لوگوں کو یہ مقام میسر نہیں ہوتا امام رازی کے نام سے ایک قصہ مشہور ہے کہ وہ علم کلام کے امام تھے، فلاسفہ کے مقابلہ میں وہ اسلام کے ماہر فن وکیل اور ترجمان تھے ان کے دلائل مخالفین کو خاموش کر دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ امام رازی جب بستر مرگ پر تھے تو شیطان آیا اس نے کہا کہ خدا کے ایک ہونے کی کیا دلیل ہے، امام رازی نے دلیل دی اس نے اس دلیل کو رد کر دیا، امام رازی نے دوسری دلیل دی شیطان نے اس کو بھی توڑ دیا۔ اس طرح وہ مسلسل یکے بعد دیگرے دلیلیں دیتے رہے لیکن شیطان ان کی ہر دلیل پر اعتراض کر کے ناقابل اعتماد ثابت کر دیتا ان کی ساری

دلیلیں ختم ہوگئیں، ان کو اندیشہ ہوگیا کہ میرا خاتمہ کفر پر نہ ہو جائے تو انھوں نے کہا کہ میں بلا دلیل خدا کو ایک مانتا ہوں و انا اموت علی دین اُمی. واقعہ کی حقیقت جو کچھ بھی ہو میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں میں عقیدہ کا جو تصلب اور بے لچک اعتماد و اعتقاد پایا جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہوتا ہے اسی لیے حضرت گنگوہی ان خواتین کو بیعت کرنے میں تامل نہیں فرماتے تھے جو دل سے اس کی خواہش مند ہوتی تھیں کیوں کہ یہ یقین ہوتا تھا کہ جو کچھ بتایا جائے گا اس پر وہ صدق دلی سے عمل کریں گی اور پابندی کریں گی۔

موضع آبہہ ضلع سہارنپور میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو حضرت گنگوہی کے جدی وطن رامپور سے تھوڑے فاصلہ پر ہے، حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی کی اس گاؤں تشریف آوری ہوتی رہتی تھی اس لیے اس گاؤں میں حضرت حاجی صاحب کے اثرات کی وجہ سے دین داری تھی حضرت گنگوہی بھی اس گاؤں میں کبھی کبھی تشریف لے جاتے تھے، آبہہ کی مشہور شخصیت مولوی نظر محمد صاحب کا بیان ہے

”ایک بار حضرت گنگوہی آبہہ تشریف لائے ان کی تشریف آوری کی گاؤں میں دھوم مچ گئی، گاؤں کے لوگوں نے والہانہ استقبال کیا، آپ شام کو آبہہ پہونچے اور شب میں قیام فرمایا، صبح کو گاؤں کی خواتین جو پردہ نشین تھیں ان کی درخواستیں بڑی تعداد میں آئیں ہر ایک نے بیعت ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ حضرت گنگوہی ان کے گھروں پر جاتے اور ان کو بیعت فرماتے، صبح سے شام ہوگئی اور یہ سلسلہ جاری رہا، اس روز پھرتے پھرتے حضرت گنگوہی کی کمر میں درد ہوگیا، بعض بعض گھروں پر دو دو بار جانا پڑا، مجھے گرانی ہوئی کہ حضرت کو تکلیف ہو رہی ہے مگر کسی درخواست کو آپ نے رد

نہیں فرمایا مجھ سے فرمایا، نظر محمد خاں! مجھے بہت ڈر لگتا ہے، میں تو جتنی بار بلایا جاؤں گا، حاضری دوں گا۔(۱)

حضرت گنگوہی نے ایک حکایت سنائی کہ ایک بزرگ کے پاس ایک بڑھیا اپنی ضرورت کے لیے آئی، انھوں نے توجہ نہیں فرمائی تو باہر نکل کر بڑھیا نے کہا یا خدا تجھ تک میری رسائی نہیں اور جن کی رسائی ہے وہ میری سنتے نہیں، میں کیا کروں؟ بڑھیا کی یہ فریاد خدا نے سن لی، بزرگ کی نسبت سلب ہو گئی وہ پریشان ہو گئے اور بے چین ہو کر نکلے، بڑھیا کو تلاش کیا اس سے معافی مانگی اور اس کی ضرورت پوری کی تب دوبارہ ان کو نسبت حاصل ہوئی اس لیے حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ پتہ نہیں کب اور کون سی میری حرکت خدا کو ناگوار گذر جائے اور یہ دولت چھین لی جائے۔

عورتوں کی بیعت

آپ کے دست مبارک پر بہت سی خواتین بیعت ہوئیں لیکن عورتوں کی بیعت کا طریقہ وہی تھا جو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا جس کو ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک نے کبھی بھی بیعت ہونے والی عورتوں کے ہاتھ نہیں چھوئے ما مست ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ید امرأۃ آپ اس کی پوری پابندی فرماتے تھے، مستورات کو بیعت کرنے میں آپ کو کبھی تامل نہیں ہوتا تھا جس نے بھی بیعت کی درخواست کی فوراً منظور فرمالیتے اور توبہ کرادیا کرتے تھے، کبھی کوئی عورت سامنے نہیں آسکتی تھی ہمیشہ ان کو پردہ کے پیچھے بیٹھنے کا حکم ہوتا،

---

(۱) تذکرۃ الرشید، ج: ۲، ص: ۳۸-۳۹

اور نظر سے اوجھل رہنے کی تاکید ہوتی تھی کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ رومال کا ایک سرا آپ اپنے ہاتھ میں رکھتے اور دوسرا سرا پردے میں مستورات کو پکڑا دیا جاتا اور کبھی آپ اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے تھے زبان سے جو کچھ کہا جاتا اس کو مستورات آہستہ آہستہ دہراتیں اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ آپ تاکید فرماتے کہ یہ ضروری نہیں کہ تمہاری آواز میرے کانوں تک آئے، بس زبان سے دُہراؤ، آواز نہ نکلے، یہی آبہہ والے مولوی نظر محمد خاں صاحب کا بیان ہے کہ

"میری اہلیہ جس وقت آپ سے بیعت ہوئیں تو چوں کہ مجھے طبعی طور پر غیرت زیادہ تھی اس لیے عورت کا باہر آنا یا کسی اجنبی مرد کو آواز سنانا بھی گوارہ نہ تھا، اس وقت بھی وہ وسوسہ میرے ذہن میں آیا، حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ ان کو دوسرے کمرے میں بٹھا دو اور کواڑ بند کردو، آپ تشریف لائے اور کمرے کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئے اور فرمایا دیکھو میں جو کچھ کہوں تم بھی وہی کہتی رہنا مگر آواز میرے کانوں تک نہ آئے۔(۱)

بیعت کرنے کا طریقہ

بیعت درحقیقت اپنی توبہ کا کسی بزرگ کو شاہد بنالینا ہے، ایمان تو ہر مسلمان کے دل میں ہے اس کو تازہ کرلینا اور ایمان کے تقاضوں پر عمل کرنے کا عہد کرلینا ہے، قرآن کے الفاظ میں تجدید ایمان کرنا ہے اسی لیے جب حضرت گنگوہی کسی کو بیعت فرماتے تھے، اسی قرآنی آیت کا اُردو ترجمہ طالب کے سامنے پیش کرتے، آپ گردن جھکا کر بیٹھ جاتے اور طالب سے فرماتے کہو

"ایمان لایا میں خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اس کے

---

(۱) تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۹۵

نبیوں پر اور تقدیر پر کہ بھلا برا سب خدا ہی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد زندہ ہونے پر، توبہ کی میں نے کفر سے، شرک سے، بدعت سے اور ساری معصیت سے عہد کیا میں نے جھوٹ نہیں بولوں گا، چوری نہیں کروں گا کسی پر جھوٹا بہتان نہیں باندھوں گا، پانچ وقت کی نماز پڑھوں گا رمضان کے روزے رکھوں گا، اگر مال ہوگا تو حج کروں گا، زکوٰۃ واجب ہوگی تو زکوٰۃ دوں گا، اگر کوئی قصور ہو جائے گا تو فوراً توبہ کروں گا، بیعت کی میں نے رشید احمد کے ہاتھ پر خاندان چشتیہ نقشبندیہ قادریہ، سہروردیہ میں(۱)

ان کلمات کو طالب سے ادا کرا کے آپ اس کا ہاتھ چھوڑ دیتے تھے اور مختصر نہایت جامع نصیحت فرماتے تھے اکثر طالبین سلوک کو ان الفاظ میں نصیحت فرماتے تھے

"بیعت نام عہد کا ہے جو خدا سے کیا جاتا ہے سو اس کا دھیان رکھنا چاہیے کہ ٹوٹنے نہ پائے اصل بیعت یہی ہے کہ آدمی اپنے وعدے کا پکا رہے اور حق تعالیٰ کی رضا کا طالب رہے، سنت کا اتباع ہر وقت ملحوظ رکھے اس سے قدم نہ ہٹائے اس کے بعد بزرگوں نے جو طریق ذکر و شغل تجویز کیا ہے وہ اسی کی مضبوطی کے لیے ہے جس کو ہمت ہو کرے اور نہ ہو سکے تو اپنی نماز روزہ کو درست رکھے، یہی سب کچھ ہے۔"(۲)

تعلیم و تربیت

حضرت گنگوہی سے بیعت ہونے والوں کی بہت بڑی تعداد اہل علم کی ہے جو شریعت و طریقت کی راہوں سے بہت محتاط قدم اٹھاتے تھے کہ مبادا کہیں لغزش نہ ہو جائے، ذکر و شغل میں مختلف کیفیات پیدا ہوتی ہیں،

---

(۱) تذکرۃ الرشید، ج: ۲، ص: ۹۸

(۲) تذکرۃ الرشید، ج: ۲، ص: ۹۸

اوراد و وظائف کے مختلف نوعیت کے ثمرات پیدا ہوتے ہیں وسوسے پیدا ہوتے ہیں، کبھی قبض کی کیفیت مستولی ہو جاتی ہے کبھی بسط کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، ذکر سری اور ذکر جہری کے نتائج مختلف ذہن و مزاج کے لوگوں پر مختلف ہوتے ہیں جن کی وجہ سے طالبین سلوک خطرات و وساوس میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس طرح کے تمام حالات میں وہ اپنے طبیب روحانی کی طرف رجوع کرتے ہیں، اپنے تفصیلی حالات قلم بند کر کے اپنے شیخ کی خدمت میں برابر بھیجتے رہتے ہیں ان تمام خطوط کو پڑھ کر آپ اپنے قلم سے ان تمام طالبین سلوک کی مسلسل رہنمائی فرماتے رہتے تھے، حضرت گنگوہی کے یہ تمام خطوط جو سلوک و معرفت کے اہم ترین نکات و اسرار پر مشتمل ہیں اگرچہ یکجا کر کے شائع نہیں کیے گئے ہیں مگر پھر بھی کچھ خطوط اہل علم نے تلاش کر کے طبع کرائے ہیں جس کی ایک جلد مکاتیب رشیدیہ کے نام سے میرے سامنے موجود ہے، ایک مختصر کتابچہ "مفاوضات رشیدیہ" کے نام سے طبع ہوا جس میں صرف ایک مکتوب الیہ کے نام کے خطوط جمع کیے گئے ہیں یہ مولانا اشرف علی سلطان پوری (پنجاب) ہیں جو حضرت گنگوہی سے بیعت تھے انھوں نے اپنے شیخ کو اپنے حالات کے بارے میں جو خطوط لکھے اور حضرت گنگوہی نے ان کے جوابات تحریر فرمائے ہیں اس مجموعہ میں ۵۱ خطوط ہیں جو تصوف و سلوک کے اسرار و غوامض سے مملو ہیں، حضرت گنگوہی کے دامن سے منسلک ایک فرد کے نام جب اتنے خطوط ہیں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہزاروں منتسبین کے کتنے خطوط آتے رہے ہوں گے اور آپ ان کو جوابات دے کر ان کی تعلیم و تربیت فرماتے رہے ہوں گے "مکاتیب رشیدیہ" جلد اول میں ۱۴۹ خطوط ہیں، دونوں مجموعوں کے مکتوبات کی کل تعداد دو سو ہوتی ہے ہزاروں خطوط جن میں مریدین کی تعلیم و تربیت کے

جواہر پارے ہیں یا تو ان کے خاندان کے لوگوں نے تبرک سمجھ کر محفوظ کر لیا ہو گا یا مرورِ ایام نے قعرِ گمنامی میں ڈال دیا ہو گا۔

انھیں خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ بیعت کر کے ان کو ان کے حال پر نہیں چھوڑ دیتے تھے بلکہ ان کی برابر ہدایت کرتے رہتے تھے ان کو تاکید ہوتی تھی کہ وہ اپنے حالات اور کیفیات سے مطلع کرتے رہیں۔

حضرت گنگوہی کے خلفاء

یہ حیرت ناک حقیقت ہے کہ اس دور کے اکثر مشاہیر علماء حضرت گنگوہی سے بیعت تھے اور گنگوہ کی حاضری اور حضرت گنگوہی کی مجالس میں شرکت کو ذخیرۂ آخرت تصور کرتے رہے بعد میں وہی خاک نشین علماء و صلحاء آج کی نسل کے لیے منارۂ نور ہیں ان کی عزت و عظمت ان کا ادب واحترام ان کے علم و فضل، زہد و تقوی ان کے امتیازات و کمالات کی شہرت چار دانگ عالم میں ہے۔

حضرت گنگوہی کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کی تعداد کا کبھی جائزہ نہیں لیا گیا لیکن معمولی معمولی گاؤں میں سیکڑوں کی تعداد میں بیعت کرنے والوں کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے اس سے ایک ہلکا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ سے تعلق و نسبت رکھنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اس کے باوجود آپ کے خلفاء کی تعداد دستیاب معلومات کے مطابق صرف تیس ہے بظاہر یہ تعداد کم معلوم ہوتی ہے لیکن اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ انتخاب بہت بڑی نقاد اور محتاط تھی، جب تک وہ شخصیت درجہ کمال کو نہیں پہونچتی نظر انتخاب اس کی طرف رخ بھی نہیں کرتی تھی، ایک اہم ترین وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت گنگوہی صرف شیخ طریقت ہی نہیں بہت بڑے فقیہ، مفسر اور بہت ہی جلیل القدر محدث بھی تھے، دین و شریعت

کے تقاضوں کے مطابق اس دور کی بدعات و خرافات اور باطل عقیدوں کے خلاف سب سے بڑے مجاہد بھی تھے، آپ نکتہ رس فقیہ اور مفتی بھی تھے اس لیے شریعت و طریقت دونوں کے حدود و شرائط اور ان ذمہ داریوں سے خوب واقف تھے اس لیے آپ نے اپنے خلفاء کی فہرست میں انھیں حضرات کو شامل فرمایا جن کے علم و فضل پر مکمل اعتماد ہی نہیں ان کے فضل و کمال اور دین و شریعت کے مقابلہ میں باطل قوتوں سے ٹکرانے کی ان میں ہمت و جرأت تھی اور باطل عقائد اور گمراہ فرقوں کے بارے میں نرم پالیسی اختیار کرنے کے وہ روادار نہیں تھے وہ دین کے اتنے مخلص اور نڈر خادم تھے کہ دین و شریعت کے تقاضوں کے تحت اپنی پوری زندگی داؤ پر لگا دینے والے تھے ایسے مخلص و صادق رخصت پر عمل کرنے کے بجائے عزیمت پر عمل کرنے والے ہر دور میں کم ہوتے رہے ہیں آپ نے ایسے ہی پیکر علم و عمل اور دین کی سربلندی کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دینے کا عزم رکھنے والے افراد کو علماء میں سے منتخب فرمایا اور ان کو دستار خلافت دے کر ان کے سروں پر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا، دنیا نے دیکھا کہ حضرت گنگوہی کے جانشین خلفاء نے دین و شریعت کی کیسی کیسی بے مثال خدمات انجام دیں انھیں منتخب روزگار خلفاء میں سے جتنے نام مجھے ملے ان کا مختصر تعارف یہاں پیش کر رہا ہوں۔

۱۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی

ہندوستان کی تاریخ کے ممتاز ترین فرد ہمہ گیر شہرت کے مالک، ازہر ہند دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث و صدر المدرسین ہندوستان کے مشہور ترین علماء کرام کے جلیل القدر استاد، انگریزی حکومت کے خلاف اس کی اسلام دشمنی کی وجہ سے بغاوت اور مسلح حملہ کرنے کی منصوبہ

بندی کرنے والے، اسی معرکہ جہاد کا خاکہ مرتب کرنے کی غرض سے
حجاز تشریف لے گئے تھے اور ترکی وزیر جنگ اور فوجی افسران سے معاہدے
کیے مگر انگریزی ایجنٹوں کے ذریعہ مکہ مکرمہ میں گرفتار کرکے مصر اور مالٹا
کے اذیت خانوں میں موت وحیات کی کشمکش میں ساڑھے تین سال رہے
جیل کی کوٹھری آباد کی اسی لیے ہندوستان کی تاریخ میں اسیر مالٹا کہے جاتے
ہیں، پورے ہندوستان کے عظیم رہنماؤں نے آپ کے اس عظیم الشان
کارنامے کی وجہ سے آپ کو شیخ الہند کے معزز لقب سے سرفراز کیا یہ دل
سے نکلا ہوا تعظیمی لقب اتنا مشہور ہوا کہ بہت سے لوگ آپ کے اسم
گرامی سے بھی واقف نہیں، آپ انگریزی اقتدار اور حکومت کو اسلام اور
مسلمانوں دونوں کا دشمن اور بدترین دشمن سمجھتے تھے اس کی غلامی سے
مسلمانوں کو آزاد کرانے کے لیے ہر ممکن جہاد کے لیے تیار تھے اسی نفرت
کی وجہ سے جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مقابلہ میں ایک آزاد مسلم
یونیورسٹی کا منصوبہ بنایا گیا تو اس کا سنگ بنیاد قومی رہنماؤں نے آپ ہی کے
دست مبارک سے رکھوایا، آپ بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم
نانوتوی کے مخصوص شاگردوں میں ہیں۔ آپ نے حضرت نانوتوی سے اس
دور میں تعلیم حاصل کی جب وہ میرٹھ میں تصحیح کتب کا کام کر رہے تھے اور اپنے
ساتھ کچھ ذہین اور محنتی طلبہ کو رکھ کر گھر پر تعلیم دیتے تھے اسی زمانہ میں
حضرت شیخ الہند نے آپ سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں، شیخ
الہند دارالعلوم دیوبند کے تیسرے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث ہیں
آپ کے شاگردوں میں علامۂ دوراں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری شیخ
الحدیث دارالعلوم دیوبند، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ
الحدیث دارالعلوم دیوبند، مفتی اعظم ہند علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب شاہ
جہاں پوری صدر المدرسین مدرسہ امینیہ دہلی، خاتم المحدثین حضرت

مولانا سید فخر الدین احمد شیخ الحدیث دار العلوم دیو بند، حضرت العلامہ مولانا محمد ابر ہیم بلیاوی وغیرہ، مناظر اسلام فاتح قادیان مولانا ابو الوفا ثناء اللہ امر تسری جیسے اکابر ملت واساطین امت علماء و محدثین ہیں، قرآن پاک کا بامحاورہ اردو میں ترجمہ مقبول ترین ترجموں میں ہے جو اسارت مالٹا کے زمانہ میں لکھا گیا، سعودی گورنمنٹ نے اس کے شاندار ایڈیشن طبع کرا کے دنیا میں تقسیم کیے آپ قادر الکلام شاعر بھی تھے اور عظیم محدث بھی آپ کی ولادت شہر بریلی میں ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں ہوئی جہاں آپ کے والد مولانا ذوالفقار علی صاحب دیو بندی انسپکٹر آف اسکول تھے۔

حضرت شیخ الہند حضرت گنگوہی سے بیعت ہوئے اور پھر خلیفہ مجاز بنائے گئے آپ میں تواضع اور اخفاء حال حد سے بڑھا ہوا تھا، کسی کو بیعت نہیں کرتے تھے حضرت گنگوہی سے والہانہ وابستگی تھی آپ کا معمول تھا کہ جمعہ کے دن علی الصباح پاپیادہ گنگوہ روانہ ہو جاتے اور جمعہ کی نماز حضرت گنگوہی کے پیچھے ادا فرماتے اور آپ کی مجلس میں شرکت فرما کر پھر پیدل ہی چل کر عشاء کے وقت تک دیو بند واپس تشریف لاتے کیوں کہ صبح کو مدرسہ میں درس دینا ہوتا تھا یہ سب کچھ اپنے شیخ و مرشد سے غایت عقیدت اور والہانہ تعلق کا نتیجہ تھا کہ ایک دن میں چالیس میل کا سفر کرنا وہ بھی پاپیادہ اور تکان کا اظہار نہیں فرماتے ہر جمعہ کو یہ پر مشقت سفر آپ کا ہمیشہ معمول رہا اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ کبھی اپنے کو نمایاں نہ ہونے دیا حضرت گنگوہی کی خدمت میں چپ چاپ بیٹھتے اور عام اور معمولی خدام کی طرح کہیں بھی بیٹھ جاتے تھے، حضرت گنگوہی خود بڑے محدث اور عظیم المرتبت فقیہ تھے مگر حضرت شیخ الہند کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ مولوی محمود حسن تو علم کا کٹھلہ ہیں ۱۹۲۰ء میں ساڑھے تین سال مالٹا کی جیل میں گذار کر ہندوستان تشریف لائے واپسی کے بعد

حیات مستعار کے بہت تھوڑے ہی ایام باقی رہ گئے دہلی میں ۱۹۲۰ء ہی میں وفات ہوئی جنازہ دیوبند لایا گیا یہیں سپردخاک ہوئے۔

۲- حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری

مشہور محدث جلیل القدر عالم فرق باطلہ کے خلاف شمشیر برہنہ، بہترین مناظر، ردّ بدعت اور ردّ شیعیت میں متشدد، قابل احترام شیخ ومرشد اپنے دور کے نامور اور محقق علماء میں شمار تھا آپ کا وطن امبیٹھ ضلع سہارنپور ہے، صحاح ستہ کی مستند کتاب ابوداؤد شریف کی بہت ہی مبسوط شرح بذل المجہود کے نام سے عربی زبان میں لکھی جو پہلی بار فارسی رسم الخط میں بڑے سائز کی پانچ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی اگر بیروت کے معیار پر شائع کی جائے تو پندرہ جلدوں میں آئے گی رد بدعت میں سب سے پہلی اور مدلل ومبرہن کتاب براہین قاطعہ آپ کی مشہور ترین کتاب ہے جو حضرت گنگوہی کے حکم سے لکھی گئی اور رضاخانی جماعت کے موجد مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے جب حسام الحرمین شائع کی تھی جس میں تمام علماء دیوبند کو مشرک وکافر کہا گیا تھا اور اس کو عربوں میں پھیلایا تو علماء حجاز کی طرف سے علماء دیوبند کے نام ان کے عقائد کے سلسلہ میں ایک مفصل سوالنامہ آیا جس میں علماء دیوبند کے عقائد کے متعلق سوال کیا گیا تھا تو اس کا مفصل ومدلل اور تشفی بخش جواب آپ ہی نے تحریر فرمایا تھا جس میں علماء دیوبند کے عقائد کو واشگاف اور غیر مبہم لفظوں میں بیان کیا گیا اور ثابت کیا گیا تھا کہ یہی اسلام اور دین وشریعت کی منشاء کے مطابق عقائد ہیں اور یہی عقائد قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح ترین عقائد ہیں اس جواب پر علماء حجاز نے اظہار اطمینان ہی نہیں کیا بلکہ جن علماء نے احمد رضا خاں کے فتوی پر لاعلمی کی بنا پر دستخط کئے تھے انہوں نے

اپنے فتویٰ سے رجوع کیا اور غلط فہمی کی بناء پر جو باتیں ان کے قلم سے نکل گئی تھیں ان سے توبہ کی اور غیر مبہم لفظوں میں ان کو اعلان کرنا پڑا کہ علماء دیوبند کے عقائد وہی ہیں جو قرآن واحادیث سے ثابت ہیں کتاب کا پہلا ایڈیشن عربی میں شائع ہوا اور حجاز بھیجا گیا اس کا دوسرا ایڈیشن التصدیقات کے نام سے اردو میں شائع کیا گیا اس کی اشاعت نے مولوی احمد رضا خاں کے فریب کا پردہ چاک کر دیا۔

آپ ریاست بھاولپور اور بریلی کے مدرسوں میں برسوں تدریسی خدمات انجام دیکر دارالعلوم میں بلائے گئے اور یہاں آپ حضرت شیخ الہند کے نائب رہے جب حضرت گنگوہی کو مظاہر علوم سہارنپور کا سرپرست بنایا گیا تب آپ نے مولانا خلیل احمد صاحب کو دارالعلوم دیوبند سے بلا کر مظاہر علوم کا صدر المدرسین اور شیخ الحدیث بنادیا اور آپ جب تک ہندوستان میں رہے اسی منصب پر رہے اور مظاہر علوم کی تعمیر وترقی میں اہم کردار ادا کیا اور اس کی علمی شہرت کو ہندوستان گیر بنادیا۔

پھر آپ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی اور تازندگی وہیں رہے شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب آپ کے جاں نثار شاگردوں میں تھے اور بذل المجہود کی تکمیل تک آپ کے معاون بن کر رہے۔ مولانا خلیل احمد صاحب حضرت گنگوہی کے اہم ترین خلفاء میں ہیں خود آپ کے ہاتھوں پر ہزاروں مسلمانوں نے بیعت کی اور ان کو توبہ کرائی مشاہیر اہل علم میں حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی اور مولانا عاشق الٰہی میرٹھی آپ کے خلفاء میں ہیں۔

مولانا خلیل احمد صاحب جب دوسری بار سفر حج میں ۱۲۹۶ھ میں تشریف لے گئے تو آپ کے شیخ ومرشد حضرت گنگوہی نے مرشد العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی کی خدمت میں تحریر فرمایا کہ

مولوی خلیل احمد صاحب کو حضرت اجازت وخلافت سے سرفراز فرمائیں حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں جب محدث سہارنپوری چند یوم رہے اور آپ کے مقام ومرتبہ کا انکشاف ہوا تو حاجی صاحب بہت مسرور ہوئے اور محرم ۱۲۹۷ھ میں آپ کو خلافت دی اور کمال مسرت سے اپنی دستار اتار کر محدث سہارنپوری کے سر پر رکھ دی، ہندوستان واپسی کے بعد حاجی صاحب کا عطیہ خلافت نامہ اور دستار مبارک دونوں اپنے شیخ ومرشد حضرت گنگوہی کی خدمت میں پیش کردیئے اور عرض کیا کہ خاکسار تو اس لائق نہیں یہ بزرگوں کی ذرہ نوازی ہے حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ تمہیں مبارک ہو اور خلافت نامہ پر اپنا دستخط فرما کر خلافت نامہ اور حضرت حاجی صاحب کی دستار خلافت دونوں محدث سہارنپوری کو واپس کردیں۔ حضرت گنگوہی کو آپ سے خصوصی نسبت حاصل تھی اور آپ بھی اپنے ہر معاملہ میں حضرت گنگوہی سے مشورہ لیتے اور انہیں کے حکم کے مطابق عمل کرتے جہاں جہاں بھی منصب تدریس سنبھالا اور جہاں جہاں سے ترک تعلق کیا سب کچھ حضرت گنگوہی کے حکم سے ہوا۔

آپ نے بہ نیت ہجرت مدینہ منورہ میں اپنی زندگی کے آخری ایام گذارے اور آپ کی بڑی تمنا تھی کہ مدینہ منورہ کی پاک سرزمین میں دفن ہوں اللہ تعالی نے ان کی تمنا پوری کردی، مدینہ منورہ میں ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں وفات پائی اور مدینہ منورہ کی مقدس زمین میں آسودۂ خواب ہوئے۔

۳- حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری

حضرت گنگوہی کے جلیل القدر خلفاء میں ہیں ان کو قطب وقت کہا جاتا تھا آپ تگری ضلع انبالہ (پنجاب) میں ۱۸۵۵ء مطابق ۱۲۷۲ھ میں

پیدا ہوئے تھے اپنے دور کے مشہور بزرگ خانقاہ رائپور کے محترم شیخ طریقت حضرت گنگوہی کے خلیفہ مظاہر علوم سہارنپور کے سرپرست ازہر ہند دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے معزز رکن حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کے گہرے دوست اور جاں نثار رفیق تھے پہلی جنگ عظیم شروع ہو جانے پر جب شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنی تاریخی جدو جہد ریشمی رومال کی تحریک کے سلسلہ میں حجاز جانے لگے تو ہندوستان میں تحریک کے اہم امور کے سلسلہ میں انہیں کو اپنا قائم مقام بنایا تھا اور تمام لوگوں کو جو تحریک سے وابستہ تھے ہدایت دی تھی کہ ان کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھایا جائے، تحریک کے خارجی امور کی ذمہ داری مولانا احمد اللہ صاحب پانی پتی کو دی گئی تھی۔ حضرت رائپوری رائے پور سے استقلال، عالی ہمتی اور انتہائی رازداری کے ساتھ تحریک سے متعلق سارے امور انجام دیتے تھے شیخ الہند کو جب گرفتار کر کے حجاز سے مالٹا کے لیے بھیج دیا گیا تو ہندوستان کی پولس حرکت میں آئی اور پورے ملک میں مشتبہ افراد کے گھروں پر چھاپے پڑنے شروع ہو گئے حضرت رائپوری کی خانقاہ میں بھی پولس کا ایک دستہ پہنچا اور خانقاہ کا محاصرہ کر لیا آپ اس وقت بستر علالت پر تھے انتہائی کمزور اور لاغر و نحیف ہو چکے تھے بدن پر گوشت نام کی کوئی چیز نہیں تھی صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا سی آئی ڈی کے افسر نے تحریک کے بارے میں آپ سے استفسار کیا اور الزامات لگائے تو آپ نے ان الزامات کی تردید کی اور بعض امور میں اپنی لاعلمی کا اظہار فرمایا پولس اپنے کام کی کوئی بات نہ پا سکی اس لیے بے نیل مرام واپس چلی گئی۔

مولانا موصوف نے مظاہر علوم سہارنپور میں تعلیم حاصل کی اور وہیں کے ایک ہم نام بزرگ شاہ عبد الرحیم صاحب سے بیعت بھی ہو گئے

صاحب نسبت اور مجاز طریقت بھی ہوگئے مگر حضرت گنگوہی کے یہاں تشریف آوری بھی برابر جاری تھی یہاں آکر ان کو حضرت گنگوہی کی مربیانہ شفقتوں کے زیر سایہ بہت سکون ملتا تھا چونکہ بچپن سے ان کے دل میں حضرت گنگوہی کی عظمت بیٹھی ہوئی تھی قربت کی وجہ یہ تھی کہ جب غدر ۱۸۵۷ء میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی کے نام گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا تھا تو حضرت حاجی صاحب نے خفیہ طور پر ہندوستان سے نکل کر مکہ مکرمہ ہجرت کرنے کا ارادہ فرمالیا تھا اور پاپیادہ گھر سے نکل پڑے تھے اسی روپوشی کے دور میں آپ پنجلاسہ جاتے ہوئے تگری ضلع انبالہ پہنچے مولانا رائپوری کے والد محترم راؤ اشرف علی خاں صاحب کے مہمان ہوئے تھے اسی دوران حضرت گنگوہی حضرت شیخ و مرشد سے ملاقات کے لیے تگری ضلع انبالہ تشریف لے گئے تھے اور راؤ اشرف علی خاں صاحب ہی کے مکان پر قیام فرمایا تھا اس وقت مولانا عبدالرحیم رائپوری کی عمر صرف تین سال کی تھی راؤ صاحب نے ان کو حضرت گنگوہی کی خدمت میں پیش کیا کہ اس کے سر پر دست شفقت پھیر دیں اور دعا فرمادیں، اس واقعہ کا تذکرہ ان کے گھر میں ہمیشہ چلتا رہا اس واقعہ کو اہل خانہ نہ بھول سکے مولانا عبدالرحیم صاحب کو بھی گھر میں یہ واقعہ معلوم تھا اسی وجہ سے موصوف کو حضرت گنگوہی سے دلی قربت تھی ان کی ذات میں اپنے لیے کشش محسوس کرتے تھے اور بڑے ہونے پر ان کی عقیدت وارادت سے دل لبریز تھا جب ان کے پیر عبدالرحیم شاہ کا انتقال ہوگیا تو آپ نے حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کرلی اور جلد ہی آپ حضرت گنگوہی کے خلیفہ مجاز ہوگئے۔ مولانا رائپوری ایک بڑے زمیندار گھرانے کے فرد تھے وطن میں بھی ان کے خاندان کا بہت بڑا علاقہ تھا ضلع سہارنپور میں رائپور بھی آپ کی زمینداری میں

تھا، آپ نے تنگری ضلع انبالہ کی سکونت ترک کر کے رائپور کے ایک ہرے بھرے باغ میں جو ساحل دریا پر واقع ہے اپنی خانقاہ بنوائی اور شہری ہنگاموں سے دور اور بالکل علیحدہ ہو کر اس پر سکون اور خاموش ماحول میں ذکر الٰہی میں زندگی بھر مصروف رہے ہزاروں بندگان خدا کو آپ سے ہدایت ملی آپ سے بیشمار لوگوں نے بیعت کا شرف حاصل کیا ہندوستان کے کئی اکابر علماء کو آپ سے شرف بیعت حاصل ہوا، تواضع وانکسار آپ کی فطرت کا جز تھا اور سادہ زندگی آپ کا مزاج، رئیس کبیر خاندان کا ہونے کے باوجود روکھا سوکھا کھاتے خانقاہ میں ایک مدرسہ قائم کر رکھا تھا اس کے طلبہ کو درس دیتے طالبین سلوک ومعرفت کی تربیت فرماتے اسی پاک مشغلہ میں پوری زندگی صرف کردی بالآخر وقت موعود آگیا ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے ایک سال قبل رائپور میں وفات پائی اور اسی باغ میں مدفون ہوئے جو آپ کے ذکر الٰہی کے نغموں سے ستر سال سے گونج رہا تھا اللھم اغفر وارحم وانت خیر الراحمین.

۴- مولانا صدیق احمد صاحب امبیٹھوی

حضرت گنگوہی کے خلفاء میں ہیں آپ عالم فاضل صاحب درس وتدریس تھے، مدرسہ فتحپوری دہلی میں صدر المدرسین رہے آپ کا وطن امبیٹھ ضلع سہارنپور ہے اور مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری کے چچازاد بھائی تھے آپ سے تعلیم بھی حاصل کی اور آپ ہی کے ذریعہ حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف بیعت حاصل کیا، فطری صلاحیتوں سے مالا مال تھے اس لیے سلوک ومعرفت کی راہ میں بہت جلد مراتب عالیہ حاصل کر لیے حضرت گنگوہی کی خصوصی توجہ حاصل تھی یہی وجہ

ہے کہ جب آپ کو خلعت خلافت سے سرفراز کیا گیا تو تمام خلفاء کے برخلاف جب آپ کو مجاز بنایا تو حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی نے حضرت گنگوہی کو جو دستار خلافت عنایت فرمائی تھی وہ اگرچہ حضرت گنگوہی کے لیے خود بابرکت اور شیخ کا تبرک سمجھ کر رکھ چھوڑا تھا لیکن وہی دستار آپ نے اپنے خلیفہ مولانا صدیق احمد صاحب امیٹھوی کو عطا فرمائی۔

حضرت گنگوہی کے نزدیک ان کی قدر و منزلت اس قدر تھی کہ ان کے جتنے خطوط احوال و کیفیات سے متعلق آتے تھے ان تمام مکتوبات کو بحفاظت اپنے پاس رکھتے تھے اور شاید منشا یہ تھی کہ اگر دوسروں کے مطالعہ میں بھی یہ مکتوبات آئیں تو انہیں سلوک کی راہوں میں ان سے روشنی ملے گی اور جب حضرت گنگوہی آنکھوں سے معذور ہو گئے تو یہ مکتوبات مولانا صدیق احمد کو بغرض حفاظت واپس فرما دیئے، مکاتیب رشیدیہ کے نام سے جو مجموعہ مکاتیب شائع ہوا ہے مولانا صدیق احمد صاحب کے اس میں ۲۳ خطوط ہیں ان خطوط میں تصوف و معرفت وسلوک کے جواسرار و غوامض ہیں دوسروں کے نام جو حضرت گنگوہی کے خطوط ہیں ان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں۔

۵- شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

اپنے دور میں ہندوستانی علماء کے سرتاج ہزاروں ہزار کے شیخ طریقت دبستان دیوبند کی کلاہ افتخار کے گوہر آبدار اور کوہ نور، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر الاساتذہ علماء ہند کی جاں سپار اور قابل فخر جماعت جمعیۃ علماء ہند کے صدر محترم کاروان آزادی کے امیر کارواں، مجاہدین حریت کی صفوں میں سپہ سالار اعظم علمی دنیا نے آپ کو شیخ الاسلام کا پرشکوہ خطاب دے رکھا تھا۔

تحریک شیخ الہند جوریشمی رومال کی تحریک کے نام سے مشہور ہے اس خطرناک تحریک میں آپ نے اپنے شیخ واستاد کے ساتھ گرفتار ہوکر جزیرہ مالٹا میں ساڑھے تین سال کی اذیت ناک جیل کاٹی۔ ۱۹۲۲ء میں مقدمہ کراچی میں عدالت کی طرف سے پھانسی دیئے جانے کا فیصلہ پورے ملک کی نگاہوں میں یقینی تھا لیکن خدا نے محفوظ رکھا آپ شیخ الہند کے تلامذہ میں ہیں صرف شاگرد ہی نہیں بلکہ جاں نثار خادم بھی تھے اس لیے ان کے علمی عملی وسیاسی جانشیں ہوئے بیس سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اسی سال آپ کا پورا خاندان مدینہ منورہ ہجرت کر گیا آپ بھی ان کے ہمراہ تھے ۱۶ سال سے زائد آپ نے مسلسل مدینہ منورہ میں قیام کیا حرم نبوی میں درس دیا مگر ہجرت کی نیت نہیں کی تھی اس لیے جزیرہ مالٹا کی جیل سے رہائی پانے کے بعد حضرت شیخ الہند کے ساتھ سیدھے ہندوستان آگئے آپ حضرت گنگوہی سے بیعت تھے اور آپ کے خلیفہ مجاز بھی، خود آپ سے بیعت کرنے والوں کی تعداد بیشمار ہے دارالعلوم دیوبند میں آنے سے پہلے تین سال سلہٹ (آسام) میں آپ نے گذارے اس لیے آپ سے بیعت ہونے والوں کی اس علاقہ میں تعداد زیادہ ہے آج وہ علاقہ بنگلہ دیش میں شامل ہے۔

آپ نے ہندوستان کی آزادی کے سلسلہ میں بڑی بڑی اذیتیں غیروں سے بھی اور اپنوں سے بھی اٹھائیں زندگی کا ایک معتد بہ حصہ برطانوی جیلوں میں گذرا۔ تحریک پاکستان کی مخالفت میں سب سے نمایاں نام آپ کا تھا اس کی پاداش میں آپ کو جو ذہنی وجسمانی اور روحانی تکلیفیں سہنی پڑیں وہ آپ ہی کا ظرف تھا کہ آپ نے اذیت دینے والوں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا اور خدا سے ان کی مغفرت کی دعائیں کیں، آزادی کے بعد حکومت ہند نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے

طور پر خطاب دیا تھا جس کو آپ نے شکریہ کے ساتھ واپس کردیا، دارالعلوم دیوبند میں ۳۲ سال حدیث پڑھائی چار ہزار سے زیادہ علماء کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے اور وہ اس نسبت پر فخر کرتے ہیں آپ کی خودنوشت سوانح حیات "نقش حیات" کے نام سے دو جلدوں میں ہے آپ کے سوانح حیات کے سلسلہ میں اب تک تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں راقم الحروف کی کتاب مآثر شیخ الاسلام پہلی اور ضخیم ترین کتاب ہے فرید الوحیدی کی کتاب "مولانا حسین احمد مدنی" کے نام سے ہے تیسری کتاب سیرت شیخ الاسلام کے نام سے نجم الدین اصلاحی مرحوم کی ہے۔

حضرت گنگوہی سے بیعت کے بعد چونکہ آپ کا مستقل قیام مدینہ منورہ میں تھا اس لیے گنگوہ کی حاضری ممکن نہ تھی اس لیے آپ نے حضرت گنگوہی سے اجازت طلب کی کہ اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی جو مکہ مکرمہ میں اس وقت اقامت گزیں ہیں ان کی مجلسوں میں شرکت کروں اور ان سے استفادہ کروں حضرت گنگوہی نے آپ کو اجازت دے دی آپ اپنے واردات قلبی اور کیفیات باطنی پر مشتمل خطوط حضرت گنگوہی کو ہمیشہ تحریر فرماتے رہے، اطمینان بخش طرح پر مدارج سلوک طے کرلینے پر آپ کو روحانی مسرت حاصل ہوتی رہی، آپ نے شیخ الاسلام اور ان کے بڑے بھائی مولانا صدیق احمد مدنی کو مدینہ منورہ تحریر فرمایا کہ کچھ دنوں کے لیے آپ دونوں حضرات گنگوہ آجائیں، اس خط کے پاتے ہی دونوں حضرات کے دلوں میں گنگوہ حاضری کا داعیہ پیدا ہوا لیکن غربت اور تنگ دستی کا دور چل رہا تھا مدینہ منورہ میں ابھی کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا بڑی مشکلوں سے زاد راہ کا انتظام ہوا اور دونوں بھائی ہندوستان آئے اور سیدھے گنگوہ پہونچ گئے، چند دنوں قیام کے بعد حضرت گنگوہی نے ان دونوں حضرات کو بلایا اور اپنا استعمالی کرتہ

پاجامہ ایک ایک جوڑا دونوں حضرات کو عطا فرمایا، جوڑے تو دونوں کو ملے مگر ان کے ساتھ نہ ٹوپی تھی نہ عمامہ، دبی زبان سے کہا گیا کہ اگر ارشاد ہو تو ہم خدام اپنا اپنا عمامہ لیتے آئیں اپنے دست مبارک سے عطا فرمادیا جائے، یہ سن کر حضرت گنگوہی خاموش رہے۔ دونوں بھائیوں نے فرط ادب سے اور کچھ نہیں کہا عطیہ شیخ کو سر اور آنکھوں پر رکھا، تھوڑے ہی دنوں کے بعد دونوں حضرات پھر بلائے گئے اور کہا گیا کہ اپنے اپنے عمامہ لے کر آجائیں، دونوں حضرات نے اپنے عمامے حاضر کیے حضرت گنگوہی نے اپنے دست مبارک سے دونوں کے سروں پر باندھ کر فرمایا، جانتے بھی ہو، یہ کیا ہے؟ بڑے بھائی نے عرض کیا "دستار فضیلت" آپ نے فرمایا نہیں، یہ دستار خلافت ہے۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی پوری زندگی دین کی سربلندی کی کوششوں میں گذری، کئی ہزار کی تعداد میں آپ سے بیعت ہونے والے اور کئی ہزار کی تعداد میں حدیث پڑھنے والے آپ کے تلامذہ ہیں، آپ کی ولادت بانگر مئو ضلع اناؤ میں ۱۹ر شوال ۱۲۹۶ھ ستمبر ۱۸۷۹ء میں ہوئی آپ کے والد کا نام سید حبیب اللہ تھا جو بانگر مئو میں کسی اسکول کے ٹیچر تھے، شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی سے بیعت تھے، شیخ الاسلام کی ساری تعلیم دار العلوم دیوبند میں ہوئی، شیخ الہند آپ کے سب سے شفیق اور مربی استاد تھے بعد میں آپ جانشین شیخ الہند ہوئے، آپ نے دیوبند میں ۱۲ر جمادی الاول ۱۳۷۷ھ مطابق ۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو وفات پائی اور قبرستان قاسمی میں مدفون ہوئے۔ (مآثر شیخ الاسلام)

۶۔ مولانا صدیق احمد مدنی

سید حبیب اللہ الہ داد پور ٹانڈہ ضلع فیض آباد کے رہنے والے اور

مشہور صاحب کشف بزرگ حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے خلیفہ تھے، انھیں کے بڑے صاحبزادے کا اسم گرامی مولانا صدیق احمد ہے، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے بڑے بھائی ہیں آپ کی ولادت الہ داد پورہ میں ہوئی وہیں نشو ونما پائی اور ابتدائی تعلیم حاصل کی، کم عمری ہی میں آپ دار العلوم دیو بند چلے گئے اور حضرت شیخ الہند کی خدمت میں رہ کر تعلیم مکمل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت ہوگئے اور پھر اپنے خاندان کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت کر گئے، کچھ عرصہ بعد مدینہ منورہ سے ہندوستان تشریف لائے اور گنگوہ کی خانقاہ میں مقیم ہو کر سلوک و طریقت کی منزلیں طے کیں اور حضرت گنگوہی کے خلیفہ مجاز ہو کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے حضرت گنگوہی نے دونوں بھائیوں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا صدیق احمد مدنی کو اپنے دست مبارک سے ایک ساتھ دستار خلافت سروں پر باندھیں اور اپنی دعاؤں کے سائے میں ان کو مدینہ منورہ رخصت فرمایا، مدینہ منورہ میں آپ کا مشغلہ درس و تدریس تھا، ۱۳۳۱ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں دفن ہونے کا شرف حاصل کیا۔

۷۔ حکیم مولانا محمد صدیق مراد آبادی

حضرت گنگوہی کے خلفاء میں ہیں آپ کا وطن شہر مراد آباد ہے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں ہیں اور انھیں سے بیعت بھی تھے اور حضرت نانوتوی کے خلیفہ بھی، ان کا زہد و تقوی اوراد و وظائف کی پابندیوں نے حضرت نانوتوی کی نگاہ میں بڑا اعتبار و اعتماد بنالیا تھا، حضرت نانوتوی جب اس دیار کے لوگوں کو بیعت

فرماتے تھے تو انھیں کی خدمت میں تعلیم وتربیت کے لیے بھیج دیا کرتے تھے، آپ کو حضرت نانوتوی کے علاوہ حضرت گنگوہی اور حاجی امداد اللہ تھانوی سے بھی اجازت وخلافت حاصل تھی۔

آپ باضابطہ عالم تھے اور صوفی ودرویش بھی آپ طبیب حاذق اور ماہر امراض بھی، امراض ظاہری کے ساتھ امراض باطنی کا بھی علاج فرماتے تھے، شہر مراد آباد کے مشہور اور بلند پایہ طبیب و معالج مانے جاتے تھے آپ مطب بھی کرتے تھے۔

حضرت نانوتوی کی ذات سے عشق کے درجہ کی والہانہ وابستگی تھی شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی جب بھی مراد آباد تشریف لاتے تو انھیں کے پاس قیام فرماتے تھے اور ان کا بڑا ہی اعزاز واکرام فرماتے تھے ایک زمانہ میں ان کو مدرسہ شاہی مراد آباد کا مہتمم بنادیا گیا تھا لیکن ان کے اپنے مشاغل اور اپنی مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ وہ زیادہ دنوں تک کار اہتمام کو نہ سنبھال سکے اور اس سے کنارہ کش ہوگئے، اوراد ووظائف سے حد درجہ اشتغال تھا جس کی وجہ سے آپ پر استغراق کی کیفیت طاری ہوگئی، لوگوں نے اس کو جنون سمجھا، علاج کرایا گیا، اسی علاج کی وجہ سے آپ کی بینائی جاتی رہی، ۸۴ سال کی عمر میں انتقال فرمایا، نماز جنازہ قاضی بھوپال قاضی محی الدین نے پڑھائی، آپ کی وفات ۳ر شوال ۱۳۴۷ھ مطابق مارچ ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔

۸۔ مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے خاندان کے ایک ممتاز عالم تھے آپ کے والد کا نام حافظ لطف علی تھا، آپ کی ولادت نانوتہ میں ہوئی، بچپن یہیں گذرا، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد آپ دہلی

بغرض تعلیم گئے اور وہاں مولانا مملوک علی نانوتوی، مفتی صدر الدین صدر الصدور سے تعلیم حاصل کی، حدیث کی کتابیں شیخ رشید الدین خاں دہلوی اور شاہ اسحاق محدث دہلوی سے پڑھیں، تعلیم سے فراغت کے بعد مختلف مقامات پر آپ نے تدریسی کام کیا، آپ ۱۸۵۷ء کے مجاہدین علماء میں شامل تھے، محاذ جنگ پر دوسرے علماء کے ساتھ موجود تھے ایک گولی آپ کے پاؤں میں لگی تھی، اس کے بعد عرصہ تک روپوشی کی زندگی گذاری اور جب عام معافی کا اعلان ہوا تو ظاہر ہوے ۱۳۸۳ھ میں آپ مظاہر علوم سہارنپور کے صدر مدرس ہوے، مظاہر علوم کا ابھی آغاز تھا، سہارنپور کے ایک عالم مولوی سعادت علی صاحب نے اس مدرسہ کو قائم کیا تھا اور اس کا نام مدرسہ عربیہ تھا جب مولانا مظہر نانوتوی اس مدرسہ میں آئے تو تمام تعلیمی نظام آپ کو سپرد کر دیا گیا اور اس کے مدرس اعلیٰ بنائے گئے اس وجہ سے آپ کی پوری توجہ مدرسہ کے معیار تعلیم کو بلند کرنے کی طرف تھی آپ نے مدرسہ کی تیز رفتار ترقی میں اہم کردار انجام دیا اور بہت جلد اس کو مرکزیت حاصل ہو گئی، معیار تعلیم بلند ہوا طلبہ کا رجوع بڑھ گیا، اب وہ ایک چھوٹے سے مدرسہ سے آگے بڑھ کر ملک کا ایک مرکزی ادارہ بن گیا، ارباب انتظام نے آپ کی جلیل القدر خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں کی ذات کی طرف منسوب کر کے اس کا نام مدرسہ عربیہ کے بجائے مظاہر علوم رکھ دیا، آپ مظاہر علوم میں ۱۲۸۳ھ میں مسند صدارت پر فائز ہوے اور پھر تازندگی اسی منصب پر رہے جس کی مدت کچھ کم و بیش ۱۹ سال ہے، اس عرصہ میں آپ نے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور ادب کی اونچی اونچی کتابیں پڑھائیں، آپ کے شاگردوں میں مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر مدرس دار العلوم دیوبند حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری

مصنف شرح ابو داؤد بذل المجہود، مولانا فخر الدین صاحب گنگوہی شامل ہیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند نے بھی آپ سے شرح مایۃ عامل، ہدایۃ النحو اور علم الصیغہ وغیرہ پڑھیں۔

اللہ نے آپ کو سادگی و متانت، تواضع و انکسار، احتیاط و ورع و تقویٰ عبادت وریاضت کے ساتھ ساتھ ذہانت و ذکاوت، حسن انتظام علم و یقین متعدد علوم و فنون میں لیاقت و کمال کی دولت سے بھی پوری طرح نوازا تھا، حضرت گنگوہی سے اگرچہ عمر میں بڑے تھے لیکن انھیں سے بیعت ہوئے اور اپنے شیخ کی محبت میں ڈوب گئے، حضرت گنگوہی آپ کی بڑی عزت کرتے اور ان کے ساتھ احترام سے پیش آتے تھے۔ اجازت و خلافت سے بھی آپ کو مشرف کیا، عمر میں اپنے شیخ سے بڑے ہونے کے باوجود حضرت گنگوہی کے عاشق اور جاں نثار خادم بن کر رہتے تھے آپ جب حضرت گنگوہی کی خدمت میں تشریف لاتے تو دست بوسی فرماتے اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز رہتیں، حضرت گنگوہی کو حجاب آتا اور شرماجاتے اور فرماتے کہ آپ مجھے کیوں نادم بناتے ہیں، آپ میرے بڑے ہیں، مجھے آپ کا ادب ضروری ہے، آپ ایسا کیوں کرتے ہیں، مجھے شرم آتی ہے، مولانا مظہر صاحب نانوتوی نے ۷۰ سال کی عمر میں ذی الحجہ ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں انتقال فرمایا۔

۹۔ مولانا صادق الیقین کرسوی

حضرت گنگوہی کے خلفاء میں مولانا صادق الیقین کرسوی کا بھی نام نامی ہے۔ آپ کی ولادت مضافات لکھنؤ میں ایک مقام کرسی ہے وہاں ہوئی، یہیں سن شعور کو پہونچے، ابتدائی تعلیم قرب و جوار میں حاصل کی متوسطات پڑھ کر آپ دیوبند چلے گئے اور وہاں حضرت شیخ الہند

رحمتہ اللہ علیہ اور دوسرے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور دارالعلوم دیوبند ہی سے فراغت حاصل کی، تکمیل تعلیم کے بعد حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دورۂ حدیث میں کچھ دنوں تک شامل رہے پھر حضرت گنگوہی کے دست مبارک پر بیعت کرنے کے بعد وطن واپس ہوئے، اوراد و وظائف اور ذکر و شغل کی شدید پابندی، مراقبہ اور خلوت نشینی، شب بیداری اور تہجد گذاری نے آپ کو بہت جلد سلوک و طریقت کے اس بلند مقام پر پہونچا دیا جو سالکین کی معراج کمال ہے، حضرت گنگوہی ان کے ظاہر و باطنی کمالات اور کیفیات سے واقف ہوئے تو آپ نے دوبارہ گنگوہ حاضری کے موقع پر ان کو خلعت خلافت و اجازت مرحمت فرمائی، گنگوہ سے واپسی کے بعد زیارت حرمین شریفین کی دل میں آتش شوق بھڑک اُٹھی، آپ کے والد زندہ تھے ان سے اجازت طلب کی انھوں نے اپنی تمنا کا اظہار کیا، آپ اپنے والد ماجد کو لے کر مکہ مکرمہ پہونچ گئے اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیار مقدس کی فرحت بخش ہواؤں نے طمانیت قلب بخشی، ابھی مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے اور وطن واپسی کا ارادہ کر رہے تھے کہ خدا کی طرف سے ان کا بلاوا آگیا اور وہیں ۳؍ محرم ۱۳۲۴ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اسی سرزمین میں پیوند خاک ہوئے۔(۱)

۱۰۔ مولانا حکیم محمد اسحاق نہٹوری

حضرت گنگوہی کے خلفاء میں سے ہیں اکابر علماء دیوبند ان کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، یہ حضرت گنگوہی کے شاگردوں میں بھی ہیں اور آپ کے خلیفہ مجاز بھی، علم ظاہر اور علم باطن دونوں میں کمال

(۱) نزہۃ الخواطر، ج:۸، ص:۱۸۶

حاصل تھا، اخفاء حال کا بڑی شدت سے اہتمام کرتے تھے اور خلوت گزینی کی زندگی بسر کرتے تھے، دہلی صدر بازار کے تیلی واڑہ کی اونچی مسجد میں قیام تھااور درس وتدریس کاکام کرتے تھے اور ایک مخیر تاجر حاجی محمد اسمٰعیل سوداگر اپنی جیب خاص سے بیس روپے ماہوار آپ کی خدمت میں پیش کردیا کرتے تھے اسی تھوڑی سی تنخواہ میں آپ نے ساری زندگی گذاردی بہت ہی رقیق القلب تھے اپنے شیخ ومرشد سے والہانہ محبت و عقیدت رکھتے تھے جب ذکر آجاتا توان کی آنکھیں چھلک پڑتی تھیں اگر حضرت گنگوہی کے کسی خلیفہ سے ملاقات ہوگئی تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آتی تھیں زبان سے کچھ کم کہتے، ایسا محسوس ہوتا تھاکہ وہ اندر ہی اندر سوزش عشق سے سلگتے رہتے تھے، خلوت ومراقبہ اور خلوت گزینی کے التزام سے ایسا معلوم ہوتا تھاکہ وہ آدم بیزار ہیں آپ کی خدمت میں لوگ اپنی اپنی مشکلات میں دعاؤں کی درخواست لے کر آتے رہتے تھے، عوام وخواص ان کوایک بزرگ اور ولی کامل کی حیثیت سے جانتے اور مانتے، افسوس کہ آپ کا سال وفات مجھے نہ مل سکا۔

۱۱۔ مولانا محمد روشن خاں مراد آبادی

حضرت گنگوہی کے خلفاء میں ہیں، آپ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بیعت تھے، ابھی تعلیم ناتمام تھی آپ نے ان کو حکم دیا کہ آپ گنگوہ چلے جائیں اور حضرت گنگوہی کے درس حدیث میں شریک ہوکر تعلیم مکمل کرلیں، اور وہیں قیام کر کے علم باطن بھی حاصل کریں۔ انھوں نے حکم کی تعمیل کی، گنگوہ حاضر ہوکر سند حدیث حاصل کی اور وہیں مقیم ہوکر ذکر وشغل میں لگے رہے اور حضرت گنگوہی سے بھی بیعت ہوئے ان کے حالات وکیفیات کے مشاہدے کے بعد حضرت گنگوہی

نے ان کو خلافت دے دی اور مجاز بیعت بنادیا۔ آپ ریاست گوالیار میں بسلسلۂ ملازمت قیام پذیر تھے حضرت گنگوہی سے اجازت لے کر وہ لوگوں کو بیعت بھی کرتے تھے اور تعلیم و تربیت بھی دیتے تھے ذکر و شغل کا ذوق و شوق ان میں پیدا کر دیتے تھے، ایسے بہت سے افراد جنھوں نے سلوک و معرفت میں کمال پیدا کیا ان کو آپ کچھ دنوں کے لیے گنگوہ میں قیام کرنے کا بھی حکم دیتے تھے، حضرت گنگوہی مولانا موصوف کے تربیت دادہ لوگوں کے ظاہری و باطنی احوال کو دیکھتے تو انتہائی مسرت کا اظہار فرماتے تھے ان میں سے کچھ لوگوں کو حضرت گنگوہی کی طرف سے بیعت اور تعلیم و تربیت کی اجازت بھی حاصل ہو گئی۔

۱۲۔ مولانا حافظ قمرالدین سہارنپوری

آپ جامع مسجد سہارنپور کے امام و خطیب اور حضرت گنگوہی کے خلفاء میں سے تھے، عوام و خواص ان کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، حضرت گنگوہی کے خلیفہ مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے بھی آپ کو اجازت و خلافت حاصل تھی، مگر تواضع اور خاکساری اور اخفاءِ حال کا وہ حال تھا کہ کبھی ان نسبتوں کا ذکر بھی زبان پر نہیں لاتے تھے جو حضرت گنگوہی اور مولانا خلیل احمد صاحب سے حاصل تھیں۔

۱۳۔ مولانا قاری مغیث الدین سادھوڑوی

حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ تھے ضلع انبالہ (پنجاب) میں آپ سے بیعت ہونے والوں کی خاصی تعداد تھی پورے ضلع میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کا بیان ہے کہ

آپ صاحب احوال بلند مراتب ارجمند ہیں، آپ کے فیوض و

برکات پنجاب کے بعض اضلاع خصوصاً انبالہ کے گرد و نواح میں زیادہ شاداب اور بہرہ یاب ہیں۔(۱)

۱۴۔ مولانا قادر علی دہلوی

حضرت گنگوہی کے خلفاء میں آپ کا بھی شمار ہے، آپ دہلی کے رہنے والے تھے، مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مولانا محمد احسن نانوتوی اور مولانا یعقوب علی خاں بریلوی شاگرد شاہ اسحاق محدث دہلوی کے تعاون سے بریلی شہر میں حافظ جعفر علی خاں کی کوٹھی واقع بازار کلاں کے زیریں حصہ میں ۱۲۸۹ھ میں ایک مدرسہ مصباح التہذیب المعروف بہ مصباح العلوم کے نام سے قائم کیا تھا اسی مدرسہ میں حضرت نانوتوی نے مولانا عبدالقادر دہلوی کو مدرس اول بنایا تھا اسی مدرسہ میں عرصہ تک تعلیم دیتے رہے ایک سال کے بعد جب حضرت گنگوہی کے حکم پر مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری بریلی آئے تو ان کو صدر المدرسین بنادیا گیا اور مولانا عبدالقادر دہلوی مدرس دوم رہے، موصوف حضرت گنگوہی سے بیعت تھے بعد میں آپ کے خلیفہ مجاز بھی ہوے۔

دیگر خلفاء

۱۵۔ مولانا حافظ محمد صالح نکودری

۱۶۔ مولانا قدرت اللہ صاحب مراد آبادی

۱۷۔ مولانا عبدالصمد صاحب سونی پتی

۱۸۔ خان محمد یٰسین نگینوی

۱۹۔ مولانا صدیق احمد کاندھلوی

۲۰۔ مولانا محمد اکرام صاحب گرسہاے

---

(۱) تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۱۶۰

۲۱۔ شیخ عبدالغفور صاحب جے پوری

۲۲۔ مولانا داؤد احمد گنگوہی

۲۳۔ حاجی نصیر الحق صاحب کاندھلوی

۲۴۔ مولانا بہاؤالدین صاحب کابلی

۲۵۔ حافظ عبدالرحمن صاحب پورینی

۲۶۔ مولانا عبداللطیف صاحب بنگالی

۲۷۔ مولوی مخلص الرحمن صاحب بنگالی

۲۸۔ مولوی رمیض الدین صاحب بنگالی

۲۹۔ مولانا ضمیر الدین صاحب بنگالی

۳۰۔ قاری محمد ابراہیم صاحب بنگالی

۳۱۔ مولانا عبدالباری صاحب بنگالی

مذکورہ بالا خلفاء کی فہرست حضرت گنگوہی کے سوانح نگار مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے اپنی کتاب میں دی ہے، یہ فہرست مستند ہے کیوں کہ مصنف خود حضرت گنگوہی کے صحبت یافتہ ہیں ان خلفاء میں اکثر آپ کے تلامذہ ہیں بالخصوص بنگال و بہار کے جو خلفاء ہیں وہ یقیناً حضرت گنگوہی کے شاگرد ہیں انھوں نے گنگوہ میں رہ کر حضرت گنگوہی سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حدیث بھی حاصل کی اور فراغت کے بعد خانقاہ میں مقیم رہ کر سلوک و طریقت کی راہ طے کرلینے کے بعد حضرت گنگوہی کی طرف سے ان کو دستار خلافت بھی دی گئی، بقیہ دوسرے خلفاء کے حالات تذکروں میں نہیں آئے اس لیے صرف ناموں پر اکتفا کیا گیا۔

واللہ اعلم بالصواب

باب ۲۱

بدعات اور مشرکانہ رسم و رواج و عقائد کے خلاف جہاد

حضرت گنگوہی کا دور وہ ہے جب مسلم معاشرہ میں بدعات و خرافات اور مشرکانہ رسم و رواج کا آغاز ہو چکا تھا، مسلم عوام ہندو معاشرہ سے متاثر ہو کر بہت سی ایسی رسموں میں مبتلا ہو چکے تھے جن کی اسلام میں گنجائش نہیں تھی، ہندوؤں میں جو مذہبی رسوم مروج تھیں ان میں مندروں پر سالانہ میلے ٹھیلے اور درشن کے نام پر چڑھاوے ہوتے تھے، گانے بجانے، کیرتن اور رامائن کے پاٹھ کیے جاتے تھے، دور دور سے یاتری ہندو زائرین مخصوص مندروں میں جاتے اور میلے میں شرکت کرتے اور بتوں پر اپنی اپنی منتوں کے مطابق چڑھاوے چڑھاتے تھے، اسی طرح ہندو اپنے رشیوں منیوں کی جینتی اور سال گرہ مناتے رقص و سرود کی محفلیں سجاتے تھے، ان تمام کاموں کو پن اور ثواب کا کام سمجھتے تھے سال کے مختلف مہینوں میں ہندو یاتریوں کے جتھے مختلف علاقوں کے مندروں تک پہونچتے رہتے ہیں اور لاکھوں کی بھیڑ ہوتی رہتی تھی اور آج بھی یہ یاترائیں پورے شباب پر ہیں، کشمیر کے ایک مندر میں سالانہ بیس بائیس لاکھ یاتری درشن کے لیے پہونچتے ہیں اور کروڑوں روپے کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ مسلم عوام جو ناخواندہ بھی تھے اور اسلامی تعلیمات سے ایک حد تک ناواقف بھی وہ ان مناظر کو دیکھتے تھے اور متاثر ہوتے تھے، اس میں بڑا اولہانہ پن کا اظہار ہوتا ہے انھوں نے اپنے مذہب میں اس

کے امکانات کا جائزہ لیا، جاہل صوفیا مصنوعی پیروں نے ان کو ان کی دلچسپی کے مطابق بزرگوں کے مزاروں اور قبروں کی طرف رہنمائی کردی یہ عوامی مزاج کے مطابق کام تھا ان پڑھ اور ناخواندہ عوام کار ثواب سمجھ کر اولیاء اللہ کے مزارات اور قبروں پر عرس کے نام پر سالانہ میلہ لگانے لگے، منتیں مرادیں مانگنے اور چڑھاوا چڑھانے کی رسم ایجاد کرلی اور ٹھیک وہی سب کچھ کرنے لگے جو انھوں نے برادران وطن کے میلوں ٹھیلوں میں دیکھا تھا، قوال بلائے جانے لگے، سماع کے نام سے قوالی کی محفلیں جمنے لگیں، علماء سوء اور مصنوعی پیروں کی جماعت ان کے سُر اور لے پر جھومنے لگی، محفل پر رنگ آنے لگا، جاہل عوام قبروں پر ٹوٹ پڑے۔

ہندوؤں کی طرح، مردے کا تیجہ، چہلم، ششماہی اور برسی منانے کا طریقہ اختیار کیا، چادر گاگر کے نام سے عرس کی تقریبات میں رونق بڑھائی جانے لگی، شیعوں نے تعزیے بنا کر درگا مورتی اور کنھیا کا جنم اور کالی مائی کی طرح کے جلوس کی بنیاد ڈال دی اور باقاعدہ میلے ٹھیلے کا موقع فراہم کردیا، ہندوستان کے چند لاکھ شیعوں نے ملک کے کروڑوں کروڑ سنی مسلمانوں کو اس مشرکانہ رسم و رواج میں ملوث کردیا یہ سب کام اہلسنّت والجماعت نے اپنے ذمہ لے لیا شیعہ دور کے تماشائی بن گئے، محرم کے دس دن ہندوستان کے عام مسلمانوں کے نزدیک اہم ترین دن بن گئے یہ تو ظاہری افعال و اعمال اور عوامی کردار تھے، اس سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ مسلمانوں کے عقائد تباہ و برباد ہو رہے تھے وہ اولیاء اللہ کو مختار کل سمجھنے لگے ان کو مقامِ الوہیت پر بٹھادیا وہ مزاروں پر جاتے براہ راست ان سے فریاد کرتے ان سے دعائیں کرتے اپنی حاجتیں اور مرادیں ان سے مانگتے کیوں کہ ان کا عقیدہ بن چکا تھا کہ یہ حضرات جو چاہیں کرسکتے ہیں وہ خدا اور بندے کے درمیان واسطہ اور سفارشی نہیں

بلکہ خود ہی مالک کل بن چکے ہیں، ناخواندہ عوام کے ذہن میں قبر کے مجاوروں اور جاروب کشوں نے یہ عقیدہ بٹھادیا تھا کہ یہ بزرگ جو چاہیں کر سکتے ہیں، فساد عقیدہ کا یہ مرض بتدریج بڑھتا جارہا تھا اور یہ گمراہی عام ہوتی جارہی تھی، یہ بدعات اور یہ رسم و رواج جو شریعت کے مزاج کے بالکل خلاف تھیں عوام میں ان کے آباء و اجداد سے چلی آرہی تھیں، لوگ صحیح معنی میں اپنی لاعلمی کی وجہ سے کار ثواب سمجھتے تھے اور بڑے خلوص سے ان کاموں کو کرتے تھے، یہی جہالت، لاعلمی، مسائل شریعت سے ناواقفیت ہی مروجہ بدعتوں کی اصل وجہ تھی، عوام کو شریعت کے صحیح احکام نہیں بتائے گئے، قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کو اسلامی تعلیم نہیں دی گئی، اور وہ صرف غلط فہمی کی وجہ سے ان مشرکانہ رسم و رواج میں مبتلا ہو گئے، وہ اپنے جذبات میں مخلص تھے لیکن طریقہ ان کو غلط بتایا گیا وہ ایمان و اسلام کی راہ پر چلنے کے جذبے سے یہ کام کر رہے تھے لیکن ان کو غلط راستہ پر لگادیا گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ جب علماء حق نے اصلاحی مہم شروع کی، عوام کو ان کی غلطیوں سے آگاہ کیا اور دین و شریعت کی صحیح تعلیمات سے باخبر کیا تو عوام نے اس کو بڑی صدق دلی اور اخلاص سے قبول کر لیا، ان کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوا کہ ہم جن کاموں کو ثواب سمجھ کر کر رہے ہیں ان میں ثواب کے بجائے عذاب کا اندیشہ ہے بات ان کی سمجھ میں آجاتی تھی اور وہ ان سے توبہ کر کے صراط مستقیم پر آجاتے تھے، مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی، مولانا عبدالحئی بڈھانوی کی تقریروں نے جو انقلاب عظیم پیدا کیا اور ہزاروں ہزار بہکے اور بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو دین کی صحیح راہ پر آنے کی جو توفیق ملی اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ غلط فہمی کی وجہ سے ان رسم و رواج میں مبتلا تھے، ان علماء نے ان کی غلطی ان کو سمجھادی تو انھوں نے ان سے توبہ کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔

رضاخانی فرقہ

لیکن حضرت گنگوہی کے دور میں صورت حال بدل چکی تھی، اب کچھ ایسے علماء پیدا ہو چکے تھے جنھوں نے ان تمام بدعات و خرافات اور مشرکانہ رسم و رواج کو دلیل سے صحیح اور کار ثواب ثابت کرنے کی مہم شروع کردی تھی، بدعات و خرافات کی حمایت و تائید میں ایک منظم اور طاقتور تحریک چلائی وہ عوام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرنے لگے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو وہی صحیح دین ہے وہی شریعت کی منشا ہے اصل اسلام یہی ہے جو لوگ عرس، میلاد، تیجہ، چہلم اور فاتحہ وغیرہ کو غلط کہتے ہیں وہ خود گمراہ اور کافر و مشرک ہیں، اس مہم کے سربراہ اور سپہ سالار لشکر مولوی احمد رضا خاں بریلوی تھے، انھوں نے پوری طاقت سے یہ مہم چلائی کہ اصلاح کا نام اور کام کرنے والوں پر جوابی حملہ شروع کر دیا جائے اور یہ کام انھیں کو اپنے ساتھ لے کر انجام دیا جا سکتا تھا جو ان بدعتوں میں مبتلا تھے، وہ آنکھ بند کر کے ان کے جھنڈے کے نیچے آگئے اور علماء حق کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی، اب عوام کی اصلاح انتہائی دشوار ہو گئی کیونکہ اب ان کو اپنی گمراہیوں کے لیے سند جواز ملنے لگی اب ان بدعات و مشرکانہ رسم و رواج کو کار ثواب ہونے کا یقین دلایا جانے لگا، ان کے جواز میں قرآن و حدیث کا نام لیا جانے لگا، بزرگوں کے ملفوظات سنائے جانے لگے، اولیاء اللہ کے مافوق الفطرت کمالات و کرامات کو زور شور کے ساتھ بیان کیا جانے لگا، اب عوام اپنی اصلاح کرنے والوں کو دوست و ہمدرد کے بجائے اپنا ہی نہیں اسلام کا دشمن سمجھنے لگے۔

اگرچہ حضرت گنگوہی کے دور میں مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کو بریلی کے باہر کے کم ہی لوگ جانتے تھے لیکن انھوں نے

چھوٹے چھوٹے رسائل لکھ کر جس زور و شور کے ساتھ مصلحین اُمت کے خلاف کافرگری کی مہم چلائی اس نے بہت جلد اپنا ایک حلقہ بنالیا، علماء بدایوں و بریلی کے ہم خیال ہندوستان کے مختلف شہروں میں موجود تھے مگر ابھی وہ ایک محاذ پر جمع نہیں ہوئے تھے البتہ اپنے اپنے حلقہ اثر میں مختلف طرح کی بدعتوں میں عوام کو مبتلا کر کے ان بدعتوں کے خلاف آواز اٹھانے والوں سے برسرپیکار اور مورچہ سنبھالے ہوئے تھے، مولوی فضل رسول اور(۱) ان کے صاحبزادے مولوی عبدالقادر بدایونی(۲) اور

---

(۱) مولانا فضل رسول بدایونی کی ولادت صفر ۱۲۱۳ھ بدایوں میں ہوئی تھی ان کے والد کا نام عبدالحمید عثمانی تھا ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر لکھنؤ جا کر مولانا نور بن انوار انصاری لکھنوی سے تعلیم حاصل کی، پھر دھولپور جا کر حکیم پیر علی سے طب پڑھی اور وہیں علاج معالجہ کرنے لگے پھر بدایوں لوٹ کر آئے مگر جلد ہی بنارس چلے گئے یہاں بھی مطب ہی کو ذریعہ معاش بنایا، پھر حج وزیارت کے لیے حجاز گئے وہاں بعض علماء سے سند حدیث حاصل کی پھر بغداد جا کر وہاں سید علی سے بیعت ہوئے اتفاق سے ریاست حیدر آباد پہنچ گئے اور نواب کی ان پر نظر عنایت ہو گئی غالی اور شدید قسم کے مبتدع تھے علماء حق سے جنگ وجدال کے رسیا تھے، زبان میں تلوار کی کاٹ تھی مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی کو کافر کہتے تھے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مجدد الف ثانی کی شخصیتیں بھی ان کے زہر آلود تیروں سے محفوظ نہ رہ سکیں ایک درجن کے قریب ان کی تصانیف ہیں زیادہ تر میلاد، عرس، قبروں پر چادر چڑھانے اور میلاد میں قیام کے مسائل پر ہیں جمادی الآخر ۱۲۸۹ھ میں ۷۷ سال کی عمر میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر، ص: ۳۷۷)

(۲) مولانا عبدالقادر بدایونی یہ مولانا فضل رسول بدایونی کے صاحبزادے ہیں باپ کی خصوصیات بیٹے میں بدرجہ اتم تھیں ان کی ولادت ۱۲۵۳ھ میں بدایوں میں ہوئی وہیں نشو نما پائی ان کی تعلیم مولوی نور احمد بدایونی اور فضل حق خیر آبادی کے یہاں ہوئی پھر حرمین شریفین کی زیارت کے لیے گئے وہاں شیخ جمال عمر مکی سے سند حدیث حاصل کی اور لوٹ کر ہندوستان آئے یہ بھی اپنے والد محترم کی طرح جنگ جو مناظر، بحث ومباحثہ کے رسیا، اور ہمہ وقت پینترے پر کھڑے رہتے تھے، اپنے والد کی طرح نذر و نیاز اولیاء عرس قبروں پر چڑھاوا چڑھانے، قبروں پر چراغاں کرنے مجلس میلاد مروجہ اور قیام کے اثبات میں بہت پر جوش تھے اور عام علماء حق کی تکفیر میں وہ شمشیر بے نیام تھے۔ ان کے خلاف سب وشتم میں ان کی زبان بے لگام تھی ان کی کئی کتابیں ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف سیف الاسلام المسلول علی المناع لعمل المولود والقیام واحسن الکلام فی تحقیق عقائد الاسلام، حقیقۃ الشفاعۃ علی اہل السنۃ والجماعۃ، شفاءالسائل بتحقیق المسائل، ان کا انتقال ۱۳۱۹ھ میں بدایوں میں ہوا (نزہۃ الخواطر، ج: ۸، ص: ۲۷۵)

مولوی عبدالحامد بدایونی اور مولوی ہدایت رسول وغیرہ بدعات کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیئے ہوئے تھے اور بدعات کے خلاف جہاد کرنے والوں پر سب وشتم کے تیر برسا رہے تھے۔

میاں نذیر حسین دہلوی

دوسری خصوصیت اس دور کی یہ تھی کہ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سورج گڑھ ضلع مونگیر بہار کے رہنے والے ایک صاحب نے شاہ اسحاق محدث دہلوی سے حدیث پڑھی اور سند فراغت حاصل کی ان کا نام مولانا نذیر حسین بہاری تھا جو بعد میں شیخ الکل فی الکل میاں سید نذیر حسین دہلوی(۱) کے معزز خطاب سے نوازے گئے، انہوں نے اکثر مسائل میں امام شافعی کا مسلک اختیار کرلیا مگر ان کی تقلید کے قائل نہیں تھے قراۃ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین وغیرہ کی عملاً پابندی کرنے لگے وہ تعلیم سے فراغت کے بعد پنجابی کٹرہ کی مسجد کی ایک کوٹھری میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے اور چند طلبہ کو مسجد میں پڑھانے لگے، بعد میں ان کے تلامذہ کا دائرہ وسیع ہونے لگا، اس دوران شاہ اسحاق محدث دہلوی شاہ محمد یعقوب محدث

---

(۱) مولانا شاہ نذیر حسین دہلوی، آپ کی ولادت سورج گڑھ ضلع مونگیر بہار میں ۱۸۱۵ء مطابق ۱۲۲۰ھ میں ہوئی ۱۲۴۲ھ میں سورج گڑھ سے دہلی آئے حدیث وتفسیر شاہ عبدالقادر دہلوی اور شاہ رفیع الدین دہلوی اور شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی سے پڑھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد دہلی میں آپ نے سلسلہ تدریس جاری کیا اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی ان کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ان کے موجودگی میں ہوا اس دور ابتلاء میں انہوں نے ایک یورپین لیڈی کی جان بچائی او، اپنے گھر میں محفوظ رکھا جب ہنگامہ فرو ہوا اور وہ یورپین عورت اپنے عزیزوں میں گئی تو انگریزی حکومت نے اس خدمت کے صلہ میں مولانا موصوف کو شمس العلماء کا خطاب دیا اور دوسری مراعات بھی دیں، جید عالم تھے ہندوستان میں غیر مقلد فرقہ کے دوبانی ہیں، کئی کتابوں کے مصنف ہیں آپ کی وفات دہلی میں ۱۳۲۰ھ میں ہوئی قبرستان شیدی پور میں مدفون ہیں (کاروان رفتہ، ص: ۲۵۳)

دہلوی ہندوستان سے بہ نیت ہجرت حجاز چلے گئے تو ان کے درس کو شہرت حاصل ہونی شروع ہوئی۔ وہ کسی امام کی تقلید کے قائل نہیں تھے، یہاں تک تو غنیمت تھا مزید ستم یہ ہوا کہ انہوں نے حنفیوں کے خلاف ایک محاذ کھول دیا اور احناف کو دعوت مبارزت دینے لگے، وہ اپنے تلامذہ کو اپنی تحریک کے پھیلانے میں استعمال کرنے لگے اور ان کے دلوں کو جوش و جذبے سے بھر دیا تا کہ وہ دیوانہ وار اس تحریک کو لیکر آگے بڑھیں۔ ان کے تلامذہ نے پورے ملک میں میاں نذیر حسین صاحب کے مسلک کی بھرپور وکالت کی اس کو پھیلایا اور اس کی اشاعت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا، جن جن علاقوں کے ان کے شاگرد تھے ان علاقوں میں انہوں نے میاں نذیر حسین صاحب کے مسلک کی اشاعت کی بقیہ ملک اور حصوں میں ان کو کوئی خاص کامیابی نہیں ملی، اسی لیے ہمارے ملک میں کچھ خاص علاقے ہیں اور صوبوں میں کچھ مخصوص خطے ہیں جہاں جہاں میاں نذیر حسین صاحب کے مسلک پر عمل کرنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔

چوں کہ میاں نذیر حسین صاحب کا مرکز نشر و اشاعت دہلی میں تھا اس لیے دہلی سے قریب ترین اضلاع تک ان کی تبلیغی سرگرمیوں کی اطلاع پہنچتی رہتی تھی انہیں علاقوں میں حنفیوں کے مراکز علمی اور مدارس تھے اور احناف کے جلیل القدر علماء ان کی خانقاہیں ان کی درسگاہیں ان کے مراکز اصلاح و تبلیغ تھے اس لیے دہلی سے چلنے والا لٹریچر ان علاقوں میں پہنچتا رہتا تھا عوام پر اس کا رد عمل بھی ہوتا تھا میاں نذیر حسین صاحب کے مسلک پر عمل کرنے والے کسی امام کی تقلید کو غلط کہتے تھے وہ علی الاعلان کہتے تھے کہ کسی امام کی تقلید ضلالت و گمراہی ہے اور جائز نہیں ہے اس لیے دوسرے لوگ ان کو غیر مقلد کہنے لگے بد قسمتی سے یہ غیر مقلدین علمی، دینی اور شرعی مسائل پر گفتگو اور بحثوں میں

انتہائی جارحانہ رویہ رکھتے تھے، زبان و قلم سے وہ تیر و نشتر کا کام لیتے تھے اس لیے احناف میں اس کا رد عمل بھی شدید ہوتا تھا، سوال و جواب اور جواب الجواب کا ایک چکر چل پڑا تھا اس دور کے علماء کے ذہن و مزاج پر اس فضا کا اتنا زبردست اثر تھا کہ اس وقت لکھی جانے والی کتابوں اور رسالوں کا بہت بڑا حصہ انہیں دونوں گروہوں کے اختلافی مسائل پر مشتمل ہے اس دور کے ہر بڑے اور ممتاز عالم کی اس بحث میں شرکت جیسے ضروری ہو چکی تھی یا مجبوری بن چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ اکثر اکابر کے یہاں یہ بحثیں پوری بسط کے ساتھ پائی جاتی ہیں احادیث کی شروح میں تو مختلف فیہ مسائل میں خوب خوب داد تحقیق دی گئی ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی

حضرت گنگوہی کے دور ہی میں مرزا غلام احمد قادیانی نے ایک اسلامی مناظر سے ترقی کر کے نبوت کے منصب جلیل پر چھلانگ لگادی تدریجی طور پر اس میں جو ذہنی فساد پیدا ہوا جس کا آخری انجام دعوائے نبوت ہوا یہ پورا دور حضرت گنگوہی کے عہد میں ہوا بلکہ اس کی موت بھی آپ کے دور ہی میں ہوئی، اگرچہ قادیانیت کا دائرہ بہت ہی محدود تھا، ابھی ملت اسلامیہ کے لیے خطرناک فتنے کی شکل اختیار نہیں کی تھی مگر اس کے برگ وبار نظر آنے لگے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی (۱) کے

---

(۱) مرزا غلام احمد قادیانی کی ولادت قادیان (پنجاب) میں ۱۴ر شوال ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۳ر فروری ۱۸۳۵ء کو ہوئی مشہور مدعی نبوت فرقہ احمدیہ کا بانی ہے اس کے والد انگریزی حکومت میں ملازم تھے پہلے صحیح العقیدہ مسلمان تھا عیسایوں اور آریوں سے مناظرہ کرتا تھا جب مقبولیت بڑھی تو نبوت کا دعویٰ کر دیا وہ زود نویس مصنف تھا اس کی تصنیفات کی تعداد ۸۴ ہے۔ تقسیم ملک کے بعد اس فرقہ نے پاکستان میں ربوہ کے مقام پر اپنا دوسرا مرکز بنایا۔ حکومت پاکستان نے فرقہ احمدیہ کو غیر مسلم فرقہ قرار دیا ہے اور ہندوستان میں اس فرقہ کا مرکز قادیان ہے جو پنجاب میں واقع ہے۔ اس کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہوا (کاروان رفتہ اسیر ادروی)

ابتدائی دور میں عیسائیت اور آریہ سماجوں کی جارحیت اپنے شباب پر تھی یہ بھی پڑھا لکھا اور اسلامیات کا اچھا مطالعہ کئے ہوئے تھا، عام علماء اسلام کی طرح وہ بھی عیسائی مشنریوں پادریوں اور آریہ سماجیوں سے اسلام کا وکیل بن کر مناظرے کرتا تھا، حالات، ماحول اور تقاضائے وقت نے علماء اسلام کو کامیابی دی اور آہستہ آہستہ یہ دونوں فتنے مر گئے اور ان کی جارحیت کا دور ختم ہو گیا، مناظروں کی وہ گرم بازاری نہیں رہی۔ انگریزی حکومت نے تبلیغ عیسائیت کی پالیسی میں تبدیلی کر دی اور پادریوں کا جارحانہ رویہ از خود بدل گیا اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں پر از خود اوس پڑ گئی اور بڑی حد تک مسلمان ان کے زہریلے تیروں سے محفوظ ہو گئے۔ آریہ سماج نئی انگریزی حکومت کا نوزائیدہ پودا تھا حکومت کے تعاون کے سہارے چلتا رہا۔ جب عیسائیت کی حد بندی ہو گئی تو آریہ سماج کی زبانوں میں خود لگام پڑ گئی اسی زمانہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کو کافی شہرت اور مسلمانوں کے ایک طبقہ میں مقبولیت حاصل ہو چکی تھی اب اس کے دل و دماغ میں فتور آنا شروع ہوا اور اس نے اپنے الہامات کا تذکرہ مجلسوں میں کرنا شروع کیا پھر کچھ دنوں کے بعد اس پر وحی آنے لگی کچھ دن مہدی موعود بنا رہا اور زینہ بہ زینہ نبوت تک پہنچ گیا اسلامی تاریخ میں مسیلمہ کذاب، اسود عنسی اور سجاح مدعیان نبوت کی فہرست میں ایک اور مصنوعی نبی کا اضافہ ہو گیا، پھر اس نے پر زے نکالے آہستہ آہستہ اس پر ایمان لانے والے بھی پیدا ہوتے گئے اور بہت سے مسلمان خاندان مرتد ہو گئے۔

حضرت گنگوہیؒ کے زمانہ میں وہ رہا آپ کے سفر آخرت پر روانہ ہونے کے بعد وہ اس دنیا سے گیا اور اس حال میں گیا کہ اپنے پیچھے اس نے ایک طاقتور جماعت چھوڑی اور ساری دنیا میں اس کی سرگرمیاں جاری ہوتی چلی گئیں۔

پہلا محاذ

حضرت گنگوہی تاریخ کے اسی دور میں مسند ارشاد و اصلاح سنبھالے ہوئے تھے نظریاتی اعتبار سے مسلمانوں میں یہ تین محاذ تھے تینوں نوزائیدہ اور نئی عمروں کے تھے اس لیے ان میں جوش و خروش تھا اور طاقت و قوت تھی اقدام اور پیش قدمی کرنے کا حوصلہ بھی یہ حقیقت رہی کہ ہندوستان میں تخت حکومت پر ہمیشہ اہلسنت والجماعۃ کا قبضہ تھا اور ہندوستان سے نکل کر افغانستان تک امام ابو حنیفہؒ کے مسلک پر عمل کرنے والے تھے۔ یہاں شافعی المسلک طبقہ سوائے بعض ساحلی علاقوں کے اور کہیں نہیں تھا میاں نذیر حسین صاحب دہلوی کا عمل تو فقہ شافعی پر تھا مگر تقلید ائمہ ان کے نزدیک حرام تھی اس لیے ان کی جماعت کا ہر فرد مجتہد اور درجہ اجتہاد پر فائز تھا وہ تعلیم یافتہ ہو یا جاہل کندہ ناتراش وہ کسی کے مسئلہ بتانے پر عمل نہیں کرے گا کیوں کہ تقلید حرام ہے جب وہ ائمہ اربعہ کی تقلید نہ کرسکا جن کے سامنے ساری اسلامی دنیا کی گردنیں ادب و احترام سے جھکی ہوئی ہیں تو وہ ایرے غیرے کی تقلید کیسے کرسکتا تھا میاں نذیر حسین صاحب دہلوی اور ان کی جماعت اس عقیدہ پر قائم تھی کہ ہر شخص فطرتاً مجتہد پیدا ہوتا ہے اور قدرت نے اس کو صلاحیت بخشی ہے کہ وہ براہ راست خود حدیث و قرآن سے استنباط مسائل کرنے لگے اور عبرتناک بات یہ تھی کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی قرأت خلف الامام آمین بالجہر اور رفع یدین کو حدیث و قرآن سے سمجھ کر ان پر سختی سے عمل کرتے تھے یہ اسلام میں ایک انقلابی تحریک تھی اس کی جارحیت کا شکار علماء دیوبند تھے۔

دوسرا محاذ

دوسرا محاذ بریلی میں تھا اگرچہ اس طبقہ نے بریلی کے مرکز ہونے

سے بہت پہلے جنگ کا آغاز کر دیا تھا بریلی اور بدایوں کے علماء فتوحات کا دروازہ کھولے ہوئے اپنے اپنے شہروں میں محصور تھے وہ پیش قدمی اور اقدام کرنے والے ذہن و مزاج کے نہیں تھے اس طبقہ کی جانب سے سہارنپور ضلع کے ایک معمولی قصبہ رام پور کے مولوی عبدالسمیع رام پوری نے اعلان جنگ کیا اور انوار ساطعہ کے نام سے ایک کتاب لکھ کر پہلا حملہ کیا، حضرت گنگوہی کے ایماء سے مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے براہین قاطعہ لکھ کر اس حملہ کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

حضرت گنگوہی کی ہمہ جہتی خدمات

حضرت گنگوہی کو اسی ماحول میں دین کی خدمت انجام دینی تھی اور اسلام کو ہر طرح کے باطل نظریوں اور عقیدوں سے محفوظ رکھنا تھا آپ کی پوری زندگی اسلام کے لیے جدو جہد سے عبارت تھی ایک طرف آپ مسند ارشاد و سلوک پر متمکن ہو کر تزکیہ باطن اور تعلق مع اللہ کے پاکیزہ مشغلہ میں لگے ہوئے تھے دوسری طرف ابتدا ہی سے آپ نے دینی تعلیم حسبتاً للہ گنگوہ میں جاری کر رکھی تھی اپنے گھر اپنی خانقاہ اور مسجد میں دینی علوم پڑھا رہے تھے پھر آپ کی ساری توجہ احادیث نبوی کی تعلیم و تدریس پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ اس طرح علم ظاہر و علم باطن دونوں کی تعلیم کی وجہ سے اس دور میں آپ کی ذات مرکز ہدایت بن چکی تھی اور دور دراز سے طالبان علوم نبوی گنگوہ پہنچ رہے تھے۔

تیسری خصوصیت حضرت گنگوہیؒ کی یہ تھی کہ فقہ میں آپ کو حد درجہ کمال حاصل تھا علماء حق متفقہ طور پر آپ کو فقیہ النفس کے معزز لقب سے یاد کرتے تھے اس لیے مسائل شرعیہ میں بالخصوص مختلف فیہ اور اہم ترین مسائل میں آپ ہی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ اور آپ

بلا خوف لومۃ لائم ان تمام مسائل میں دوٹوک شرعی حکم بتادیتے تھے جن میں ہندوستان کے مسلمان بالعموم غلطی سے مبتلا تھے اور اس کے خلاف کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھے، بدعات وخرافات، مشرکانہ عقائد، خلاف شرع رسم ورواج جن کو دین میں داخل کر کے علماء اور مصنوعی صوفیاء قبروں کے مجاوروں نے اسلام کے صاف شفاف دامن پر دھبہ ڈال دیا تھا۔ آپ بڑی سختی سے ان بدعتوں کی تردید فرماتے تھے اس لیے ان لوگوں کی نگاہوں میں معتوب تھے جو ان بدعات اور غیر اسلامی امور کی حمایت وتائید کی وجہ سے جاہل عوام کی نگاہوں میں اعزاز واحترام سے دیکھے جاتے تھے، حضرت گنگوہی کو وہ اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے اس لیے آپ کے خلاف انہوں نے ایک منظم مہم شروع کردی۔

تیسرا محاذ

تیسرا محاذ مرزا غلام احمد قادیانی نے کھول رکھا تھا اس کی حیثیت مسلمانوں میں ایک فرقہ یا گروہ کی نہیں تھی بلکہ یہ ایک نیا مذہب تھا، جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ مذہب اسلام کو مٹانے ہی کے لیے پیدا ہوا تھا اس کی حیثیت وہی تھی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کے دور افتادہ قبائل میں ارتداد پھیل گیا تھا اور اسلام کے پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کے خلاف باقاعدہ فوج کشی کرنی پڑی تھی، مرزا غلام احمد قادیانی کی حیثیت وہی مرتد ہونے والے قبائل کی تھی وہ مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی مدعیان نبوت کی طرح گردن زدنی تھا کیوں کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اس فتنہ سے مسلم فرقوں میں بلا استثناء غم وغصہ تھا بحیثیت مصلح حضرت گنگوہی اس فتنہ کی مستقبل میں شدت کا اندازہ لگا رہے تھے جب کہ ابھی یہ فتنہ اتنا خطرناک

نہیں تھا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس نے علی الاعلان اپنی نبوت کا اعلان کیا اور اسلام کی نقاب اُتار دی حضرت گنگوہی کی زندگی میں اس نے نبوت کا اعلان نہیں کیا تھا اسی لیے آپ کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی حضرت گنگوہی نے اپنی زندگی کے آخری سال میں یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ یہ شخص آئندہ اسلام کا بہت بڑا دشمن ہونے والا ہے، اس سے دور رہو۔

اصلاحی مہم فتاویٰ کی روشنی میں

اگر اسلامی ہند کے کسی دور کے تہذیبی، دینی، تعلیمی اور معاشرتی حالات کا جائزہ لینا ہو تو آپ کو اس دور کے فتاویٰ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس دور میں مسلمانوں کا ذہن و مزاج کیا تھا؟ ان کے رسم و رواج کیا تھے، ان کو کس طرح کے مسائل کا سامنا تھا، کس طرح کے عقائد کس طرح کے خیالات اور کس طرح کے معاشرتی امور تھے، شادی بیاہ ولادت و وفات کے موقعوں پر کس طرح کے رسوم اور کس طرح کی رواجی پابندیاں تھیں؟ ذہنی و فکری رجحانات کیا تھے؟ عوامی ذہنوں میں کس طرح کے عقیدے اور روزمرہ کی زندگی میں ان کے مظاہر کیا تھے؟ غرضیکہ پورے مسلم معاشرہ کی ایک واضح تصویر آپ کے سامنے آجائے گی اور جب اس دور کے فتاویٰ کی کتابوں کا مطالعہ کریں گے تو مذکورہ بالا تمام باتوں کا آپ کو جواب مل جائے گا۔

ہم نے اسی نقطۂ نگاہ سے فتاویٰ رشیدیہ کا مطالعہ کیا جو تین حصوں میں شائع ہو چکا ہے تو ہمارے سامنے حضرت گنگوہی کے دور کے مسلمانوں کے معاشرے کے مظاہر ہی نہیں بلکہ ذہنوں میں جس طرح کی خرافات اور توہمات جاگزیں تھے وہ ہماری نگاہوں کے سامنے آگئے، دین و شریعت

کے خلاف جو رسم و رواج ذہنوں پر حاوی تھیں جو مشرکانہ عقائد دلوں میں پیوست تھے ان کو صفحہ دل سے کھرچ کر مٹا دینا اور ان کی جگہ اسلام اور دین و شریعت کی اصل تصویر کو دل و دماغ کے چوکھٹے میں فٹ کرنا کچھ آسان کام نہیں تھا، حضرت گنگوہی نے اس مشکل کام کو انجام دیا۔

اب قدرے تفصیل کے ساتھ اس دور کے کچھ مذہبی مسائل آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ مسلمان کس طرح سادہ اور واضح اصولوں کو چھوڑ کر نئی نئی ایجاد کردہ بدعتوں اور خود ساختہ عبادتوں میں مبتلا تھے اور اسی کو اصل دین و شریعت سمجھتے تھے اور حضرت گنگوہی کس جرأت ایمانی سے کام لے کر مسلم معاشرہ کو غیر اسلامی طور طریقوں سے نجات دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

مجلس میلاد

پہلے اس کو مجلس میلاد، مولود شریف اور اب اس کو جشن میلاد النبی اور عید میلاد النبی کہا جاتا ہے اب یہ عید میلاد النبی حضرت گنگوہی کے دور سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ مجلس میلاد ہو گئی، مولوی احمد رضا خاں صاحب اور ان کے ہم خیالوں کے دور میں اس میلاد کا رواج تھا کہ ایک شخص اپنے گھر پر کچھ نو عمر میلاد خوانوں کو بلاتا تھا جو چار پانچ کی تعداد میں ہوتے تھے، اردو میں میلاد کی کوئی کتاب لے لیتے ان میں سے ایک صحیح غلط جھوٹی یا موضوع روایت کو پڑھتا تھا جہاں روایت کی نثر ختم ہوتی وہاں ایک نظم ہوتی روایت ختم ہوتے ہی پوری میلاد پارٹی لہرا لہرا کر ایک ساتھ نظم گا کر پڑھتی اور محفل میلاد کے خاتمہ کے وقت میلاد خواں کھڑے ہو جاتے اور ان کے ساتھ ساری محفل کھڑی ہو جاتی میلاد خواں اُردو کے چار مصرعے پڑھتے پھر میلاد خواں اور تمام حاضرین ایک ساتھ

یا نبی سلام علیک — یا حبیب سلام علیک

یا رسول سلام علیک — صلوات اللہ علیک

پڑھتے اور اس عقیدہ کے ساتھ یہ درود و سلام پڑھا جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں اس کے بعد محفل میلاد ختم ہو جاتی صاحب خانہ مٹھائی تقسیم کرنے کے لیے میلاد خوانوں کے سامنے حاضر کرتا وہ سامنے رکھ کر چاروں قل پڑھتے اور دو تین قرآن کی اور آیتیں پڑھ کر فاتحہ کیا جاتا پھر وہ مٹھائی حاضرین میں تقسیم کر دی جاتی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے، اس محفل کو بہت بڑا کار ثواب اور اپنے مسلمان اور عاشق رسول ہونے کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔

اب اس محفل میلاد نے بہت ترقی کر لی ہے، بدعت کی تعریف ہی یہ ہے کہ ہر دور اور ہر علاقہ میں وہ نئی نئی شکلیں اختیار کرتی ہے، اب جشن میلاد النبی یا عید میلاد النبی پر لمبی لمبی رقمیں خرچ کی جاتی ہیں جو ایک آدمی کے بس کی بات نہیں اس کے لیے اجتماعی چندے کیے جاتے ہیں ۱۲ ربیع الاول کو ہزاروں بلب اور راڈ کی روشنی کی جاتی ہے، بلبوں کی جھالریں مکانوں اور دکانوں پر لگائی جاتی ہیں جیسے دیوالی میں برادران وطن کے یہاں ہوتا ہے، دن میں ہزاروں آدمیوں کا جھنڈے اور بینر کے ساتھ جلوس نکلتا ہے، لاؤڈ اسپیکر پر درجنوں نوجوان نظم خوانی کرتے ہیں یہ جلوس متعینہ راستوں اور شاہراہوں سے گشت کرتا ہوا تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد نعرۂ رسالت یا رسول اللہ۔ نعرۂ غوثیت یا غوث اور آخر میں ایک بار نعرۂ تکبیر اللہ اکبر بلند کیا جاتا ہے اور شام کو یہی جلوس محفل میلاد کی شکل میں بدل جاتا ہے، اس میں بھی ابتداء سے انتہا تک سارا زور نظم خوانی پر ہوتا ہے ایک یا دو تقریریں ہوتی ہیں رات گئے پورا مجمع درود و سلام والی نظم پڑھتا ہے اور محفل میلاد ختم ہو جاتی ہے، بعد کا یہ طریقہ دوسری اقوام کے

اپنے پیشواؤں کے جنم دن منانے اور دھوم دھام کرنے کا رواج ہے یہ محفل میلاد اسی کی نقل ہے۔

مروجہ محفل میلاد حضرت گنگوہی کی نظر میں

حضرت گنگوہیؒ کے مجموعہ فتاویٰ "فتاویٰ رشیدیہ" میں ہر مسئلہ سے زیادہ اسی محفل میلاد کے بارے میں استفتاء اور اس کے جوابات ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں گھر گھر یہ محفلیں عام طور پر کار ثواب سمجھ کر عام طور پر منعقد ہوتی تھیں اور اس کے طریقہ پر اعتراض ہونے لگا تو ہر سمت سے استفتاء آنے لگے اور کثرت سے آنے لگے، آپ ابتداءً تو مفصل اور دلائل کے ساتھ جواب دینے کا اہتمام فرماتے تھے، بعد کے دور میں جب یہ دلائل عام ہوگئے تو آپ نے مختصر جواب دینا شروع کردیا وہاج احمد مراد آبادی کے جواب میں تحریر فرمایا

> "مجلس مولود مروجہ بدعت ہے، اور بسبب خلط امور مکروہہ کے مکروہ تحریمہ ہے، اور قیام بھی بوجہ خصوصیت کے بدعت ہے اور امرد لڑکوں کا پڑھنا راگ میں بہ سبب اندیشہ ہیجان فتنہ کے مکروہ ہے۔(۱)

فتاوی رشیدیہ میں میلاد مروجہ کے سلسلہ میں سوالات اور استفتاء کی ایک لمبی فہرست ہے ص ۱۰۵ پر ایک استفتاء احمد سعید خاں مراد آبادی کی طرف سے، ص ۱۰۶ پر عزیز الدین مراد آبادی کا سوال مجلس میلاد مروجہ سے متعلق ہے ص ۱۱۱ پر محمد نبی مراد آبادی کا استفتاء ص ۱۱۵ ص ۱۱۹ ص ۱۲۲ ص ۱۳۲ پر نواب چھتاری کی طرف سے مجلس میلاد مروجہ کے متعلق ایک استفتاء مذکور ہے ص ۱۳۶ پر ضلع بجنور کے ایک استفتاء کا جواب ہے ص ۱۴۱ ص ۱۴۷ ص ۱۴۸ پر میلاد مروجہ سے متعلق سوالات ہیں اور ان کے جوابات حضرت گنگوہی کی طرف سے دیے گئے ہیں جن

(۱) فتاویٰ رشیدیہ، ص: ۱۰۳

میں بعض مختصر ہیں بعض میں اپنا نقطہ نظر اور اصل مسئلہ بتادیا گیا ہے اور بعض جوابات بہت مفصل ہیں، اور اگر حضرت گنگوہی کا جواب مختصر اور اشاروں پر مبنی ہے، تو اس جواب کی تصویب کرنے والوں کی طرف سے اس کی تشریح و تفصیل پیش کر دی گئی ہے، نواب کنور محمد عبدالصمد خاں خلف الصدیق نواب محمد محمود علی خاں صاحب بہادر والی ریاست چھتاری کے استفتاء کے جواب میں تفصیل سے کام لیا گیا ہے اور اس فتوی کی تائید و تصویب حضرت گنگوہی کے بہت سے جلیل القدر معاصر علماء نے کی ہے جو حضرت گنگوہی کے جواب کے ساتھ ذکر کر دی گئی ہے، حضرت گنگوہی کا جواب اگرچہ مختصر ہے لیکن مروجہ میلاد کی تاریخ ایجاد کے متعلق جو اشارے ہیں اس کی تفصیل دوسروں نے اپنی تائید کے ساتھ پیش کر دی ہے۔ حضرت گنگوہیؒ کے فتوی کے الفاظ تو صرف اتنے ہیں

"محفل چوں کہ زمانہ فخر عالم علیہ السلام میں اور زمانہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اور زمانہ تابعین، تبع تابعین اور زمانہ مجتہدین علیہم الرحمۃ میں نہیں ہوئی، اس کی ایجاد بعد چھ سو سال کے ایک بادشاہ نے کی اس کو اکثر اہل تاریخ فاسق لکھتے ہیں، لہٰذا یہ مجلس بدعت ہے ضلالت ہے اور اس کے عدم جواز میں صاحب مدخل وغیرہ علماء پہلے ہی لکھ چکے ہیں اور اب بھی بہت رسائل فتاوی طبع ہو چکے ہیں زیادہ دلیل کی حاجت نہیں، عدم جواز کے واسطے یہ دلیل بس ہے کہ کسی نے خیر قرون میں اس کو نہیں کیا، زیادہ مفاسد اس کے دیکھنے ہوں تو مطولات فتاوی دیکھ لیں، واللہ تعالی اعلم رشید احمد عفی عنہ"

چوں کہ سوال ایک والی ریاست کی طرف سے تھا اس لیے جواب کے ساتھ مشاہیر علماء کی تصدیقات و تصویبات اور ان کے دستخط کرائے گئے ہیں اور ان کی مہریں ہیں کیوں کہ ریاست کے سربراہ اعلیٰ نے اگر صدق دلی سے مسئلہ پوچھا ہے اور جواب سے اس کو یقین کامل حاصل

ہو جاتا ہے تو اس کے اثرات اس کے پورے دائرۂ حکومت تک پہونچیں گے۔ ایک کی اصلاح سے سیکڑوں اور ہزاروں کی اصلاح متوقع ہے اس لیے معاصر علماء جن میں زیادہ تر حضرت گنگوہی کے خلفاء اور مسترشدین ہیں ان کے علاوہ مشہور مدارس اسلامیہ کے جلیل القدر اساتذہ بھی اس فتوی پر دستخط کرنے والے ہیں ان میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کے صاحبزادہ محترم مولانا محمد خلیل الرحمٰن استاذ مظاہر علوم سہارنپور، مفتی اعظم ہند مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مفتی دار العلوم دیوبند مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری استاد دار العلوم دیوبند، مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند ابن حضرت نانوتوی، مولانا محمد حسن صاحب استاد جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد، مولانا محمد حسین دہلوی، مولانا محمد اسماعیل صاحب، مولانا سید محمد ابوالحسن صاحب، مولانا محمد ابراہیم صاحب، مولانا سید محمد عبد السلام صاحب، مولانا محمد سعید نقشبندی کے دستخط موجود ہیں۔

اس فتوی میں محفل میلاد مروجہ کو چھٹی صدی ہجری کی ایجاد کردہ بدعت کہا گیا ہے مرتب نے اس ابہام کو وفیات الاعیان مصنفہ ابن خلکان کے حوالے سے دور کیا ہے اور حوالے سے اس کو مستند و مدلل کر دیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

> "اول ایجاد اس بدعت کا ۶۰۴ھ میں ہوا ہے چنانچہ ابن خلکان اپنی تاریخ میں بذیل عمر بن حسن کے لکھتے ہیں قدم اربل فی سنة اربع و ستمائة و هو متوجه الی خراسان فرأی صاحبها الملك المعظم مظفر الدين بن زين الدين رحمه الله تعالیٰ مولعاً لعمل مولد النبی صلی الله علیه وسلم عظیم الاحتفال به كما فی ترجمته فی حرف الكاف من هذا الكتاب (۱)"

(۱) وفیات الاعیان لابن خلکان متوفی ۶۸۱ھ ج: ۳، ص: ۴۴۹ مطبوعہ دار الفکر بیروت طبع ۱۹۷۰ء

یعنی عمر بن حسن ۶۰۴ھ میں اربل آئے وہ خراسان جا رہے تھے تو وہاں کے بادشاہ مظفر الدین ابن زین الدین کو دیکھا کہ وہ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریب کا فریفتہ ہے اور وہ بہت بڑی محفل میلاد منعقد کرتا ہے جیسا کہ اس کی تفصیل اسی کتاب کے حرف کاف میں ہے۔

اصل کتاب میں یہ حوالہ نکال کر جب راقم الحروف نے دیکھا تو اس میں یہ ذکر بھی ملا کہ اس بادشاہ نے ایک کتاب میلاد کی "کتاب التنویر فی مولد السراج المنیر" کے نام سے لکھ رکھی تھی، یہی کتاب اس محفل میں پڑھ کر لوگوں کو سناتا تھا۔(۱)

ابن خلکان نے عمر بن حسن کے حالات میں میلاد کی تفصیل اور کیفیت کو بیان نہیں کیا صرف اجمالی ذکر کر کے حوالہ دے دیا ہے کہ حرف کاف میں ہم نے مزید تفصیل لکھ دی ہے، ہم نے اصل کتاب سے مراجعت کی تو چوتھی جلد میں مظفر الدین کے حالات میں اس محفل میلاد کا پورا نقشہ کھینچ کر مصنف نے رکھ دیا ہے میں وفیات الاعیان کے تازہ ترین ایڈیشن سے یہاں وہ عبارت پیش کر رہا ہوں جس کے کچھ ٹکڑے مرتب فتاوی نے نقل کیے ہیں، ان ٹکڑوں سے تشنگی باقی رہ جاتی ہے چوں کہ عام لوگوں کو یہ تاریخی حقیقت معلوم نہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر ایک مستند مورخ کے حوالے سے حقیقت واقعہ واضح ہو جائے، ابن خلکان کہتے ہیں:

" و اما احتفاله بمولد النبی صلی الله علیه وسلم فان الوصف یقصر من الاحاطة به لکن نذکر طرفا منه و هو ان اهل البلاد کانوا قد سمعوا لحسن اعتقاده فیه فکان فی کل سنة یصل الیه من البلاد القریبة من اربل مثل بغداد والموصل

(۱) وفیات الاعیان لابن خلکان متوفی ۶۸۱ھ ج: ۳، ص: ۴۴۹ مطبوعہ دار الفکر بیروت طبع ۱۹۷۰ء

والجزيرة و سنجار و نصيبين و بلاد العجم و تلك النواحى خلق كثير من الفقهاء والصوفية والوعاظ والقراء والشعراء و لا يزالون يتواصلون من المحرم الى اوائل شهر ربيع الاول و يتقدم مظفرالدين بنصب قباب من الخشب كل قبة اربع او خمس طبقات و يعمل مقدار عشرين قبة واكثر منها قبة لهٗ والباقى للامراء و اعيان دولتهٖ لكل واحدٍ قبة فاذا كان اول صفر زيّنوا تلك القباب بانواع الزينة الفاخرة المستجمة و تقعد فى كل قبة جوق من المغانى و جوق من ارباب الخيال و من اسباب الملاهى و لم يتركوا طبقة من تلك الطبقات، فى كل قبة حتى رتبوا فيها جو قا و تبطل معايش الناس فى تلك المدة و ما يبقى لهم شغل الا التفرج و الدوران عليهم و كانت القباب منصوبة من باب القلعة الى باب الخانقاه المجاورة للميدان فكان مظفرالدين ينزل كل يومٍ بعد صلوٰة العصر و يقف على قبة قبة الى آخرها و يسمع غناء هم و يتفرج علٰى خيالاتهم وما يفعلونه فى القباب و يبيت فى الخانقاه و يعمل السماع و يركب عقيب صلوة الصبح ثم يرجع الى القلعة قبل الظهر هكذا يعمل كل يوم الى ليلة المولد و كان يعمله سنة فى ثامن الشهر و سنة فى الثانى عشر لاجل الاختلاف الذى فيه فاذا كان قبل المولد بيومين اخرج من الابل والبقر والغنم شيئاً كثيرا زائداً من الوصف و زفها لجميع ماعنده من الطبول والمغانى والملاهى حتى ياتى بها الى الميدان ثم يسرعون فى نحرها و ينصبون القدر و يطبخون الالوان المختلفة فاذا كان ليلة المولد عمل السماعات بعد ان يصلى المغرب فى القلعة

ثم ينزل و بين يديه من الشموع المشتعلة شيء كثير و فى جملتها شمعتان او اربع (اشك فى ذلك) من الشموع المركبية التى تحمل كل واحدة منها على بغل و من ورائها رجل يسندها و هى مربوطة على ظهر البغل حتى ينتهى الى الخانقاه فاذا كان صبيحة يوم المولد انزل بخلع من القلعة الى الخانقاه على ايدى الصوفية على يد كل شخص منهم بقچة و هم متتابعون كل واحد وراء الاخر فينزل من ذلك شيء كثير لا اتحقق عدده ثم ينزل الخانقاه و تجتمع الاعيان و الرؤساء و طائفة كثيرة من بياض الناس و ينصب كرسى الوعاظ و قد نصب لمظفرالدين برج خشب له شبابيك الى الموضع الذى فيه الناس والكرسى و شبابيك آخر للبرج ايضاً الى الميدان و هو ميدان كبير فى غاية الاتساع و تجتمع فيه الجند ... ثم يبيت تلك الليلة هناك و يعمل السماعات الى البكرة هكذا يعمل فى كل سنة (۱)

"بادشاہ مظفر الدین شاہ اربل کی محفل میلاد منعقد کرنے کا حال بڑا تفصیل طلب ہے ساری تفصیلات بیان کرنا مشکل ہے میں اس کا صرف ایک حصہ یہاں لکھ رہا ہوں بادشاہ کے اس حسن اعتقاد کی ہر طرف شہرت تھی اس لیے ہر سال اس موقع پر قرب و جوار کے تمام شہروں سے جیسے بغداد، موصل، جزیرہ، سنجار اور نصیبین بلاد عجم اور اس کے اطراف و جوانب سے انسانوں کا جم غفیر امڈ آتا تھا ان میں ہر طرح کے لوگ ہوتے تھے فقہاء صوفیاء واعظین، شعراء، قراء ماہ محرم سے ان کی آمد شروع ہو جاتی تھی، اوائل ربیع الاول تک ان کی آمد جاری رہتی تھی، مظفر الدین خود آتا اور لکڑیوں کے قبے چار پانچ منزلہ بنواتا ان کی تعداد تقریباً بیس اور

(۱) وفیات الاعیان ابن خلکان، ج: ۴، ص: ۱۱۷ تا ۱۱۹ (دار صادر بیروت)

اس سے زائد ہوتی ان میں ایک قبہ اس کے لیے مخصوص ہوتا اور باقی قبے ارکان سلطنت کے لیے ہوتے تھے ان کی اعلیٰ درجہ کی آرائش اور سجاوٹ کی جاتی تھی، اور ہر منزل میں گویوں کا گروہ اپنے جملہ ساز و سامان اور باجوں کے ساتھ اس میں ہمہ وقت موجود رہتا تھا، تفریح طبع کا پورا بندو بست ہوتا تھا، گانے بجانے کے ساز و سامان سے کوئی منزل خالی نہیں رہتی تھی، ان تیاریوں کی ہماہمی اتنی بڑھ جاتی تھی کہ عوامی زندگی کا سارا نظم درہم برہم ہو جاتا اس زمانے میں کاروبار چھوڑ کر دن رات سیر تماشے میں گھومتے پھرتے تھے یہ قبے قلعہ کے پھاٹک سے شروع ہو کر میدان میں واقع خانقاہ تک چلے جاتے تھے، بادشاہ روزانہ عصر بعد قلعہ سے نکلتا اور باری باری ہر قبہ میں تھوڑی دیر ٹھہرتا گانا سنتا نغمہ و سرود کا لطف لیتا ہوا چلا جاتا ان کی نظموں سے لطف اندوز ہوتا ان کے کھیل تماشوں کو دیکھ کر خوش ہوتا رات خانقاہ میں گذارتا جہاں رات بھر شعر و نغمہ کی محفل جمتی اور صبح کو خانقاہ سے نکل کر تفریح کرتا ہوا ظہر کے وقت قلعہ میں پہونچتا یہ اس کے روز کا معمول تھا اس رات تک جس شب حضورؐ کی ولادت ہوئی ہے یہ ایک سال ۸؍ ربیع الاول تک ایک سال ۱۲؍ ربیع الاول تک ہوتا، تاریخ ولادت میں اختلاف کی وجہ سے دو دن قبل بیشمار اونٹ گائے بکریاں ذبح ہوتیں اور دیگیں چولھوں پر چڑھائی جاتیں شاہی محل میں جتنے گانے بجانے کے سامان ڈھول، اور دوسرے ساز ہوتے وہ سب نکالے جاتے اور شب ولادت میں خوب دھوم دھام ہوتی ولادت کی شب جب بادشاہ قلعہ سے برآمد ہوتا تو اس کے آگے آگے بیشمار موم بتیاں جلا کر لے جائی جاتیں دو یا چار دیو قامت موم بتیاں ہوتیں جو خچروں کی پشت پر جکڑ کر باندھ دی جاتی تھیں، ایک آدمی پیچھے سے ان کو سہارا دیے رہتا، روشنیوں کا یہ قافلہ خانقاہ تک جاتا تھا یوم

ولادت کی صبح کو قلعہ سے خلعت اس طرح لائی جاتی کہ تمام صوفیا ایک قطار میں خلعت لے کر ایک دوسرے کے پیچھے چلتے اور خانقاہ تک پہونچتے۔

تمام اعیان سلطنت جمع ہوتے واعظین کے لیے کرسیاں رکھ دی جاتیں خود بادشاہ کے لیے ایک خاص قسم کا برج ہوتا تھا جس میں چاروں طرف کھڑکیاں ہوتیں تاکہ ہر طرف کا منظر وہ ایک جگہ بیٹھ کر دیکھ سکے (بہت سی تفصیلات ترک کر کے) یہ اجتماع بہت بڑا ہوتا تھا، اس میں خلعتوں کی تقسیم ہوتی اور دوسرے پروگرام ہوتے حالاں کہ وہ میدان بہت وسیع ہے لیکن سارا میدان عوام کی بھیڑ سے بھر جاتا تھا، اس میدان میں شاہی لشکر بھی ایک طرف تیار کھڑا رہتا تھا۔ اس رات کو بادشاہ خانقاہ میں رات بھر رہتا اور خانقاہ میں سر شام سے صبح سویرے تک قوالیاں ہوتی رہتی تھیں، اسی طرح وہ ہر سال مجلس میلاد کرتا رہتا تھا"۔

حضرت گنگوہی نے صرف ایک جملہ میں یہ بتادیا تھا کہ مروجہ محفل میلاد چھٹی صدی کے بعد ایک بادشاہ کی ایجاد ہے، اس سے قبل پوری اسلامی تاریخ میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا، یہ ساری تفصیلات آپ کے ذہن میں تھیں لیکن فتوی کی زبان مختصر ہوتی ہے اس لیے صرف اشارہ کافی تھا، لیکن یہ صرف ایک بے سند حوالہ نہیں تھا بلکہ تاریخ میں اس کی شہادت موجود ہے، اسی لیے یہ تفصیلات آپ کے سامنے پیش کردی گئیں۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس دور میں حضرت گنگوہی کی ذات گرامی مسائل فقہیہ میں سند کی حیثیت رکھتی تھی، اسلامی معاشرہ میں دخیل تمام رسوم اور بدعات کے سلسلہ میں علماء عصر کی نگاہیں حضرت گنگوہی کی جانب لگی رہتی تھیں اس لیے آپ کا ایک فتوی پورے ملک کے علمی حلقوں میں موضوع بحث بن جاتا تھا اور صرف ایک فتوی سے

ایک ایسی ٹیم وجود میں آجاتی تھی جو اس فتوی کو عملی زندگی میں جاری و ساری دیکھنے کے لیے اپنی ساری جد و جہد صرف کر دیتی تھی، اس لیے حضرت گنگوہی کے کسی فتوی کو چند سطری تحریر نہ سمجھا جائے بلکہ اس کی پشت پر ایک طاقتور علماء کا گروہ تھا جو اس کے نفاذ کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار رہتا تھا۔

عرس

دوسری بدعت عرسوں کی تھی، پورے ملک میں یہ عرس بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے، ملک کے گوشے گوشے میں مصنوعی صوفیا قبروں اور مزاروں پر ٹوٹ پڑتے تھے، ہر جگہ مختلف طریقے سے یہ میلہ لگتا تھا، مسلمانوں کے اس اجتماع کی صورت ٹھیک وہی ہو گئی تھی جو ہندو یاتریوں کی ہوتی ہے مختلف مقامات کے مندروں کے درشن کے لیے جس طرح وہ ہزاروں ہزار کی تعداد میں سفر کرتے ہیں مسلمانوں نے بھی اسی طرح اجمیر، کلیر اور کچھوچھہ اور دوسری سیکڑوں قبروں کو اپنا مرکز عقیدت بنا رکھا تھا اور ایک متعینہ تاریخ پر قافلے کے قافلے اس سمت میں رواں نظر آتے تھے اس موقع پر جیسے ان کے یہاں میلے ٹھیلے کھیل تماشے ہوتے ہیں ان عرسوں میں بھی ٹھیک وہی ہوتا تھا اسی طرح عورتوں اور مردوں کا مخلوط اجتماع، نغمہ و سرود، آرائش و زیبائش، سامانوں کی خرید و فروخت، پھولوں بتاشوں کے دانوں کی کثرت، چڑھاوا، نقد نذرانے جیسے بنارس کے پنڈے گھاٹوں کے مندروں میں وصول کرتے ہیں ایسے ہی ان قبروں کے ٹھیکے دار اور مجاور مسلمان مردوں اور عورتوں سے یہ نذر و نیاز کے نام پر وصول کرتے تھے اور لوٹتے تھے۔

شب و روز قوالی کی محفلیں جمتیں، ڈھول، ہارمونیم اور تالیوں کے

تال سر میں قوال تانیں اڑاتے، مصنوعی صوفیاء جھومتے ان کو وجد آتا، عورتیں بال بکھرائے جھومتیں بھوت پریت چڑیلوں کے چھڑانے کا ڈھونگ رچا جاتا، یہ سب کچھ دین کے نام پر اور اولیاء اللہ کی محبت و عقیدت کے نام پر ہوتا تھا، بد عقیدگی کی انتہا یہ تھی کہ صاحب قبر سے حاجات طلب کی جاتیں ان کو مختار کل سمجھا جاتا اور یہ عقیدہ رکھا جاتا کہ یہ جو چاہیں کرسکتے ہیں، اس طرح بزرگان دین کو مقام الوہیت پر پہونچانے کی عرس کرنے والوں نے جرأت و جسارت کر رکھی تھی، حضرت گنگوہی کے دور میں یہ ساری خرافات دین کے نام پر علی الاعلان ہوتی تھیں اس لیے ان عرسوں کے متعلق بھی صحیح مسئلہ معلوم کرنے کی ہر طرف سے کوشش کی جاتی تھی، فتاوی رشیدیہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف شہروں اور علاقوں سے اس سلسلہ میں سوالات آتے تھے جن کے جوابات حضرت گنگوہی خود اپنے قلم سے تحریر فرماتے تھے، فتاوی رشیدیہ کے ص ۱۰۱ ص ۱۰۵ ص ۱۰۸ ص ۱۳۱ ص ۱۴۱ ص ۱۴۷ پر اس طرح کے استفتاء کے جوابات مذکور ہیں، جوابات موقع و محل کے لحاظ سے مختصر بھی ہیں اور بعض جوابات قدرے تفصیلی ص ۱۰۸ پر جو استفتاء مذکور ہے اس کا جواب حضرت گنگوہی کے قلم سے درج ذیل ہے:

"قبر میں پتھر لگانا مکروہ ہے اور فقہاء نے اس کو صراحتاً منع لکھا ہے اور مولانا محمد اسحاق دہلوی مہاجر رحمہ اللہ تعالیٰ کہ تمام ہندوستان کے علماء و محدثین کے استاد و استاد زادہ نواسہ و شاگرد و خلیفہ مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کے ہیں اپنے مسائل اربعین اور مائۃ مسائل میں اس کو منع لکھتے ہیں الفاظ اربعین (۱) کے یہ ہیں پختہ ساختن قبر و تعمیر نمودن گنبد و چہار دیواری و چبوترہ نزد قبر جائز نیست، عرس کے باب میں جواب یہ ہے کہ منع ہے اربعین میں

(۱) اربعین شاہ اسحاق محدث دہلوی کا ایک مختصر سا رسالہ ہے۔

مولانا ممدوح لکھتے ہیں مقرر ساختن روز عرس جائز نیست، در تفسیر مظہری می نویسد **لا یجوز ما یفعله الجھّال لقبور الاولیاء والشھداء من السجود والطواف حولھا و اتخاذ السرج والمساجد الیھا و من الاجتماع بعد الحول کالاعیاد یسمونھا عرساً.** (۱) اور یہ ہفوات کہ شیخ عرس میں حاضر ہے اور یہ امر فرماتا ہے اگرچہ بتاویل صحیح شرک نہیں مگر منجز بہ شرک اور باعث فساد عقیدہ عوام ہے تو یہ امر بھی بدعت وضلال وگناہ سے خالی نہیں بسبب انجام شرک کے، لہٰذا یہ سب امور ممنوع اور خلاف سنت ہیں، اگر مرتکب ومصوب ان امور کا اصرار کرے اور ترک نہ کرے تو امام بنانا اس کو منع ہے، گو اس کے پیچھے نماز ادا ہو جائے گی جب تک فساد عقیدہ اس کا متحقق نہ ہو اور بندہ مولانا اسحاق مرحوم کے فتاوی سے یہ نقل کرتا ہے، اگر کسی کو شبہ ہو تو دونوں رسالہ مذکورہ بالا کو مطالعہ کرلیوے اور نصوص حدیث وفقہ کو نقل نہیں کرتا کہ ان کے مطالعہ سے عوام بلکہ خواص ہمارے زمانہ کے بھی قاصر ہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ"

اس جواب پر متعدد معاصر علماء اور مفتیوں کے دستخط ہیں ان دستخط کرنے والوں میں مولانا فخر الدین گنگوہی، مولانا گل محمد، مولانا مراد علی شاہ استاد مظاہر علوم سہارنپور، مولانا حبیب الرحمٰن استاد مظاہر علوم سہارنپور، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مدرس مدرسہ عربی دیوبند، مولانا عنایت الٰہی صاحب، مولانا مشتاق احمد صاحب، مولانا احمد علی اغوان پوری وارد حال سہارنپور، مولانا فضل الرحمٰن صاحب دیوبندی، مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری مدرس مدرسہ عربی دیوبند، مولانا محمد مراد مظفر نگری، مولانا صدیق احمد مدرسہ حسین بخش دہلی، مولانا محمد اسحاق نہٹوری، مولانا محمد علی مدرس مدرسہ حسین بخش دہلی، مولانا عبد الرزاق،

(۱) تفسیر مظہری، ج:۲، ص:۶۵

مولانا محمود صاحب صدر مدرسہ عربی دیوبند، مولانا عبدالرشید انصاری سہارنپور، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی مفتی مدرسہ عربی دیوبند، مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر المدرسین مدرسہ عربی دیوبند، مولانا غلام رسول دیوبند، مولانا محمد یٰسین دیوبند، مولانا حبیب الرحمٰن دیوبند، مولانا بشیر احمد صاحب کے اسماء گرامی شامل ہیں جو اپنے دور کے ممتاز ترین افراد تھے ان علماء کے دستخطوں کے ساتھ ساتھ ان میں اکثر نے اپنی مہریں بھی ثبت کر دی ہیں۔

طواف قبر

اس عرس ہی کا ایک پہلو قبروں کا طواف بھی ہے، ان قبروں کا طواف ٹھیک اسی طرح کیا جاتا ہے جس طرح کعبۃ اللہ کا طواف حجاج کرام کرتے ہیں یہ طواف قبر عرسوں میں بالعموم ہوتا تھا اس لیے جب قبروں کے طواف کے سلسلہ میں کوئی استفتاء آتا تھا تو اس کے جواب کا لب و لہجہ سخت ہو جاتا تھا، ایک استفتاء کے جواب میں حضرت گنگوہی نے دو ٹوک جواب تحریر فرمایا

> "طواف قبور اولیاء اللہ کا حرام ہے، سوائے بیت اللہ کے کسی کا طواف کرنا درست نہیں، ملا علی قاری شرح مناسک میں فرماتے ہیں و لا یطوف ای لا یدور حول البقعة الشريفة لان الطواف عن مختصات بالكعبة المنيفة فيحرم قبور الانبياء والاولياء، و لا عبرة بما يفعله الحرملة لو كانوا فى صورة المشائخ والعلماء (انتهیٰ) و فى الحراج لو طاف حول مسجد سوى الكعبة يخشىٰ عليه الكفر انتهیٰ ہر گاہ کہ مسجد کے طواف میں خوف کفر کا ہو تو طواف قبور سے بطریق اولیٰ کافر ہو جاوے، پس اگرچہ کوئی بصورت عالم و درویش ہو کر طواف کرے وہ فاسق ہے ہر گز اس کے قول و عمل کا اعتبار نہ کریں، اور اس فعل سے حرام

جان کر اجتناب کریں فقط واللہ تعالیٰ اعلم، کتبہ الاحقر بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ"

تصدیق و تائید کرنے والے علماء میں سے بعض نے مندرجہ ذیل دلائل کا اضافہ بھی کیا ہے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ مناسک میں کہتے ہیں

لا يجوز ان يطاف لقبره صلى الله عليه وسلم اور سنن الدارمی میں مسطور ہے۔

وينبغی للزائرين ان لا يطوفوا حول الحظيرة الشريفة كما يفعله بعض الجهال تشبيهاً بالبيت العتيق اذ هو حرام و بدعة منكرة .

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ میں ارقام فرماتے ہیں:

صدق رسول الله صلى الله عليه وسلم حيث قال لتتبعن سنن من كان قبلكم شبراً بشبر و ذراعا بذراع حتى لو دخلوا جحر ضبّة فتتبعونهم ، قالوا، يا رسول الله ! اليهود والنصارىٰ قال، فمن ؟ (۱) الأن اصف لك ما احدثه منافقو اُمة من وجوه الشرك و اغضبوا قلب و صية و ضيقوا صدر حامل و حيه، فقد رأينا رجالا فی ضنفیٔ المسلمين يتخذون الاحبار والرهبان ارباباً من دون الله يحولون حول قبورهم و يحجون الى قبورهم و آثارهم و اتلالهم كما كان اليهود والنصارىٰ يفعلون ذلك (انتهى) هكذا فی الصواعق.

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں ارقام فرماتے ہیں

لا يجوز ما يفعله الجهال لقبور الاولياء والشهداء من السجود والطواف و اتخاذ السرج والمساجد اليها و من الاجتماع بعد الحصول كالاعياد و يسمونهٗ عرساً (۲)

---

(۱) مشکوٰۃ باب تغیر الناس، ص: ۴۵۸

(۲) تفسیر مظہری، ج: ۲، ص: ۶۵

"مالابدمنہ میں فرماتے ہیں، مسئلہ سجدہ کردن بسوے قبر انبیاء واولیاء وطواف قبور کردن ودعا ازانہا خواستن ونذر براے آنہا قبول کردن حرام است بلکہ چیزہا ازانہا بہ کفر می رساند" (فتاوی رشیدیہ ص ۱۴۳)

جب عرس کے سلسلہ میں بہ کثرت اور ہر طرف سے سوالات آنے لگے تو آپ نے صرف مسئلہ بتادینے پر اکتفاء فرمالیا اور ہر فتوی میں دلیل اور حوالے ترک کردیے کیوں کہ متعدد فتووں میں دلائل فراہم کیے جاچکے تھے چنانچہ دریبہ کلاں دہلی کے میر محبوب علی شاہ کا ایک استفتاء آیا اور پوچھا گیا کہ

"جس عرس میں صرف قرآن خوانی اور تقسیم شیرینی ہو شریک ہونا جائز ہے یا نہیں؟" (فتاوی رشیدیہ ص ۱۴۷)

اس کا دوٹوک جواب دیا گیا

"کسی عرس اور مولود میں شریک ہونا درست نہیں کوئی سا عرس اور مولود ہو درست نہیں" (ص ۱۴۷)

استعانت از اہل قبور

سب سے بڑی مشرکانہ گمراہی یہ تھی کہ جاہل عوام بزرگوں کو مختار کل اور متصرف فی الامور کے عقیدے کے ساتھ ان کی قبروں پر دعاء کے لیے جانے لگے، خدا سے دعاء کے بجائے براہ راست اہل قبور سے حاجت روائی کی درخواست کرنے لگے جو صراحتاً شرک ہے، ان جاہل عوام کی پشت پر جو نام نہاد علماء اور صوفیاء تھے سوال کیا جاتا تو وہ اس کی تاویلات کرتے لیکن جہلاء اور عوام ان تاویلات باردہ سے واقف نہیں تھے وہ تو سچ مچ یہی سمجھتے تھے کہ یہ بزرگان دین جس کو چاہیں اولاد ہو جائے جس کو چاہیں کامیابی سے ہمکنار کردیں، بادشاہ غریباں مدد دے، یا مشکل

کشا مدد ے، یا غوث مدد ے، یا خواجہ خواجگاں مدد ے، یہ سب جملے اسی مشرکانہ عقیدہ کی غمازی کرتے ہیں، اس سلسلہ میں بھی حضرت گنگوہی کے پاس مسلسل سوالات آتے رہتے تھے جن کے جوابات فتاویٰ رشیدیہ میں موجود ہیں، اس کے صفحہ ۱۱۱ ص ۱۱۲ ص ۱۱۶ وغیرہ پر یہ سوالات اور ان کے جوابات موجود ہیں، اس سلسلہ میں جو جوابات آپ نے دیے ہیں ان میں سے ایک جواب یہ ہے:

"استعانت کا ایک معنی یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے دعا کرے کہ بحرمت فلاں مرا کام کردے، یہ بہ اتفاق جائز ہے خواہ عند القبر ہو یا خواہ دوسری جگہ اس میں کسی کو کلام نہیں۔"

"دوسرے یہ کہ صاحب قبر سے کہے کہ تم میرا کام کردو یہ شرک ہے خواہ قبر کے پاس کہے یا قبر سے دور کہے۔" (فتاوی رشیدیہ ص ۱۱۲)

فاتحہ مروجہ، تیجہ، چہلم وغیرہ

اسلام میں ایصال ثواب ایک مسلمہ مسئلہ ہے مسکینوں کو کھانا کھلانا، کنویں کھدوادینا، مدرسوں اور مسجدوں کی تعمیر کرادینا اس کے اجر و ثواب مرنے کے بعد بھی اس دنیا سے جانے والوں کو ملتے رہتے ہیں خود وہ کوئی صدقہ جاریہ کی بنیاد ڈال کر گیا یا اس کے ورثہ نے اس کے نام سے کسی صدقہ جاریہ کے کام کو بخش دیا یہ سارے کام شریعت کی رُو سے مُردہ کو اجر و ثواب کا مستحق بنادیتے ہیں لیکن ان کاموں کو شریعت کے اصولوں پر کیا جائے اگر ایصال ثواب کے کاموں کو دوسرے باطل مذاہب کے طریقوں سے کیا جائے تو تشبہ بالکفار کی وجہ سے ثواب کے بجائے عذاب ہوگا یہ ممنوع ہے اور اس کو بدعت کہا جاتا ہے فاتحہ مروجہ، تیجہ، گیارہویں، سویم، چہلم، برسی وغیرہ کا طریقہ ہندوستان میں ہندوؤں سے

لیا گیا، اس لیے علماء نے اس کو غیر شرعی کہا ہے، حضرت گنگوہی اس طرح کی تمام بدعات و خرافات کے سلسلہ میں سخت رویہ رکھتے تھے اور ان کو مسلمانوں سے مٹا دینے کی ہر امکانی کوشش کرتے تھے، چوں کہ آپ کے دور میں یہ طریقے مسلمانوں میں عام تھے اس لیے آپ بڑی شدت سے اس کو منع فرماتے تھے اور شریعت کے حکم کو غیر مبہم لفظوں میں بیان کر دیا کرتے تھے، فتاوی میں اس طرح کے بہت سے سوالات اور ان کے جوابات مذکور ہیں فاتحہ مروجہ کے سلسلہ میں ص ۱۱۸ ص ۱۲۱ ص ۱۳۸ ص ۱۴۰ پر سوالات و جوابات مرقوم ہیں۔

حضرت گنگوہی سے سوال کیا گیا کہ ایک کتاب "ہدیۃ الحرمین" میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا سیوم، دسواں، بیسواں اور چہلم کیا ہے ایک سوال یہ تھا کہ کھانا سامنے رکھ کر اور ہاتھ اٹھا کر جو فاتحہ رائج ہے اس کا کیا حکم ہے؟ تیسرا سوال یہ تھا کہ تیسرے یا پانچویں دن کچھ لوگ میت کے گھر آتے ہیں یا بلائے جاتے ہیں اور ختم کلام مجید ہوتا ہے بعض آہستہ آہستہ اور بعض بلند آواز سے پڑھتے ہیں کچھ خوشبو وغیرہ رکھتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ ان سوالات کے جوابات مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے قلم سے ہیں۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "ہدیۃ الحرمین" میں جو لکھا ہے محض غلط ہے، اس کتاب کا کوئی اعتبار نہیں دوسرے سوال کے جواب میں کہا گیا کہ فاتحہ کا یہ طریقہ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا نہ خلفاء راشدین کے عہد میں نہ آج تک عوام و خواص حرمین شریفین میں یہ طریقہ رائج ہے، البتہ یہ کھانا حرام نہیں ہو جاتا اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ان رسوم کو ضروری جاننا مذموم ہے جو کچھ آپ کلام پاک پڑھیں یا کھانا فقراء کو دیدیں ان باتوں کا ثواب میت کو ضرور پہنچتا ہے۔

اس فتویٰ کی تائید میں حضرت گنگوہی کا ایک خط نقل کیا گیا ہے جس میں اس فاتحہ مروجہ کا ذکر ہے، شاید کسی نے حضرت گنگوہی سے بھی یہی سوالات کئے تھے آپ نے اپنے مکتوب میں دوٹوک فیصلہ کیا ہے۔

"فاتحہ مروجہ بدعت ہے، مع ہذا مشابہت بہ فعل ہنود ہے اور تشبہ غیر قوم کے ساتھ منع ہے۔ ایصال ثواب بدوں اس ہیئت کے درست ہے سوئم دہم چہلم رسوم ہنود کے ہیں اس تخصیص ایام میں مشابہت ہوتی ہے"۔

پھر حضرت گنگوہی کے اس فتویٰ پر ایک درجن سے زائد علماء کے تصدیقی دستخط ہیں جو مختلف شہروں کے رہنے والے اور علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں مشہور ہیں یا کسی دینی مدرسہ کے مفتی ہیں یا شہروں کی جامع مسجدوں میں امام اور خطیب ہیں یا مفتی شہر کے منصب پر فائز ہیں۔

فتاوی رشیدیہ کے ص: ۱۲۱ پر فاتحہ مروجہ کو حوالجات کے ساتھ بدعت قرار دیا گیا ہے۔ اصل فتوی کی عبارت یہ ہے۔

"جواب صورت مسئولہ کا یہ ہے کہ تجمع ہونا عزیز واقارب وغیر ہم کا واسطے پڑھنے قرآن مجید کے یا کلمہ طیبہ کے جمع ہو کر روز وفات میت کے یا دوسرے روز یا تیسرے روز بدعت مکروہ ہے شرع شریف میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے کتاب نصاب الاحتساب میں لکھا ہے ان ختم القرآن جهراً بالجماعة ويسمى بالفارسية سیپارہ خواندن مکروه، اتخاذ الطعام فی اليوم الاول والثالث بعد الاسبوع نقل الطعام الى القبور فى المراسم واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والفقراء للختم وقراءة سورة الانعام والاخلاص،"(۱)

اور رد المحتار میں ہے ومن المنكرات الكبيرة کا یقاد

---

(۱) فتاوی بزازیہ ص: ۶۰۳ مکتبہ نعمانیہ دیوبند

الشموع والقناديل التى توجد فى الا فراح وكدق لمطبول والغناء بالاصوات الحانا واجتماع النساء اولمردان واخذ الاجرة على الذكر وقراء ة القرآن وغيره ذلك مما هو مشاهد فى هٰذا الزمان وما كان كذلك فلا شك فى حرمته و بطلان الوصية به لا حول ولا قوة الا بالله (۱) (فتاوی رشیدیہ، ص:۱۲۱)

اسی طرح کے جوابات ص:۱۳۸اور ص:۱۴۰پر ہیں، خلاصہ یہ کہ میت کے سلسلہ میں ہندوستان میں جتنی رسوم جاری ہیں ان کو صاف صاف بدعت وضلالت بتایا گیا ہے۔

گیارہویں، رجبی وغیرہ

اس سلسلہ میں بہت سے استفتاء اور فتاویٰ درج ہیں ان میں کچھ فاتحہ مروجہ کے بارے میں ہیں اور کچھ مختلف ومتعدد رسوم کے بارے میں فتوی ہے صفحات ۱۰۵-۱۱۸-۱۲۱-۱۳۶-۱۳۷-۱۴۱-۱۴۶-۱۴۸-۱۴۹ بعض صفحات میں مکرر سوالات اور جوابات ہیں ہر جگہ قطعی اور دوٹوک جواب دیا گیا ہے مذکورہ بالا امور کے متعلق استفتاء آئے ہیں ان کے جواب میں آپ نے اپنا نقطہ نگاہ اور نفس مسئلہ بتا دیا ہے اور دلائل سے کم امتیاز کیا ہے۔ چوں کہ ہر فتوی مشاہیر علماء کے پاس تصدیق وتائید کے لیے اہتمام سے بھیجا جاتا تھا تاکہ اس کی شہرت ہو اور عام اہل علم کے علاوہ عوام تک پہنچ جائے تو تصدیق وتصویب کرنے والے علماء نے حضرت گنگوہی کے جواب کی مکمل تائید وتصویب ہی نہیں کی بلکہ خود بھی کتابوں کے حوالے عبارتیں اور دلائل پیش کیے ہیں، یہی حضرت گنگوہی کا فتوی عام اہل علم کے دلوں کی آواز بن جاتا تھا۔ چناں چہ فاتحہ مروجہ سیوم، چہلم

---

(۱) فتاوی بزازیہ ص:۶۰۳ مکتبہ نعمانیہ دیوبند

، گیارہویں وغیرہ کے متعلق جب استفتا آیا تو حضرت گنگوہی نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔

"فاتحہ میں ہاتھ اٹھا کر پڑھنا طعام وشراب روبہ رو رکھ کر مشابہت فعل ہنود سے ہے اور یہ امر شرع میں ایصال ثواب کے واسطے کہیں ثابت نہیں اور من تشبہ بقوم فھو منھم حدیث حکم ناطق حرمت مشابہت کا ہے لہٰذا یہ صنیع بھی حرام ہوگا اور سیوم دہم چہلم جملہ رسوم ہنود کی ہیں اس تخصیص ایام میں مشابہت بھی ہوئی اور تخصیص ایام کی بدعت بھی ہے یہ سب بسبب ان تخصیصات کے بدعت مکروہ تحریمہ ہے اگرچہ اصل ایصال ثواب بدون کسی تخصیص ومشابہت کے درست ہے"

چوں کہ یہ تمام بدعات ناخواندہ عوام میں مروج تھیں اہل علم ان کے خلاف محاذ آرائی سے تشویش میں مبتلا تھے حضرت گنگوہی کے اس فتوی نے صورت حال واضح کردی تواب کسی کو بھی اس کے خلاف اظہار رائے میں تردد نہ رہا، انہوں نے اس کی تصدیق کی اور عوام کو شریعت کا صحیح حکم بتانے کی ان میں جرأت پیدا ہوئی اور حضرت گنگوہی کا یہ مقصد تھا کہ ان بدعات کے خلاف پوری قوت سے کارروائی کی جائے تاکہ مسلم معاشرہ کو ان گمراہیوں سے نجات دلائی جائے، ہم دیکھتے ہیں کہ اس فتوی پر بہت سے مشاہیر علماء کی تصدیقات اور ان کے دستخط ہیں۔ کچھ علماء نے اپنے مطالعہ کی روشنی میں اس کی تائید میں اپنی طرف سے بھی دلائل فراہم کیے ہیں تصدیق وتوثیق کرنے والوں میں درجہ علماء شامل ہیں۔

مولانا محمد حسن صاحب استاذ مدرسہ شاہی مراد آباد، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی دارالعلوم دیوبند، مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری، مولانا عبدالصمد صاحب، مولانا محمد عبداللہ صاحب، مولانا عبدالحق صاحب، مولانا احمد حسن شاہ حسن پوری، مولانا دین محمد صاحب،

مولانا ابوالخیر معید صاحب، مولانا وہاج الدین صاحب، مولانا عبدالمجیس صاحب، مولانا خلیل احمد صاحب، مولانا محمود صاحب دیوبند، مولانا محمد صدیق صاحب مراد آبادی، مولانا قاضی محی الدین قاضی بھوپال، مولانا محی الدین احمد خاں، مولانا عبدالرحمٰن صاحب مظاہر علوم مولانا عالم علی نگینوی، مولانا احمد حسن صاحب دیوبندی، مولانا قاسم علی مفتی شہر مراد آباد مولانا لطف اللہ مفتی ریاست رام پوری مولانا محمد رضا خاں مدرس مدرسہ عالیہ ریاست رام پور مولانا محمد اسلم مدرسہ عالیہ رام پور، مولانا سلیم اللہ صاحب، مولانا عبدالقادر صاحب، مولانا محمد علی رضا صاحب اساتذہ مدرسہ عالیہ رام پور، مولانا عبدالوہاب خاں رام پور، مولانا راحج علی، مولانا محمد اسمٰعیل مراد آبادی مولانا عبدالغنی سہنسپوری، مولانا ہدایت العلی لکھنوی مقیم مراد آباد مولانا محمد زکریا مظفر پوری، مولانا سید محمد حسن بنداری مولانا نعمت اللہ صاحب پردوائی، مولانا نصیر الدین، مولانا عنایت علی سہارنپوری، مولانا عبدالمنان انبالوی واعظ مولانا سراج احمد صاحب مولانا جمیل احمد صاحب محمد حسین منا جان مراد آبادی، مولانا عزیزالرحمٰن دیوبندی، مولانا محمد اللہ یار واعظ بریلوی، مولانا فتح محمد تھانوی، مولانا سعد الدین کشمیری، مولانا امین الدین اورنگ آبادی، مولانا منفعت علی دارالعلوم دیوبند مولانا غلام رسول دارالعلوم دیوبند، مولانا امید رضا صاحب مولانا محمد اسحاق امرتسری مولانا عبدالرحمٰن پانی پتی شاگرد شاہ اسحاق محدث دہلوی، مولانا سید محمد مصطفیٰ ابن محمد مفتی مدینہ، مولانا عبدالجبار غزنوی مولانا ابو عبید احمد اللہ امرتسری مولانا عبدالرحمٰن صاحب بن مولوی غلام علی، اشاعت القرآن مولانا عبدالرحمٰن بہاری امرتسری مولانا عبدالرحمٰن صاحب، مولانا ابو اسحاق محمد الدین ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری مدرسہ تائید الاسلام امرتسر مولانا عبدالحق غزنوی مولانا عبدالاعلیٰ غزنوی

مولانا عبد الغفور سنہواری مولانا عبد العزیز مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوری خلیفہ حضرت حافظ ضامن شہید رحمہم اللہ تعالیٰ زیادہ تر دستخطوں میں کوئی تعارفی نقطہ نہیں۔ اس لیے ان حضرات کے علمی مقام و مرتبہ کی نشاندہی مشکل ہے لیکن ظاہر ہے کہ حضرت گنگوہی کے فتوی کی تصدیق وتوثیق اہم ترین علماء سے کرائی گئی ہوگی جیسا کہ دستخطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تصدیق کرنے والے مولانا ابو سید محمد حسین صاحب نے خود بھی بہت سے حوالے اور دلائل دیے ہیں جن کو اختصار کے ساتھ میں یہاں ذکر کر رہا ہوں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"الحمد للہ کہ حضرت مجیب لبیب دامت فیوضہم نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے بلاشک صحیح ہے کسی کو جائے مقال نہیں کیونکہ وہ مخدوم العلماء اور راسخ فی العلم ہیں، البتہ بوجہ مزید اطمینان عوام چند عبارات کتب محققین سے تائیداً نقل کرتا ہوں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری میں ارقام فرماتے ہیں (ترجمہ) ایسا ہی ایصال ثواب بہتر ہے مگر رسوم غیر جائز و بدعت کو ان کے ساتھ شریک کر لینا ثواب کو کھو دینا اور گناہ کا مرتکب ہونا ہے قرون ثلاثہ میں ایصال ثواب کیا جاتا تھا مگر نہ کھانا رکھ کر فاتحہ پڑھی جاتی تھی نہ رسوم سوئم دہم چہلم بستم کی کچھ تعیین تھی ایصال ثواب الی الاموات کیجئے مگر بلا قید جیسا کہ بزرگان سلف کا طریقہ تھا نہ بطریق اختراع و ابتداء خلف۔

فتاوی سمرقندیہ میں مرقوم ہے قراءۃ الفاتحۃ والاخلاص والکافرون علی الطعام بدعۃ. کبیری شرح منیۃ المصلی میں ہے واتخاذ الطعام عن قراءۃ القرآن یکرہ. نصاب الاحتساب میں ہے ان معرفاً یقوم فی صف النعال ویقرأ بعد الختم آیۃ من الاخلاص ثلثا ومن الفاتحۃ مرۃ وھو قائم والناس قعود انہ

بدعة ولم ینقل ھٰذا الصنیع من السلف۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا کنا نری اخذ الاجتماع الی اھل المیت وصنعھم الطعام من النیاحة۔

فتح القدیر میں ہے۔ واتخاذ الضیافة من اھل المیت وھی بدعة مستقبحة (۱) لماروی ابن ماجہ والامام احمد باسناد صحیح ملا علی قاری مرقاۃ شرح مشکوۃ میں علامہ طیبی سے نقل فرماتے ہیں قال الطیبی من اصرّ علی امر مندوب وجعل غرما ولم یعمل بالرخصة فقد اصاب منه الشیطان من الضلال فکیف من اصرّ علی بدعةٍ اومنکر ،ھٰذ امحل تذکر للذین یصرون علی الاجتماع فی الیوم الثالث للمیت ویرونه ارجح من الحضور للجماعة ونحوه۔

فتاوی بزازیہ میں مرقوم ہے یکره اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الی القبر فی المراسم واتخاذ الدعوة لقراء ة القرآن وجمع الصلحاء والفقراء للختم اولقراء ة سورة الانعام اوالاخلاص شرح منہاج امام نووی میں ہے الاجتماع علی المقبرة فی الیوم الثالث وتقسم الورود والعود واطعام الطعام فی الایام المخصوصة کالثالث والخامس والتاسع والعاشرو العشرین والاربعین والشھر السادس والسنة بدعة۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی شرح سفر السعادت ومدارج میں فرماتے ہیں

"ایں اجتماع مخصوص بروز سوم ارتکاب تکلفات دیگر وصرف اموال بے وصیت از حق یتامی بدعت است وحرام" شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وصیت نامہ میں فرماتے ہیں۔ دیگر از عادات شنیعہ با مردم

---

(۱) شامی، ج:۱ص:۶۰۳

اشراف است درماتمہاو چہلم وفاتحہ سالیانہ ایں ہمہ رادر عرف اول وجود نبود و مصلحت آنست کہ غیر تعزیت وارثان میت تاسہ روز طعام ایشاں یک شبانہ روز رسمے نباشد۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنے وصیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں بعد مردن من رسوم دینوی مثل دہم، بستم چہلم، وششماہی وفاتحہ سالانہ ہیچ نکنند ارنا الحق حقا والباطل باطلا واللہ اعلم بالصواب وعندہ علم الحق والکتاب الجواب صحیح فقط ابوسعید محمد حسن"

میری اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ ناخواندہ عوام میں دین کے نام پر اہل علم اور علماء سوء نے جو بدعات وخرافات رائج کر رکھی تھیں ان کے خلاف حضرت گنگوہی ان کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش فرماتے تھے اور جب کوئی فتوی تحریر فرماتے جس کا تعلق عوام الناس سے ہے تو مختلف دیار اور مختلف حلقوں کے علماء کے ذہن تیار کرتے ان خرافات کے بارے میں اپنی دوٹوک رائے دے کر ان کو صحیح رائے کے اظہار پر برانگیختہ کرتے اور فتوی پر دستخط لیتے، میرا خیال ہے کہ مستفتی کو تو اپنا مختصر جواب ارسال فرمادیتے اور علماء کے دستخط لینے کے بعد اس کو طبع کرا کے شائع بھی کردیا جاتا تھا تاکہ عام مسلمانوں کو اس سے واقفیت ہو جائے، میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے حضرت گنگوہی کے بہت سے فتووں کو چند ورقہ کتابچوں اور رسالوں کی شکل میں دیکھا ہے ۲۰/رکعات تراویح کا فتوی، گاؤں میں جمعہ ہونے کا فتوی، احتیاط الظہر کے خلاف فتوی، میلاد مروجہ کے خلاف فتوی، یہ سارے فتاوے الگ الگ مطبوعہ پائے جاتے ہیں۔

اور میری نگاہوں سے گذرے ہیں فاتحہ تیجہ سیوم چہلم گیارہویں وغیرہ کے بارے میں فتوی بھی اس طرح کا تھا اس لیے مجھے یقین ہے کہ اس کو ان دستخطوں کے ساتھ شائع کیا گیا ہوگا ورنہ تامل رکھنے کے کوئی معنی نہیں۔

بدعات محرم

حکومت مغلیہ کے آخری دور میں شیعوں کے تسلط اور غلبہ نے اہلسنت والجماعت کے دلوں میں چور دروازے سے بہت سی خرافات اور مشرکانہ رسوم جاگزیں کردی تھیں ایک زمانہ تو وہ بھی گذرا ہے کہ ہر مسلمان تعزیہ داری کو اسلام کا رکن اور جزءایمان بنائے ہوئے تھا، عوام تو اس کو خالص اسلامی مسئلہ سمجھتے تھے، اہل علم بھی رافضیت کے اس زہر آلود نشتر سے واقف نہیں تھے جو ایمانی زندگی کو خطرے میں ڈالے ہوئے تھا تمام شیعی مراسم انتہائی خلوص اور جوش وجذبہ سے ادا کی جاتی تھیں امام جعفر کا کونڈا کھچڑا، بی بی فاطمہ کی صحنک، امام کے نام کی سبیل لگانا بہت بڑا کار ثواب سمجھتے تھے، انیس و دبیر کے مرثیے پڑھتے، روتے اور رُلاتے تھے اور معرکہ کربلا کی تمام شیعی روایات پر ایمان رکھتے تھے جن میں ۹۹ فیصدی جھوٹ اور افسانہ طرازی ہے ان مراسم کی ادائیگی میں شیعہ اور سنی میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا اور خالص اسلامی معاشرہ کی شکل و صورت کو مسخ کر رکھا تھا، ضرورت تھی کہ اس کے خلاف بھی علم جہاد بلند کیا جائے اور مسلم معاشرہ کو ان لغویات سے پاک کیا جائے۔

حضرت نانوتویؒ نے اس کے خلاف ایک طاقتور تحریک کی ابتدا کی اور شیعی مراسم کے اس غلبہ کو مٹانے کے لیے جان کی بازی لگائی، حضرت گنگوہی بھی اس تحریک کو مزید طاقتور بنانے کی ہرممکن جدوجہد فرمارہے تھے۔

فتاوی رشیدیہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت گنگوہی سے اس سلسلہ میں استفسارات ہوتے رہتے تھے ان کے جوابات فتاویٰ رشیدیہ میں موجود ہیں ص ۱۰۴ ص ۱۰۸ ص ۱۱۰ ص ۱۳۱ ص ۱۴۷ پر یہ سوالات اور ان کے جوابات مذکور ہیں، ایک سوال کیا گیا کہ

"یہ تعینات جیسے ربیع الاول میں کونڈا، عشرہ محرم میں کھچڑا اور صحنک حضرت فاطمہ کی اور گیارہویں اور توشہ اور سہ منی بو علی قلندر اور خضر علیہ السلام کے نام کا چاہ پر لے جانا مذکورہ بالا میں طعام کی تخصیص اور ایام کی تعیین کہ اس کے خلاف ہرگز نہ ہو بدعت اور حرام ہیں یا نہیں؟ اور اس قسم کے طعام کو کھانا مکروہ ہے یا حرام کیوں کہ افعال جہال جو کفر و شرک کو پہونچے ہوے ہیں، نفع و ضرر و توقع منافع اپنے اپنے مرادات کی طلب ان میں کی جاتی ہے تو ایسے لوگوں اور ایسے عقائد کی نسبت حکم کفر و شرک کا کرنا درست ہے یا نہیں؟ ارقام فرماویں۔ (عزیز الدین مراد آباد)

اس کے جواب میں حضرت گنگوہی نے تحریر فرمایا کہ

"یہ تعینات بدعت ضلالۃ ہیں اور طعام میں اگر نیت ایصال ثواب کی ہے تو طعام مباح اور صدقہ ہے اور جو بنام ان اکابر کے ہے تو داخل ما اھل بہ لغیر اللّٰہ میں ہے اور حرام ہے، اور ایسے عقائد فاسد، موجب کفر کے ہیں، ان افعال کو کفر ہی کہنا چاہیے مگر مسلم کے فعل کی تاویل لازم ہے"

اس طرح کی تمام رسوم بدعقیدگی کے نتیجہ میں اختیار کی جاتی ہیں حضرت گنگوہی کا رویہ سخت، بے لچک اور سائل کو دوٹوک جواب دیتے تھے لیکن کفر کا فتوی دینے میں محتاط تھے اس لیے اکثر جوابات میں فعل مسلم کی تاویل و توجیہ کا ذکر ضرور فرما دیتے تھے، کیوں کہ ممکن ہے ان مشرکانہ عمل کا کرنے والا بدعقیدگی کے بجاے خاندانی رسم و رواج کے طور پر کر رہا ہو اور جب اس کی مضرت و معصیت ہونے کو بتا دیا جاے تو اس کو ترک کر دے تو ظاہر ہے کہ اس کی نیت کفر و شرک کی نہیں بلکہ لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے شخص پر کفر کا فتوی نہیں دیا جا سکتا، اس لیے رضا خانیوں کی طرح بے لگام ہو کر سب پر کفر کا فتوی

لگا دیا جائے کہیں نہیں پایا جاتا۔

محرم میں اہل سنت والجماعۃ بھی محرم کے دنوں میں واقعات کربلا بیان کرتے ہیں یا عقیدت سے سنتے ہیں اور اظہار نوحہ و ماتم کرتے ہیں اس لیے متلاشی حق کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ یہ روافض کا طریقہ کوئی سنی مسلمان اختیار کرتا ہے تو اس کا یہ فعل کیسا ہے، اس طرح کے بھی سوالات آپ سے ہوتے تھے اس کے جواب میں بھی حضرت گنگوہی نے شرعی مسئلہ بتایا کہ

"ذکر شہادت کا ایام عشرہ محرم میں کرنا بہ مشابہت روافض کے منع ہے، ماتم ونوحہ کرنا حرام ہے، فی الحدیث نھی عن المراثی (الحدیث) اور خلاف روایات بیان کرنا سب ابواب میں حرام ہیں تقسیم صدقات بہ تخصیص ان ایام کرنا اگر یہ جانتا ہے کہ آج ہی زیادہ ثواب ہے تو بدعت ضلالۃ ہے، علی ہذا کسی طعام کی کسی یوم کے ساتھ تخصیص کرنا لغو ہے، صدقہ کا طعام غنی کو مکروہ اور سید کو حرام ہے، اس پر طعن کرنا فسق ہے"

اذان علی القبر

بدعات کی فہرست تو بہت طویل ہے، مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں ہر ہر قدم پر رسم ورواج کی حکمرانی تھی عوام تو خیر ان پڑھ ہیں، خواص اور اہل علم کو بھی چنداں پروا نہیں کہ عامۃ الناس شاہراہ شریعت سے کتنے دور ہوتے جا رہے ہیں، مصنوعی پیر اور علماء سوء دین میں اضافہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے نئی نئی بدعتوں کی ایجاد میں دلچسپی رکھتے اور ان کو کار ثواب جان کر ان کی ترویج کی کوشش کرتے، انھیں بدعتوں میں سے ایک اذان علی القبر بھی ہے، شمالی ہند میں اس کا رواج نہیں تھا لیکن ادھر کچھ عرصہ سے اس بدعت پر کافی زور دیا جا رہا ہے اور مبتدعین

تدفین کے بعد اس اذان کو ضروری سمجھنے لگے ہیں، اس کی کوئی اصل اور شرعی بنیاد نہیں۔ بس انھوں نے یہ دیکھا کہ بچے کی ولادت کے وقت اذان دی جاتی ہے تو انھوں نے موت کے وقت بھی اس کو جاری کر دیا جب کہ پورے ذخیرۂ حدیث میں اس کا ذکر نہیں پایا جاتا ہے، حضرت گنگوہی سے بھی "اذان علی القبر" کی شرعی حیثیت پوچھی گئی تھی تو آپ نے جواب دیا تھا جو فتاوی رشیدیہ کے ص ۱۴۴ پر ہے

"اذان بعد دفن کے قبر پر بدعت ہے کہ لیکن قرون ثلثہ میں اس کا ثبوت نہیں اور جو امر ایسا ہو وہ مکروہ ہے تحریماً قال فی فتح القدیر البحر یکره عند القبر ما لم یعهد من السنة و المعهود منها لیس الازیادته والدعاء عنده قائما ، پس اذان کہنا اس جگہ منع ٹھہرا، سونہ کرنا چاہیے"

اس جواب کو مزید مدلل و مبرہن کیا گیا ہے اور کچھ اور کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں، اور شاہ اسحاق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے مشہور کتابچہ ماۃ مسائل میں بیان کردہ مسئلہ کو پیش کر دیا گیا ہے، کچھ حوالے جو دیے گئے ہیں درج ذیل ہیں

ردالمحتار میں ہے تنبیه فی الاقتصاد علی ما ذكره من الوارد اشارة الی انه لا یسن الاذان عند ادخال المیت فی قبره کما هو المعتاد الآن و قد صرح ابن حجر فی فتاواه بانه بدعة و قال من ظن انه سنة قیاساً من ندبها للمولود الحاقاً بخاتمة الامر بابتدائیة فلم یصب (انتهٰی)

علامہ خیر الدین رملی نے حاشیہ بحر الرائق میں لکھا ہے،

وقیل عند انزال المیت القبر قیاساً علی اول خروجه عن الدنیا لکن ردهٔ ابن حجر فی شرح العباب

درالبحار میں لکھا ہے، من البدع التی شاعت فی بلاد الهند

الاذان علی القبر بعد الدفن
توشیخ شرح تنقیح محمود البلخی میں مذکور ہے ما فی اللاتور من الاذان علی القبر لیس بشیء، کذا فی التفھم المسائل۔
نوٹ: حضرت گنگوہی کے فتوی کو مزید مدلل و مبرہن کرنے کے لیے مفتی مکہ مکرمہ مولانا عبد اللہ میر غنی کا فتوی بھی ان کی کتاب "ہدیۃ المکہ" سے نقل کیا گیا ہے جس میں سوال و جواب دونوں ہیں، سوال عربی زبان میں ہے اس کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے

"کیا مذہب حنفی میں مردے کو قبر میں دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دینا جائز ہے؟ اور جو شخص اذان قبر پر اصرار کرے اور اس کو سنت سمجھے اور اس کو ترک کرنے والوں کی مذمت کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ وہ درست کہتا ہے یا خطاکار ہے اور بدعتی ہے"

اس کے جواب میں مفتی مکہ مکرمہ نے تحریر فرمایا جواب بھی عربی میں ہے اس لیے اس کو اُردو میں پیش کیا جارہا ہے

جواب: بحر الرائق میں صراحتاً لکھا ہوا ہے کہ ہر وہ کام مکروہ ہے جو سنت سے ثابت نہیں ہے، احادیث سے تو صرف اتنا ہی ثابت ہے کہ قبروں کی زیارت کی جائے اور ان کے لیے دعاء مغفرت کی جاوے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جنت البقیع میں تشریف لے جاتے تھے تو کرتے تھے، اسی سے سوال کا جواب معلوم ہو جاتا ہے، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبر پر اذان دینا ثابت نہیں ہے (عبد اللہ میر غنی مفتی مکہ مکرمہ فتاوی رشیدیہ ص ۱۴۵)

عقیدوں میں فتور

اب تک ان بدعات اور مشرکانہ رسوم کا ذکر تھا جو ظاہر اعمال میں مروج تھیں لوگ اپنے آباء و اجداد کے طریقوں پر ان مراسم کو دین سمجھ

کر اور ثواب کا کام سمجھ کر کرتے تھے، ان کو خبر نہیں تھی کہ شریعت میں ان کاموں کی گنجائش نہیں ثواب کے بجائے اُلٹے گناہ ہوتا ہے اور جب ان کو شریعت کی منشاء معلوم ہو جائے گی تو امید ہے کہ خدا توفیق دے گا تو وہ ان خلاف شرع رسوم کو ترک کر دیں گے، البتہ اس سے خطرناک بات یہ تھی کہ لوگوں کے عقائد بگڑتے جا رہے تھے اور اپنے غلط عقیدوں پر ان کو اصرار تھا اور اس کے خلاف وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھے، حضرت گنگوہی کی نظر اس صورت حال پر بھی تھی، فتاوی رشیدیہ میں ان باطل عقائد کی مدلل اور مسلسل تردید فرمائی ہے ان غلط عقائد کی کچھ مثالیں یہاں پیش کی جا رہی ہیں۔

فساد عقیدہ

پیر پرستی، اولیاء پرستی کو جاہل صوفیاء نے اتنا بڑھایا کہ ان بزرگوں کو مقام الوہیت تک پہونچا دیا سارے خدائی اختیارات ان کو سونپ دیے، خدا کے نام کے ورد کے بجائے یا شیخ جیلانی یا خواجہ اجمیری کا وظیفہ سکھاتے تھے ان میں جو لکھے پڑھے تھے وہ اس کی تاویلیں کر لیتے تھے لیکن جن لوگوں کو یہ وظیفہ سکھایا جاتا تھا وہ تو براہ راست اولیاء اللہ کو بجائے خدا کے پکارتے تھے، حضرت گنگوہی کے زمانہ میں علماء سوء نے اس بد عقیدگی کو بہت پھیلایا، یہ بڑا خطرناک اقدام تھا کیوں کہ اکثر الفاظ یا تو مشرکانہ تھے یا کم از کم موہم شرک تھے اس سلسلہ میں حضرت گنگوہی کی خدمت میں سوالات آئے تو آپ نے ذرا تفصیل سے کام لیا کیوں کہ مخاطب یا سائل اہل علم تھے مگر مسئلہ کو خوب واضح کر کے تحریر فرمایا، سوال یہ تھا کہ بعض صوفیاء یا عبدالقادر شیئاً للہ کا وظیفہ پڑھتے ہیں ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا، حضرت گنگوہی نے اس استفتاء کے جواب

میں تحریر فرمایا کہ

"اس کا ورد کرنا بندہ جائز نہیں جانتا، اگرچہ شرک نہیں لیکن مشابہ بہ شرک ہے اور بعض فعل مشابہ بہ شرک ہوتے ہیں اور صغیرہ ہوتے ہیں کہ شرک کلی مشکک ہے کہ اس کے افراد قلت و کثرت معصیت میں متفاوت ہیں، مثلاً قسم بغیر اللہ کو حدیث میں شرک فرمایا ہے لہٰذا وہ گناہ صغیرہ ہے، پس ورد اس کا مشابہ بہ شرک ہے کہ غیر اللہ سے طلب حاجات ہے مگر جو محض ان کلمات میں اثر جان کر پڑھتا ہے وہ کافر و مشرک نہ ہوگا اگرچہ معصیت سے خالی نہیں ہوگا اور جو شیخ قدس سرہ کو متصرف بالذات اور عالم غیب بذات خود جان کر پڑھے گا وہ مشرک ہے اور اس عقیدہ سے پڑھنا کہ شیخ کو حق تعالیٰ اطلاع کر دیتا ہے اور باذنہٖ تعالیٰ شیخ حاجت بر آری کر دیتے ہیں یہ بھی شرک نہ ہوگا باقی مومن کی نسبت بد ظن ہونا بھی معصیت ہے اور جلدی سے کسی کو کافر و مشرک بنا دینا بھی غیر مناسب ہے اور ایسے موہم الفاظ کو پڑھنا بھی بے جا و معصیت ہے" (فتاویٰ رشیدیہ ص ۵۰)

مذکورہ بالا جوابات آپ نے اپنے ایک متوسل کو خط میں تحریر فرمایا تھا لیکن آپ کے سامنے وہ بحث اور گفتگو پیش کی گئی جو اس وظیفہ کی حمایت کرنے والے کرتے ہیں تب بہ دلائل آپ نے اس عقیدہ کی مدلل تردید فرمائی ہے اور شریعت کا حکم دوٹوک لفظوں میں تحریر فرمایا ہے اسی مجموعہ فتاویٰ میں اسی جواب کے بعد مفصل آپ کی تحریر موجود ہے جس سے شکوک و شبہات کے سارے بادل چھنٹ جاتے ہیں آپ نے یا عبد القادر شیئاً للہ کا وظیفہ پڑھنے والوں کے سلسلہ میں تحریر فرمایا

"اس کلام کا پڑھنا کسی وجہ سے جائز نہیں ہے اگر شیخ قدس سرہٗ کو عالم الغیب اور متصرف مستقل جان کر کہتا ہے تو خود مشرک محض ہے بقولہ

تعالی و عندہ مفاتیح الغیب لا یعلمها الا هو (الایة) و دیگر نصوص قال فی البزازیة و غیرها من الفتاویٰ من قال ان ارواح المشائخ حاضرة تعلم کفر و من ظن ان المیت یتصرف فی الامور دون الله و اعتقد به کفر، کذا فی البحر الرائق. اور جو یہ عقیدہ نہیں تو بھی ناجائز ہے کیونکہ اس صورت میں گو یہ ندا شرک نہ ہوگا مشابہ بہ شرک ہے اور جو لفظ موہم شرک ہو اس کا بولنا بھی ناروا ہے بقوله تعالی لا تقولوا راعنا و قولوا انظرنا اور لقوله علیه السلام فلا تقولوا ماشاء الله و ما شاء فلان و لکن قولوا ماشاء الله ثم ماشاء فلان (الحدیث) حالانکہ صحابہ کی نیت میں کوئی معنی قبیح نہ تھے، مگر بسبب مشابہت اور موہم معنی قبیح کے یہ الفاظ ممنوع ہو گئے پھر عوام اس سے ورطۂ شرک و گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں تفسیر عزیزی میں بیان وجوہ شرک میں لکھا ہے، ازاں جملہ اند کسانیکہ در ذکر دیگراں را با خدا تعالیٰ ہمسری کنند و ازانجملہ اند کسانیکہ در دفع بلا دیگراں رجوع می نمایند بالاستقلال نہ آنکہ توسل باں دیگراں نمایند"

انداز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مبتدع نے اس وظیفہ کو مختلف دلائل سے ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی تھی حضرت گنگوہی اس کے دلائل کو رد کرتے ہوئے جن عبارتوں کو اس نے مستدل بنایا تھا ان کا صحیح مفہوم بتا کر اس کی دلیل کو اس کے خلاف ایک مضبوط دلیل بنا دی، اس تحریر کے آخر میں دستخط کے بعد آپ نے اس مسئلہ کو اور مدلل کرنے کے لیے کچھ اور بھی حوالے دیے ہیں آپ نے مزید تحریر فرمایا کہ

"(یا عبد القادر شیئاً للہ) پڑھنے والا اس جملہ کا تقریباً اور شہرت دینے والا اس کے جواز کا اعتقاداً آثم اور مشرک ہے، سند اس کی حجۃ اللہ البالغہ مولفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ص ۶۱ میں موجود ہے قال، و منها ای من مظان الشرك انهم کانوا یستعینون بغیر الله فی

حوائجهم من شفاء المريض غنا الفقير و لينذرون لهم يتوقعون نجاح مقاصدهم بتلك النذور و يتلون اسماء هم رجاءً بير كتها فاوجب الله عليهم ان يقولوا فی صلواتهم اياك نعبد و اياك نستعين و قال الله تعالیٰ فلا تدعوا مع الله احدا، و ليس المراد من الدعاء العبادة كما قال بعض المفسرين بل مراده الاستعانة بقوله تعالیٰ بل اياه تدعون ليكشف ما تدعون (۱)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بھی اس مضمون کو صراحتاً ارشاد الطالبین میں ذکر کیا ہے مسئلہ آنچہ جہال می گویند یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ جائز نیست، شرک و کفر است، حق تعالیٰ می فرماید والذين تدعون من دون الله عبادا امثالكم

اسی طرح شاہ عبد العزیز کی تقریر بھی بعض حواشی میں صراحتاً اسی مضمون پر دال ہے سوال، اگر کسے نام سوائے خدا تعالیٰ را بطریق تقرب ورد سازد از مسلمانی بیروں گردد؟

جواب۔ اگر امام کسے بطریق تقرب ورد زبان می سازد مشرک گردد (نتہی ملخصاً) اور شہرت دینے والا بسبب اعتقاد جواز کے مشرک ہے اور شہرت جواز کی دینی علاوہ شرک سے دوسرا وبال ہے۔ (فتاوی رشیدیہ ص ۵۰ تا ۵۳)

چوں کہ یہ فتویٰ عام اہل بدعت، علماء سوء، مصنوعی صوفیاء، قبروں کے مجاور اور سجادہ نشینان خانقاہ کے خلاف تھا اس لیے شورش یقینی تھی اس لیے اس کی اشاعت عام بھی ضروری تھی مختلف شہروں کے علماء سے تصدیقی دستخط لیے گئے اور باقاعدہ طبع کرا کے شائع کیا گیا کتاب میں مندرجہ ذیل مشہور ترین علماء کے تصدیقی دستخط موجود ہیں۔

مولانا قاسم علی مفتی و خطیب شہر مراد آباد، مولانا بینظیر شگفتہ گل

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ دہلوی، ج:۱، ص:۶۲ مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی

پشاوری مراد آباد مولانا محمد حسن صاحب مراد آباد، مولانا قاضی احتشام الدین صاحب مراد آباد، مولانا بشیر احمد شاہ، مولانا احمد حسن محدث امروہوی، مولانا محمود حسن دیوبندی دار العلوم دیوبند بعض حضرات نے تصدیق و توثیق کے بعد کچھ اضافے بھی فرمائے ہیں جیسے مولانا عبد الرحمٰن صاحب نے اپنے دستخط کے ساتھ اس عبارت کا اضافہ فرمایا ہے۔

"اس کی کوئی صورت گناہ سے خالی نہیں، کسی میں شرک ہے کسی میں ایہام شرک لہٰذا اس کا رواج دینا جائز نہیں عبد الرحمٰن عفی عنہ

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری نے بھی ایک جملہ کے اضافہ کے ساتھ اپنی غیر مبہم رائے تحریر فرمائی ہے وہ تحریر فرماتے ہیں

"وظیفہ جملہ مروجہ یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ کسی طرح جائز نہیں، واللہ اعلم خلیل احمد انبیٹھوی عفی عنہ

مولانا محمود صاحب استاد دار العلوم دیوبند نے تائید و توثیق کرتے ہوئے تحریر فرمایا

"واقعی اموات کو بذریعہ شیئاً للہ ندا کرنا یا شرک ہے یا اندیشہ شرک ہے اور مسلمان کو دونوں امر سے اجتناب لازم ہے، محمود عفی عنہ دیوبندی (فتاوی رشیدیہ ص ۵۳)

یارسول اللہ عقیدۂ علم غیب کے ساتھ

آج کل تو جلسوں جلوسوں میں نعرۂ رسالت یا رسول اللہ نعرۂ غوثیت یا غوث، اہل بدعت کے یہاں عام طور پر مروج ہے اور عام طور سے یہ عقیدہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں سے پکارا جائے وہ سنتے ہیں یعنی ان کو علم غیب حاصل ہے حضرت گنگوہی کے زمانہ میں بھی اسی طرح کا مسئلہ پیدا ہوا تھا اسی وقت آپ نے اس کی تہ میں جو بد عقیدگی چھپی ہوئی تھی اس کو پیش نظر رکھ کر اپنی رائے اور شریعت کا حکم غیر مبہم

الفاظ میں پیش کر دیا تھا اور اس زمانہ میں تو بڑی جرأت کے ساتھ اس عقیدہ کے ساتھ یہ نعرے لگائے جاتے ہیں حضرت گنگوہی کی خدمت میں ایک استفتاء آیا جس میں سوال کیا گیا کہ

"یارسول اللہ دور سے یا نزدیک قبر شریف سے پکارنا جائز ہے یا نہیں؟

اس کا جواب حضرت گنگوہی نے قدرے تفصیل کے ساتھ دیا، کیونکہ شورش وہنگامہ کا اندیشہ تھا اس لیے مسئلہ کو خوب واضح کر کے فتوی تحریر فرمایا آپ کے فتوی کے الفاظ ہیں

"جب انبیاء علیہم السلام کو علم غیب نہیں تو یارسول اللہ کہنا بھی جائز نہ ہوگا، اگر یہ عقیدہ کر کے کہے کہ وہ دور سے سنتے ہیں بسبب علم غیب کے تو خود کفر ہے اور جو یہ عقیدہ نہیں تو کفر نہیں، مگر کلمہ مشابہ بہ کفر ہے، البتہ اگر اس کلمہ کو درود شریف کے ضمن میں کہے اور یہ عقیدہ کرے کہ ملائکہ درود شریف کو آپ کے پیش عرض کرتے ہیں تو درست ہے کیوں کہ حدیث شریف میں ہے کہ ملائکہ درود بندۂ مومن کا آپ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں اور ایک صنف ملائکہ اسی خدمت پر مقدر ہے۔

فقط رشید احمد عفی عنہ

(فتاوی رشیدیہ ص:۶۶)

جہد مسلسل

میں نے حضرت گنگوہی کی رد بدعت کے سلسلہ میں یہ چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کی ہیں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ حضرت گنگوہی کے گرد و پیش کس طرح کی بد عقیدگیاں اور بدعات وخرافات پھیلی ہوئی تھیں اور کتنی شدت کے ساتھ ان پر عمل ہو رہا تھا کہ انکے خلاف آواز اٹھانی خطرات کو دعوت دینی تھی، کئی ایک مسئلوں میں آپ کے خلاف

زبردست فتنے اُٹھے سب وشتم میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی، آپ کے عزیز و اقارب بھی آپ کی مخالفت میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے تھے لیکن ان تمام موانع کے باوجود بدعات وخرافات اور مشرکانہ عقائد کے خلاف ہمیشہ علم جہاد بلند کیے رہے۔

میں نے ساری مثالیں مجموعہ فتاویٰ سے دی ہیں اس کی وجہ سے شاید ذہن میں یہ بات آئے کہ مستفتی کا سوال تحریری آیا اسی کاغذ پر اس کا جواب لکھ کر اس کو بھیج دیا گیا ایک شخص نے مسئلہ پوچھا آپ نے اس کا جواب دے دیا اس کا اثر عوام تک کیسے پہونچ سکتا ہے یہ تو گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر ہر مفتی کر سکتا ہے، مگر بات یہ نہیں ہے، اظہار حق اور رد بدعت کا تعلق صرف تحریر اور فتویٰ نویسی تک نہیں تھا اور نہ فرد واحد کو مسئلہ بتادینے تک محدود تھا، حضرت گنگوہی کے ہر فتوی کے پیچھے جنگ و جدال شورش وہنگامہ، فتنہ وفساد، سب وشتم کا ایک طوفان پوشیدہ ہے اسی کے ساتھ اس طوفان سے جم کر مقابلہ کرنے والوں کے جوش وجذبہ سے بھرپور للکاریں بھی مستور ہیں، ہر فتوی اپنی ایک داستان رکھتا ہے، اور موثر اصلاح کی مستقل کہانی ہے۔ حضرت گنگوہی کے اس جہاد کی اہمیت و ہمہ گیری کو سمجھنے کے لیے تھوڑی تفصیلات کا علم بھی ضروری ہے، تبھی آپ سمجھ سکیں گے کہ حضرت گنگوہی کا ہر فتوی فتوی ہی نہیں ایک نعرۂ جہاد ہے اس کی للکار جتنی بلند ہوئی اتنی ہی کامیابی بھی ملی، میں مختصر طور پر آپ کے سامنے اس صورت حال کو پیش کرتا ہوں۔

آپ کی ذات مرجع العلماء تھی

شاید آپ کو معلوم ہو کہ حضرت گنگوہی سفر بہت کم کرتے تھے، جلسوں میں شرکت بدرجہ مجبوری کرتے تھے، مواعظ کی بھی کم ہی نوبت آتی تھی

آپ قصبہ گنگوہ میں جو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہیں آپ کی خانقاہ تھی وہیں آپ کا ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا گنگوہ کی حدود سے باہر کسی شدید ضرورت ہی کی بنا پر تشریف لے جاتے تھے، اس کے باوجود آپ کی آواز بہت طاقتور تھی اور دور دور تک جاتی تھی آپ کی زبان سے ایک جملہ کا نکل جانا سیکڑوں وعظوں پر بھاری تھا اس لیے آپ نے جو طریقہ کار اختیار فرمایا تھا وہ انتہائی موثر تھا، اور آپ کی آواز کو ہر حلقہ تک پہونچانے میں موثر رول ادا کرتا تھا۔

پہلی بات تو یہ کہ آپ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی کے اجلہ خلفاء میں تھے اور حضرت حاجی صاحب سے وہ حلقہ بھی وابستہ تھا جو بریلی وبدایوں کے علماء کے عقیدوں پر تھا اور وہ حلقہ بھی جو حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، جامعہ قاسمیہ مراد آباد کے مکتبہ فکر سے وابستہ تھا اور ان کے مسلک پر تھا آپ کے خلفاء اور مسترشدین میں ہندوستان کے مشہور ترین علماء تھے اور ہر ایک کا اپنا اپنا ایک وسیع حلقہ اثر تھا، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، ملا محمود دیوبندی مدرس اول دارالعلوم دیوبند، حافظ احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ابن حضرت نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا خلیل احمد انبیٹھوی شیخ الحدیث و صدرالمدرسین مظاہر علوم سہارنپور، مولانا احمد حسن محدث امروہوی، مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث امروہوی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی جو استاذ العلماء کہے جاتے تھے، مولانا قاسم علی مفتی شہر مراد آباد و خطیب جامع مسجد مراد آباد، مولانا محمد حسن صاحب شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد ان کے علاوہ مدرسہ عالیہ ریاست رام پور کے اکثر اساتذہ کو آپ سے قربت تھی۔ بجنور، مظفر نگر، سہارنپور، میرٹھ اور مراد آباد کے اکثر علماء آپ کے حلقہ بگوش تھے۔

امرتسر اور لاہور کے علماء بھی آپ کی آواز کی تائید میں آواز بلند کرنے والے تھے۔ آپ گنگوہ میں اپنی مجلس میں کوئی مسئلہ بیان فرماتے تھے یہ آواز مذکورہ بالا علماء کے ذریعہ ان تمام علاقوں میں سنائی دیتی تھی اس کی حمایت میں ہزاروں زبانیں کھل جاتی تھیں، جو پوری طاقت سے اس کی حمایت کرتی تھیں۔

دوسری بات یہ کہ آپ کا حلقہ درس برسہابرس سے قائم تھا بعد کے دور میں تو صرف دورۂ حدیث کا سلسلہ تھا، علماء سلف کی طرح اپنی خانقاہ میں حسبۃً للہ یہ درس جاری رکھے ہوئے تھے اس لیے ہر سال اس درسگاہ سے فارغ التحصیل علماء نکلتے تھے اور اپنے اپنے علاقوں میں جاتے تھے اور وہیں کام کرتے تھے ان میں سے اکثر آپ سے بیعت بھی ہو جاتے تھے اس لیے ان کی نگاہیں ہمیشہ اپنے استاد اپنے شیخ کے ارشادات کی طرف لگی رہتی تھی اور ان کے مشن کو آگے بڑھانے میں وہ شب و روز مصروف رہتے تھے اس طرح حضرت گنگوہی کے اثر میں ایک زبردست ذہنی و فکری تنظیم تھی جو آپ کی باتوں کو دور دور تک پہونچانے اور اس کو تقویت دینے اور عملی طور پر نافذ کرنے اور عوامی ذہن کو اس کے سانچے میں ڈھالنے میں شب و روز مصروف رہتی تھی۔ اس لیے جب آپ کا کوئی فتوی جاری ہوتا تھا تو اہم ترین مسائل یا ایسے مسائل جن کا تعلق عوام الناس کے بہت بڑے دائرے تک پھیلا ہوا ہے تو اولاً آپ کا فتوی قلم بند ہو کر تمام مشاہیر علماء کے پاس بھیج دیا جاتا تاکہ اس کی تفصیلات اور اجمالی طور پر دلائل سے آشنا ہو جائیں اور اس پر اپنے توثیقی دستخط کر کے شریک فتوی ہو جائیں، پھر اس کو اپنے اپنے حلقہ اثر میں عام کریں، اس طرح ایک فتوی جو گنگوہ میں لکھا گیا اس کی شہرت تمام بڑے شہروں تک پہونچ جاتی تھی، اہل حق اس کی پشت پر ہوتے، عوام تک پہونچاتے،

مخالفت کرنے والوں سے بحث و مباحثہ کرتے، خود بھی اس مسئلہ سے متعلق مطالعہ کر کے اس کے دلائل میں اضافہ کرتے اور پوری بصیرت کے ساتھ جمعہ کے خطبوں میں اپنے اپنے مواعظ میں اس کو بیان کرتے اس طرح عوام تک بات پہونچاتے تھے اور پورے ملک میں حضرت گنگوہی کا فتوی بجلی کی رو کی طرح بڑھتا اور اثر انداز ہوتا تھا اور ملک کی فضا میں ایک تحریک جوش عمل، ایک نئی امنگ پیدا ہو جاتی جس کام کو آپ نے شریعت کی روشنی میں بدعت، نو ایجاد، خلاف شرع قرار دیا، جن عقیدوں کو مشرکانہ فرمایا اس کے خلاف ہر شہر میں علم جہاد بلند ہو جاتا تھا اور بدعات و خرافات کی دنیا لرزہ بر اندام ہو جاتی تھی۔

اس ملک میں دوسری تحریک اصلاح علماء دیوبند نے چلائی اس کے صرف دو قائد و رہنما اور میر کارواں تھے ایک حضرت نانوتوی اور ایک حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی تو توسیع تعلیم کی راہ سے یہ خدمت انجام دے رہے تھے اور ان کے رفیق دیرینہ اور ہم سبق دوست حضرت گنگوہی اپنے ملفوظات اور فتاوی کے ذریعہ دین کی یہ خدمت انجام دے رہے تھے، چونکہ حضرت گنگوہی کے طرز عمل کی زد براہ راست اہل بدعت پر پڑتی تھی اس لیے علماء بدایوں و بریلی کا سب سے زیادہ غصہ حضرت گنگوہی پر اترتا تھا اور سب و شتم کرتے تھے۔

بدعات کی حمایت و تائید میں سب سے پہلی کتاب اردو زبان میں حضرت گنگوہی کے جدی وطن رام پور ضلع سہارنپور سے شائع ہوئی اس کے مصنف مولوی عبدالسمیع رام پوری تھے جو حاجی امداد اللہ تھانوی کے مرید تھے تو سب سے پہلے اس کتاب کے خلاف آپ نے آواز بلند کی اور بدعت و مشرکانہ عقائد کے خلاف اعلان جہاد کر دیا اور اپنے خلیفہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری کو اس کتاب کے جواب لکھنے

کا حکم دیا اور آپ کو تفصیلی ہدایات دیں، کتاب کا ایک ایک حرف پڑھتے اور اپنی رائے دیتے اور جب کتاب مکمل ہو گئی تو آپ نے اس کی اشاعت میں دلچسپی لی اور کتاب کی فروخت میں بھی، "براہین قاطعہ" میں قلم محدث سہارنپوری کا ہے الفاظ و بیان ان کے ہیں مگر ذہن و مزاج افکار و خیالات دلائل و براہین، توضیحات و تشریحات کا بڑا حصہ حضرت گنگوہی کا ہے اور اس کے لفظ میں حضرت گنگوہی کے جذبات بولتے ہیں، اس لیے مخالفین اس کتاب کو مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری کے بجائے حضرت گنگوہی کی کہتے تھے اور آپ ہی پر براہ راست سب وشتم کرتے تھے، اس کتاب نے حضرت گنگوہی کے بے شمار دشمن بنادیے اور ان کی ذات ان کا نشانہ بن گئی، لیکن آپ کے پائے استقامت میں کوئی جنبش نہیں پیدا ہوئی، مخالفین کی سب سے خطرناک جدو جہد یہ تھی کہ حضرت گنگوہی سے ان کے شیخ طریقت اور مرشد برحق حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی کو بدگمان کر کے ان کو بیعت سے خارج کرادیا جائے مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور حضرت گنگوہی کا اظہار حق اور رد باطل کا سلسلہ برابر جاری رہا اور آپ کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل بدعت اپنے خول میں سمٹ کر رہ گئے دوسری طرف علماء دیوبند کی پوری جماعت بدعات و خرافات کے مقابلہ میں صف بندی کر کے سامنے آگئی اور حضرت گنگوہی کی ہدایات کی روشنی میں رد بدعت پوری جماعت کا مشن بن گیا اور تقریباً ساٹھ ستر سال تک مباحثوں مناظروں کی معرکہ آرائیاں چلتی رہیں، اور قلمی جنگ برپا رہی، علماء دیوبند نے ان سارے محاذوں پر فتح و کامیابی کا پرچم لہرادیا جہاں انھوں نے قلعہ بندی کرنے کی کوشش کی تصنیف و تالیف کے ذریعہ علماء دیوبند نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے رکھ دیا اور دکھادیا،

اہلسنّت والجماعت میں جو اہل بدعت گھسے ہوئے تھے ان کے باطل عقائد کو منکشف کر کے علمی دنیا کے سامنے ان کو بے نقاب کر دیا، شرک و بدعت پر جو شریعت کا پردہ ڈال رکھا تھا ان کی اصلی اور سچی تصویر سے پردہ اٹھا کر دنیا کو دکھادی اور آج مسلمانوں کا سواد اعظم اس کو بچشم خود دیکھ رہا ہے، علماء دیوبند نے عرسوں اور قوالیوں کے دلدادہ علماء سوء اور زر پرست مصنوعی صوفیاء کی حقیقت کھول دی اور اہل بدعت کو حق پرستوں کی جماعت سے الگ کر کے کہہ دیا و امتازوا الیوم ایھا المجرمون.

اس تحریک اصلاح میں جو روح دوڑ رہی تھی وہ حضرت گنگوہی کے اظہار حق اور جوش کردار کی روح تھی، پوری جماعت کی نگاہیں صرف حضرت گنگوہی پر لگی ہوئی تھیں، ان کی زبان سے، ان کے قلم سے جو بات نکلتی تھی وہ بات "پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی تھی" علماء دیوبند و سہارنپور کے ذریعہ بدعات و خرافات کی دنیا میں پہونچ جاتی ان کی محفلوں عرسوں، قوالیوں میں زلزلہ ڈال دیتی، علمی دنیا منتظر رہتی اور کہتی ارنا الحق حقا و ارنا الباطل باطلاً، یہ سب ذہنی و فکری اور عملی انقلاب صدقہ ہے حضرت گنگوہی کے خلوص اور دینی بصیرت کا یہی وجہ ہے کہ ہماری جماعت میں صرف حضرت گنگوہی کو فقیہ النفس کا معنی خیز خطاب دیا گیا۔

آج شاہراہ اسلام سے جو بدعات، خلاف شرع رسم و رواج اور مشرکانہ عقائد کے سارے خس و خاشاک کو صاف کیا گیا، ان تمام کاموں میں حضرت گنگوہی کی حیثیت قائد ملت کی تھی، ان کی ذات سرچشمہ نور بن چکی تھی، جہاں سے رشد و ہدایت کی کرنیں پھوٹتی تھیں اور اس کی روشنی ہر چہار سمتوں میں پھیل جاتی تھی۔

دینی و ملی خدمات کے سلسلہ میں ہم نے فتاوی سے جتنی مثالیں پیش

کی ہیں وہ صرف فتوی نہیں بلکہ ہر فتوی درحقیقت ایک عنوان ہے، وہ تحریک اصلاح کے لائحہ عمل اور خاکہ کا ایک جز ہے، یہ فتوی ایک نعرۂ جہاد بھی ہے اور اعلان جہاد بھی، یہ فتوی سرنامہ ہے اس جد و جہد کی داستان کا جو حضرت گنگوہی اپنے حلقہ بگوشوں کو ساتھ لے کر فرمارہے تھے اور زندگی کے آخری لمحات تک وہ اس جد و جہد میں مصروف رہے اور آپ کے بعد آپ کے جانشینوں نے ہر ہر محاذ پر باطل کو شکست دے کر ثابت کردیا کہ فرمان نبوی میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے کہ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت ایسی رہے گی جس کو خدا کی مدد حاصل رہے گی اور وہ ہر محاذ پر کامیاب ہوں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے یہ پیشین گوئی برحق ہے اور علماء دیوبند کا کردار اس کی صداقت کی شہادت ہے۔

باب ۲۲

تصانیف اور رسائل و مسائل

حضرت گنگوہی کی تصنیفات کی تعداد بہت مختصر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بالکل نوجوانی میں ہی تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد آپ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ ہو گئے۔ سلوک و معرفت، تزکیہ باطن اور اورادووظائف کی پابندیاں انابت الی اللہ کے جذبات ہجوم کر کے آئے اور آپ کے پورے وجود پر چھا گئے، عملی زندگی میں انہیں جذبات سے رہنمائی ملی، وعظ و نصیحت، درس و تدریس بالخصوص احادیث سے شغف بڑھتا چلا گیا دعوت و اصلاح کی سرگرمیاں بھی اسی راہ سے آئیں، دین کی حفاظت، اللہ و رسول کے احکام اور شریعت و طریقت کی منشاء کے مطابق اعمال ظاہری، اور اعمال باطنی کو ہر قسم کی غیر شرعی آلائشوں سے پاک صاف رکھنا دین میں خود ساختہ افکار و خیالات کی آمیزش کر کے دین کے اصل خدوخال کو بگاڑنے کی ہر ممکن کوشش کے سامنے سینہ سپر ہو جانے کا جذبہ بھی اس سے پیدا ہوا۔ یہ وہ اسباب تھے کہ آپ تصنیف و تالیف کے بجائے عملی شاہراہ پر چل کر لوگوں کی اصلاح فرماتے رہے، آپ کی جملہ تصانیف جن کی بہت مختصر تعداد ہے کسی نہ کسی وقتی مسئلہ پر ہیں اور حالات نے مجبور کر کے لکھوائے ہیں، "سوائے امداد السلوک" کے جو آپ نے حاجی امداد اللہ تھانویؒ کے حکم سے تصنیف کی، بقیہ سارا تحریری سرمایہ مختلف فقہی مسائل پر اپنی تحقیقی رائے کے اظہار تک

محدود ہے۔ امداد السلوک کا تعلق تصوف و سلوک سے ہے اس کے علاوہ سبیل الرشاد ہدایۃ الشیعہ، ہدایۃ المعتدی، الرائے النجیح، او ثق العریٰ سب ان لوگوں کے جواب میں ہیں جو مذہب اہلسنت والجماعۃ پر الزام تراشیاں کرتے ہیں زبدۃ المناسک اور تصفیۃ القلوب ان سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ تین حصوں میں شائع ہوا ہے، ہم انہیں رسائل اور کتابوں اور ان کے موضوع و مباحث کا تعارف یہاں پیش کر رہے ہیں۔

۱- امداد السلوک

یہ تصوف پر ۱۱۷ صفحات کی کتاب ہے جو حضرت گنگوہی کی اپنی تصنیف یا طبع زاد نہیں بلکہ ایک کتاب رسالہ مکیہ کی آزاد ترجمانی ہے جو عربی زبان میں ہے۔ چوں کہ یہ لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں بلکہ اس میں حذف بھی ہے اور اضافہ بھی، اور جہاں جہاں ابہام یا مغلق مضامین آگئے ہیں ان کو آسان بنانے کی کوشش اور تشریح و توضیح بھی کی گئی ہے۔ اس لیے اصل کتاب سے زائد باتیں اسمیں آگئی ہیں اور اسی وجہ سے ہم اس کو حضرت گنگوہی کی تصانیف میں شمار کرتے ہیں۔ اور اس کا یہاں تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

اصل کتاب "رسالہ مکیہ" آٹھویں صدی ہجری کے ایک بزرگ عالم شیخ قطب الدین دمشقی کی عربی زبان میں تصنیف ہے۔ مصنف کے حالات تذکرہ کی کتابوں میں بہت کم ملتے ہیں، "کشف الظنون" کے مصنف نے صرف اتنا لکھا ہے۔

"الرسالة المكية للشيخ الامام قطب الدين عبدالله بن محمد بن أيمن الاصفهيدى"

کتاب کا نام اور اس کے مصنف کے نام بتانے پر اکتفاء کیا ہے، بہت دنوں بعد اس کتاب کی فارسی زبان میں ایک شرح لکھی گئی۔ اس میں شارح نے مصنف کے حوالے سے لکھا ہے کہ کتاب کی تصنیف مکہ مکرمہ میں ہوئی، دوبارہ مصنف نے اپنے وطن دمشق جاکر اس پر نظر ثانی کی اور مزید اضافے کیے۔

عصر حاضر کے مشہور بزرگ عالم حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور نے رسالہ مکیہ کی مزید تحقیق کی اور تفتیش کر کے ہماری معلومات میں اضافہ کیا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"اس رسالہ مکیہ کے نسخے معروف کتب خانوں میں نہیں ہیں البتہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اس کے دو نسخے موجود ہیں ان میں سے ایک نسخہ کے ختم پر کاتب نے مصنف کا نام شیخ قطب الدین الدمشقی السہروردی الکبراوی لکھا ہے، شیخ قطب الدین دمشقی کے زمانہ میں ایک مشہور بزرگ حضرت جلال الدین بخاری معروف بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت متوفی ۷۸۵ھ گذرے ہیں ان کے پاس رسالہ مکیہ کی تعلیم کا بہت زور تھا ان کے ملفوظات ملفوظ المخدوم کے نام سے چھپ چکے ہیں جس کا ترجمہ الدرر المنظوم کے نام سے مطبع انصاری دہلی میں ۱۳۰۹ھ میں چھپا تھا اس میں رسالہ مکیہ کا کئی جگہ ذکر ہے مخدوم صاحب کے ملفوظات میں ایک جگہ یہ بھی ہے کہ یہ رسالہ مصنف نے مجھے خود دیا ہے۔

اس ملفوظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے مصنف کی ملاقات ہوئی ہے اس سے ان کے رسالہ کی ایک قابل اعتماد سند بھی معلوم ہو گئی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس رسالہ سے واقفیت اہل طریقت کو رہی کیوں کہ بہت بعد میں اس کی ایک شرح لکھی گئی جس کے مرتب خیر آباد کے ایک بزرگ شیخ سعد بن بڈھن بن شیخ محمد ساکن خیر

آباد ہیں یہ شرح بڑے سائز کے ۸۲۴ صفحات میں ہے جس کا ایک نسخہ کتب خانہ مظاہر علوم سہارنپور میں موجود ہے شارح شاہ مینا لکھنوی کے مرید تھے اور بیس سال ان کی خدمت میں رہے ان کی وفات ۸۸۲ھ میں خیر آباد میں ہوئی یعنی رسالہ مکیہ کے مصنف کے انتقال کے ٹھیک ایک صدی بعد ان کا انتقال ہوا۔

اسی رسالہ مکیہ کا عربی سے فارسی میں حضرت گنگوہی نے ترجمہ کیا ہے یہ ترجمہ ایک محترم بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی کے پیر بھائی شیخ نور محمد جھنجھانوی کے خلیفہ حافظ ضامن شہید صاحب(۱) کے حکم کی تعمیل میں کیا گیا ہے جنہوں نے حضرت حاجی صاحب سے سفارش کر کے حضرت گنگوہی کو بیعت کر دیا تھا۔

امداد السلوک تصوف اور سلوک و طریقت کی حقیقت اور اس کے مقام و مرتبہ پر تشفی بخش روشنی ڈالتی ہے کتاب کے مقدمہ میں بتایا گیا ہے کہ شریعت و طریقت کے دو لفظ بولے جاتے ہیں لیکن ان کی حقیقت دو نہیں ہے شریعت کے احکام کو اس کی پوری معنویت کو سمجھ کر ان پر عمل کو معراج کمال تک پہونچانے کا نام طریقت ہے، شریعت خدائی قانون

---

(۱) حضرت حافظ ضامن شہید تھانہ بھون کے رہنے والے تھے اور شیخ نور محمد جھنجھانوی کے اجلہ خلفاء میں شامل تھے تصوف و سلوک میں بہت بلند مقام رکھتے تھے غدر ۱۸۵۷ء میں حاجی امداد اللہ تھانوی کی سرکردگی میں حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی وغیرہ کے ہمراہ شاملی تحصیل پر انگریزی فوج سے دست بدست جنگ کرنے والوں میں شامل تھے۔ اسی جہاد حریت میں حضرت حافظ ضامن شہید کو گولی لگی حضرت گنگوہی ان کو اٹھا کر قریب کی ایک مسجد میں لے گئے اور ان کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تلاوت قرآن میں مشغول ہو گئے اسی حالت میں آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اس وجہ سے ان کے نام کے ساتھ شہید کا لفظ استعمال کیا جانے لگا یہ لفظ ان کے نام کا ایسا جزء ہے کہ بغیر اس کے کہیں ان کا ذکر نہیں آتا شاملی فتح کرنے کے بعد آپ کو چارپائی پر اٹھا کر تھانہ بھون لایا گیا اور قصبہ کے مغربی جانب سپرد خاک کر دیا گیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن   خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(کاروان رفتہ اسیر ادروی)

اور مومنانہ زندگی کے اصولوں کا نام ہے اور ان اصولوں کی تہہ کو پہونچنا اور ان اصولوں کی صحیح منشاء کو سمجھ کر ان پر عمل کرنا ہی طریقت ہے حضرت گنگوہی کے الفاظ ہیں۔

> طریقت صوفیاء کی اصطلاح میں مقامات و منازل الی اللہ کے قطع کرنے کو کہتے ہیں اور اس کا پہلا دروازہ شریعت ہے خلاصہ یہ ہے کہ شریعت کے تابع بن کر حق تعالی کی عبادت میں لگنا اور پختگی و استقامت کے ساتھ رضائے حق کا متلاشی رہنا طریقت کہلاتا ہے۔(۱)

طریقت شریعت سے ہٹ کر نہ کوئی مسلک ہے نہ اس کے الگ سے احکام۔ شریعت پر پورے اخلاص سے عمل کر کے انسان اس بلند مقام پر پہنچتا ہے جو منشاء خداوندی ہے اور انسان کمال اجر و ثواب کا مستحق اور آخرت میں کامیابی کا مستحق ہوتا ہے، صوفیاء کی اصطلاح میں اسی کو طریقت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، ہر سالک کے لیے شریعت کے فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات اور افضل اعمال کا علم ہونا ضروری ہے اور رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل کرے مثلاً نوافل بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت ہے لیکن سالک کے لیے کھڑے ہو کر پڑھنا ہی ضروری ہے تاکہ اجازت اور رخصت کے بجائے افضل عمل پر وہ کاربند رہے۔ تصوف و سلوک چند اوراد اور وظائف کی پابندی کا نام نہیں بلکہ سالک کی زندگی کا ہر ہر لمحہ شریعت کے احکام کے مطابق گذرنا ضروری ہے حضرت گنگوہی نے جامع نافع الفاظ میں اس کی وضاحت فرمائی ہے آپ تحریر فرماتے ہیں۔

> چوں کہ عمل کی درستی کے لیے علم ضروری ہے خصوصاً علم فقہ نماز، روزہ وغیرہ عبادات میں سنت و فرض، واجبات اور مستحب کو معلوم کرے اور معاملات میں حرام حلال اور مکروہ کو جانے، پس سالک کے لیے لازم ہے کہ عقائد کی تصحیح کے بعد سب سے پہلے جس قدر

---

(۱) امداد السلوک، ص:۱۰

ممکن ہو مسائل فقہیہ معلوم کرے،، چناں چہ بعض صوفیا کا قول ہے کہ عمل بغیر علم کے سقیم و بیمار ہے اور علم بلا عمل کے عقیم و بیکار، اور علم مع عمل کے صراط مستقیم وراہ استوار ہے (۱)

شیخ کامل

اس کتاب کی طرح آپ نے اپنی کتاب میں بھی فصلیں قائم کی ہیں اور ہر فصل میں بنیادی اور اصولی باتوں کی نشاندہی فرمائی ہے چناں چہ دوسری فصل میں آپ نے شیخ کامل کی تلاش وطلب پر گفتگو کی ہے آپ نے بتایا ہے کہ سالک کے لیے ایک شیخ کامل کا ہونا ضروری ہے، اور پھر اسکو متعدد آیات اور آحادیث سے ثابت کیا ہے، شیخ کامل کیسا ہونا چاہیے اس کی خصوصیات کیا ہونی چاہیے اس سلسلہ میں آپ تحریر فرماتے ہیں۔

شیخ کسی صورت وشکل کسی ذات یا قوم کا کیوں نہ ہو مگر وہ ہونا چاہیے جو طریق حق پر چل رہا ہو...... طریقت کی کسوٹی قرآن وسنت اور اجماع امت ہے کہ جو طریقہ اس معیار پر کھرا ثابت ہو وہ مقبول ہے ورنہ مردود و مطرود۔

آپ نے حدیث کی روشنی میں بھی شیخ کامل کی ہم نشینی، اس کی صحبت میں بیٹھنے کو مفید ثابت کیا ہے اور مثال میں آپ نے اس حدیث کو ذکر کیا ہے جس میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صالح ہم نشین اور غیر صالح ہم نشین کو مثال دیکر سمجھایا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ صالح ہم نشین کی مثال عطر فروش کی ہے کہ عطر نہ بھی دے گا تب بھی اس کی خوشبو تمہیں ضرور حاصل ہو گی اور بد اور غیر صالح ہم نشین ایسا ہے جیسے لوہار کہ اگر اس کی بھٹی کی آگ بدن اور کپڑے نہ بھی جلائے تو بھی دھوئیں کی بدبو دماغ کو ضرور پریشان کرے گی پھر آپ نے تحریر فرمایا کہ۔

---

(۱) امداد السلوک، ص: ۲۔

"مرید ہونے والے پر لازم ہے کہ شیخ کامل کی تلاش میں پوری کوشش کرے اور خوب جانچے کہ یہ شیخ بنانے کے لائق ہے یا نہیں، کیوں کہ بہتیرے طالب اس راستہ میں بددینوں کا اتباع کر کے ہلاک ہو چکے ہیں۔(۱)

توحید مطلب

توحید مطلب کی اصطلاح کو سمجھاتے ہوئے آپ نے اس کا مفہوم بتایا ہے کہ شیخ کے ساتھ کس طرح کا ارتباط ہو تو مفید ہوگا اور کامیابی حاصل ہوگی ایک وقت میں ایک سے ایک اہل اللہ اور شیخ ہوتے ہیں اور عام آدمی کو ان میں کسی کو ترجیح دینے کی صلاحیت نہیں ہوتی پھر اس کو کیا کرنا چاہیے، بیعت تو کسی ایک ہی شیخ سے ہوگا جب کہ اس کی نظر میں بہت مشائخ ہیں اور ہر ایک کے بارے میں وہ خوش عقیدہ بھی ہے آپ نے فرمایا کہ توحید مطلب کا معنی یہ ہے کہ اپنے شیخ کے متعلق اس کا یقین رکھے کہ دنیا میں اس کے علاوہ مجھ کو مطلوب تک کوئی نہیں پہنچا سکتا اور گو اس زمانہ میں دوسرے مشائخ بھی ہوں اور انہیں اوصاف کاملہ سے متصف بھی ہوں مگر میرا منزل مقصود پر پہنچنا اسی ایک کی بدولت ہوگا(۲)

حضرت گنگوہی نے شیخ میں جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے اس کی بھی تشریح فرمائی ہے اور لکھا ہے کہ شیخ قرآن و حدیث کا عالم ہو، عالم ہی نہیں بلکہ صفات کمال سے متصف ہو اور جاہ و مال کی محبت سے روگرداں ہو اور ایسے مشائخ ربانیین سے طریقت حاصل کیے ہوئے ہو جس کا سلسلہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مسلسل ہو، شیخ کے حکم کے مطابق ریاضت و مجاہدہ کر چکا ہو۔ حتی کہ گفتگو، کھانا، سونا، مخلوق سے ملنا جلنا کم اور صدقہ، سکوت، نماز، روزہ کی کثرت رکھ چکا ہو، مکارم اخلاق، حسنِ ادب مثلاً صبر،

(۱) امداد السلوک، ص: ۷۔ (۲) امداد السلوک، ص: ۹۔

شکر، توکل، یقین، سخاوت، قناعت، امانت رواداری تواضع اور فکر آخرت، صدق واخلاص میں وقار وسکون اور جاہ ومال وغیرہ کو خیر باد کہہ چکا ہو، پھر آپ نے تمام مکارم اخلاق کو شمار کرایا ہے جن سے شیخ کا متصف ہونا ضروری ہے۔

سالک کے لیے ہدایات

تیسری فصل میں سالک کے لیے تفصیلی ہدایات ہیں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ جب شیخ کامل مل جائے تو سالک کو حسب حال وہ جو ذکر تلقین کرے اس پر شیخ کے حکم کے موافق پابندی کرے یہاں تک کہ ذکر کی حرارت اس کی وجود پر حاوی ہو جائے اور یہ دوسروں کو تلقین کرنے کا اہل اور خرقہ تصوف حاصل کرنے کے موافق اور اللہ تعالی کے فضل سے صوفی ہو جائے، مبتدی کے لیے مناسب ہے کہ ذکر نفی واثبات کو بالجبر یا بالسر جس طرح بھی شیخ نے بتلایا ہے ہمیشہ اس طریقہ سے کیا کرے۔

اس تفصیل کے بعد آپ نے ذکر کی پابندی کے نتیجہ میں جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں ان کی تفصیل بیان فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ سالک کو ان کیفیات میں الجھنا نہیں چاہیے بلکہ شیخ کے حکم کے مطابق ذکر کا سلسلہ جاری رکھنا ضروری ہے۔

سالک کے لیے پابندی

اس سے آگے کی فصل میں سالک کے لیے کچھ مزید ہدایات تحریر فرمائی ہیں ان میں سب سے پہلی تاکیدی ہدایت یہ ہے کہ سالک کو ہمیشہ باوضو رہنا چاہیے یہاں تک کہ ایک ساعت بھی بے وضو نہ گذرے، اگر پانی نہ میسر ہو تو پانی میسر ہونے تک تیمم کر لے، اس ہدایت کے بعد آپ نے شریعت میں پاکی کی فضیلت اور اس کے بارے میں

احادیث اور قرآنی آیات سے اس کی اہمیت کو تحریر فرمایا ہے۔

سالک کے لیے دوسری شرط

پانچویں فصل میں سالک کی دوسری شرط یہ تحریر فرمائی کہ ایام ممنوعہ کے علاوہ روزانہ روزہ رکھے اور افطار کے وقت مختصر غذا لے پھر اس کی اہمیت اور حکمت بتائی ہے۔

چھٹی فصل میں سالک کے لیے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ بجز ذکر وعبادات اور کار خیر کے لب نہ کھولے اس ہدایت کے بعد آپ نے خاموشی اور کم سخنی کے متعلق احادیث ذکر فرمائی ہیں۔

چوتھی شرط سالک کے لیے آپ نے دوام خلوت بتائی ہے، پھر اس کی وضاحت فرمائی کہ خلوت کا مطلب یہ ہے کہ قلب کے حواس باطنی کو کھولنے کے لیے حواس ظاہری کو بند کرے قلب کے حواس باطنی حواس ظاہری کو بند کیے بغیر نہیں کھلتے ہیں، آپ نے تحریر فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے قبل برسوں خلوت پسند رہے اور پھر غار حرامیں آپ کی خلوت کی تفصیل دی ہے۔ مسند وسیرت نبوی کے واقعات اور احادیث اس سلسلہ میں آپ نے پیش کی ہیں، خلوت میں ریاضت، وحی الٰہی کا آنا، پھر آپ کی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف آوری کی تفصیل بیان فرمائی ہے اور خلوت کی اہمیت اور اس کے فوائد پر روشنی ڈالی ہے۔

ان تفصیلات کے بعد آپ نے خلوت کی مدت پر گفتگو فرمائی ہے اسلام رُہبانیت سے انکار کرتا ہے، علائق دنیا سے ایک دم بے تعلق ہو جانا اسلام میں پسندیدہ نہیں بلکہ ہر ایک کے حقوق ادا کرتے ہوئے شریعت کے تقاضوں کی تکمیل ہی اسلام کی روح ہے۔

آپ نے بتایا کہ خلوت کی مدت بعض اہل اللہ نے چالیس دن بتائی ہے اور اس سلسلہ میں عبداللہ بن عباسؓ کی روایت پیش کی ہے، بعض مشائخ نے ایک ماہ کی مدت بتائی ہے اور دلیل میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں۔

خلوت کے شرائط و فوائد

خلوت کے فوائد اور شرائط کے سلسلہ میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ اس سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں مثلاً ہمیشہ پاک رہنا، ہمیشہ ذکر زبانی و قلبی کا وجود، کثرت تلاوت، زبان اور تمام حواس کا فضول حرکات سے بچا رہنا، ہمیشہ جمعہ اور جماعت کا اہتمام، نماز کا اول وقت میں ملنا کیونکہ یہ شخص جماعت کا منتظر رہے گا، خلوت سے مراد ہی یہ ہے کہ آدمی بالکلیہ ہمہ تن حدود شرعیہ کا اہتمام اور مصروفیت رکھے۔

سالک کے لیے ذکر

کتاب کی آٹھویں فصل میں آپ نے بتایا ہے کہ سالک ذکر زبانی اس کے معنی کو قلب میں حاضر کر کے پوری قدرت اور طاقت کے ساتھ خفیہ یا بالجہر جیسا بھی اس کو تلقین کیا گیا ہو ہمیشہ کرتا رہے، یہاں تک کہ ذکر کا اثر اس کی رگوں میں پہنچ جائے اور سب سے بہتر ذکر جیسا کہ حدیث میں آیا ہے لا الہ الا اللہ ہے ذکر سے قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور یہ طمانیت قلب اللہ کو بہت محبوب ہے اور اس کا بہت بلند مقام ہے، قرآن میں کہا گیا الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔

جب ذکر میں قلب درجہ استغراق کو پہنچ جاتا ہے تو ذکر زبانی چھڑا دیئے جاتے ہیں اور اللہ کی طرف توجہ میں مشغول کر دیتے ہیں حق تعالیٰ

فرماتے ہیں فاذکرونی اذکرکم، اسی مقام سے حضرت ثابت بنائیؒ مشہور محدث نے استنباط کر کے فرمایا ہے کہ مجھ کو معلوم ہے کہ کب حق تعالیٰ مجھے یاد فرماتا ہے، لوگوں نے پوچھا آپ کو کیوں کر معلوم ہوتا ہے؟ توانہوں نے کہا کہ جب میں اس کو یاد کرتا ہوں تو جان جاتا ہوں کہ وہ مجھ کو یاد کرتا ہے۔

ذکر کے آداب وشرائط

پھر آپ نے ذکر کے آداب وشرائط بتائے ہیں جن کی رعایت ضروری ہے تاکہ اس کے ثمرات وبرکات اور نتائج وفوائد پیدا ہوں ان شرائط میں سے بعض یہ ہیں۔

بہترین ذکر لاالہ الااللہ ہے، قولوا قولاً سدیدا کی تفسیر کلمہ طیبہ سے کی گئی ہے ذکر کرنے والا اپنا بدن، اپنے کپڑے، اور اپنی جگہ پاک صاف رکھے، وضواور غسل سے طہارت کاملہ حاصل کر کے چہار زانو روبہ قبلہ بیٹھے اور دونوں ہاتھ اپنی رانوں کے سرے پر گھٹنوں کے قریب رکھے، یا داہنے ہاتھ کی پشت کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے تھامے اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا بیرونی حصہ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصہ سے پکڑے اور اس کے بعد آنکھیں بند کر کے پست یا معتدل آواز سے جس طرح بھی شیخ نے تلقین کی ہو دل کو خدا کی طرف متوجہ رکھ کر لاالہ الااللہ کو بار بار اس طرح کہے کہ اپنے دل کے اندر سے پوری طاقت اور دل کی طرف کمال توجہ کے ساتھ بھلے اور برے سارے خطرات کو دور کر رہا ہے، لاالہ کو دل سے نکالے اور الااللہ کو پوری طاقت کے ساتھ دل میں پہنچائے اور حق تعالیٰ کی ذات کا اثبات کرے اور قلب کو پوری طرح پر خدا کی طرف متوجہ کرے یہاں تک کہ اس کلمہ کے حاصل

معنی یہ ہیں کہ کوئی چیز بھی موجود نہیں بجز حق تعالی کی ذات پاک کے، اس ذکر پر اسی طور سے حضور وقلبی مراقبہ وتوجہ کے ساتھ زبان سے مداومت کرتا رہے تتمہ میں ان آٹھ شرطوں کے فوائد بیان کئے گئے ہیں جو سالک کے لیے کتاب میں اب تک بیان کی گئی ہیں، آپ نے بتایا کہ ان شرطوں کا فائدہ اور مقصد یہ ہے کہ جوہر انسانی کا تصفیہ ہو جائے اور وہ بارگاہ بے نیاز میں پہنچنے کے قابل بن جائے۔

تصوف میں مروج اصطلاحات

چودھویں فصل میں آپ نے تصوف وسلوک میں جو اصطلاحات مروج ہیں ان کے معنی و مفہوم کو مختصر لفظوں میں بتایا ہے جن کو اختصار کے ساتھ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

توبہ: یہ حق تعالی کی طرف رجوع کا نام ہے ہمیشہ نادم رہے اور استغفار کی کثرت کرے۔

انابت: یہ غفلت سے ذکر کی جانب لوٹ آنے کا نام ہے۔

عفت: یہ شہوات نفسانی کے چھوڑ دینے کا نام ہے۔

ورع: اس شغل سے بچنا جو حق تعالی سے غافل کرنے والا ہو، ابراہیم بن ادہم نے فرمایا ہے کہ حرام سے زہد کرنا اور بے رغبت ہو جانا تو فرض ہے اور حلال سے زہد کرنا فضل ہے اور شبہات سے بے رغبت ہونا مکرمت ہے۔

ارادہ: ہمیشہ مشقت اٹھانے اور راحت کے چھوڑ دینے کا نام ہے۔

فقر: کسی شے کا بھی مالک نہ رہنا اور جو چیز پاس نہ ہو اس سے دل کو فارغ کر لینا کہ نہ ہاتھ میں کچھ ہو اور نہ دل میں تحصیل کی ہوس، یا ناداری کا غم ہو،

صدق: ظاہر و باطن کے برابر ہونے کا نام ہے۔

صبر: یہ نام ہے نفس کو تلخ یعنی مکروہات و ناگواری طبع امور کے خوگر

بنانے اور ماسوا سے شکوہ چھوڑ دینے کا۔
رضا: رضا نام ہے مصیبت میں لذت پانے کا جس کو رضا بالقضاء کہتے ہیں۔
اخلاص: یہ نام ہے خالق کے ساتھ معاملہ رکھنے کا، کہ مخلوق کا دخل ہی درمیان میں نہ رہے کہ کوئی برا مانے یا بھلا مگر طاعت میں فرق نہ آئے۔
توکل: وعدہ و وعید میں حق تعالیٰ پر اعتماد رکھنا اور ماسوا اللہ سے طمع کا قطع کر لینا۔

سالک کا شیخ سے ربط

ایک فصل میں سالک کو اپنے شیخ کے ساتھ کتنا ربط ہونا چاہیے اس کے متعلق آپ نے فرمایا کہ جب سالک کو شیخ کامل مل جائے تو اس کے ظاہری و باطنی احترام میں کوتاہی نہ کرے۔

احترام ظاہری یہ ہے کہ اس سے بحث و مباحثہ یا مناظرہ نہ کرے اور جو کچھ اس سے سنے اگرچہ یقیناً جانتا ہو کہ غلط ہے تاہم اس کے ساتھ حجت نہ کرے کیوں کہ اس کی نظر اس کی نظر سے، اس کا علم اس کے علم سے بڑھا ہوا ہے اور کامل ہے، شیخ کے سامنے جانماز پر نہ بیٹھے مگر بضرورت نماز، اور نماز کے بعد فوراً جانماز اٹھا دے اور زمین پر آ بیٹھے اور نوافل بھی اس کے سامنے نہ پڑھے، جو کچھ شیخ فرمائے اس کی تعمیل کرے اور حتی المقدور اس میں کوتاہی نہ کرے، شیخ کی جانماز پر قدم نہ رکھے۔ شیخ کے سامنے بلکہ دوسروں کے سامنے بھی ایسی حرکت نہ کرے جو اہل معرفت کی خصلتوں کے خلاف ہو، شیخ کے چہرے پر بار بار نظر نہ ڈالے، ان کے ساتھ انبساط اور بے تکلفی کا برتاؤ نہ کرے مگر یہ کہ وہی اجازت دیں اور نہ کوئی ایسا کام کرے جو شیخ کی گرانی طبع کا باعث ہو، ہمیشہ گردن جھکائے رہے۔

احترام باطنی کے سلسلہ میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ شیخ پر کسی

امر میں انکار نہ کرے، ظاہر کی طرح باطن میں قولاً فعلاً اور ہر حرکت وسکون میں ہر لحاظ سے قائم رکھے اگر اپنے اندر کسی طرح کی خلش پائے تو اس کو نکال دے تاکہ بتوفیق الٰہی ظاہر کے موافق ہو جائے۔

نوافل کی پابندی:

سالک کے لیے نوافل کی پابندی کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ اشراق، چاشت صلوٰۃ الاوابین چھ رکعت یا بیس رکعات پڑھے۔ یہ سب نوافل احادیث سے ثابت ہیں، رات کے وقت ۱۲ رکعت جن میں تین وتر ہیں اور اقل مرتبہ میں دو رکعت تہجد علاوہ وتر کے پڑھے، اس کے بعد صبح تک ذکر میں مشغول رہے اور صبح کی نماز پڑھ کر اشراق تک ذکر کرتا رہے، تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضو پر بھی مواظبت رکھے۔

خاتمہ:

سولھویں فصل میں تصوف کے ظاہری اور باطنی ارکان جن کی تعداد دس ہے ان کی وضاحت کی گئی ہے اور پھر آخر کتاب میں آپ نے ولایت کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک ولایت عامہ جو سارے مسلمانوں کو حاصل ہے قرآن پاک میں اللہ ولی المومنین ہے دوسری قسم ولایت خاصہ ہے یہ ان کا حصہ ہے جن کی عبادات وطاعات، کوتاہی وسستی کے بغیر متواتر ودائم ہوں چنانچہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ولی کامل کی تعریف پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو دیکھا جائے تو اللہ یاد آئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ بہتیرے لوگ پراگندہ بال، پرانے کپڑے پہنے ہوں ان کی ظاہری حالت کی وجہ سے کوئی ان کی پرواہ بھی نہیں کرتا مگر ہیں اولیاء اللہ کہ خدائے تعالیٰ پر

قسم کھا بیٹھیں کہ فلاں کام اس طرح ہو گا تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کو سچا بنائے گا وہ کام اسی طرح کر دے۔ آخر میں آپ نے لکھا ہے کہ بندہ کو لازم ہے کہ اپنے نفس کی عبودیت اور اس کی محافظت، مراقبہ و حضور کا پوری حفاظت کے ساتھ لحاظ رکھے اور ایک لحظہ بھی کاہلی اور غفلت نہ کرے۔

کتاب کی خصوصیت:

کتاب میں شیخ طریقت اور سالک کے لیے جو شرائط ان کی جو خصوصیات جو ہدایات تحریر فرمائی ہیں آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے ہر جگہ استنباط کر کے سمجھایا گیا ہے، خلاف معمول اس کتاب میں صوفیاء کے اقوال وحکایات اور ملفوظات اور کشف و کرامات کا ذکر کہیں نہیں ہے، تصوف وسلوک کی حقیقت کو اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ اس راہ کے مجاہدات اور ریاضتیں سب منشاء شریعت اور روح شریعت ہونے کا یقین پیدا ہوتا ہے شریعت و طریقت کے دو لفظوں سے جو ذہن میں خلجان پیدا ہوتا ہے وہ رفع ہو جاتا ہے۔

"امداد السلوک" کی زبان فارسی ہے۔ کتاب طبع زاد بھی نہیں بلکہ رسالہ مکیہ جو عربی زبان میں ہے اس کو سامنے رکھ کر آزاد ترجمہ کیا گیا ہے اور بہت سی تفصیلات حضرت گنگوہی کی جانب سے ہیں اور تمام مراحل کو آسان سے آسان تر لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تصوف وسلوک کے موضوع پر یہ ایک قابل اعتماد کتاب ہی نہیں بلکہ اس کی عظمت واہمیت ذہن نشیں ہوتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عوام و خواص کی بد عقیدگیوں، رسم ورواج کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کی اصلاح اور ان کو دین کے صراط مستقیم پر لگانے کے لیے اس سے زیادہ موثر دوسرا طریقہ نہیں ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت گنگوہی نے تعلیم و تدریس سے اصلاح امت کے ساتھ ساتھ تصوف و سلوک کی راہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی جو اصلاح فرمائی ہے وہ دیرپا بھی ثابت ہوئی اور اس اصلاحی مشن کو آج ہندوستان کا سواد اعظم جاری رکھے ہوئے ہے۔ کتاب کا اردو ترجمہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے ارشاد السلوک کے نام سے کیا ہے جو ۱۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲) سبیل الرشاد:

حضرت گنگوہی کی یہ دوسری کتاب کسی ایک موضوع پر نہیں بلکہ ایک طبقہ کی طرف سے کچھ شکوک و شبہات اور اعتراضات احناف پر کیے گئے تھے اس کتاب میں ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔

حضرت گنگوہی کا عہد اسلامی ہند کی تاریخ کا وہ موڑ ہے جہاں مختلف فرقے پیدا ہوئے اور ان کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ ہندوستان کا بدقسمت مسلمان اپنی حکومت اور آٹھ سالہ اقتدار کھو کر خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا تھا صرف علماء نے دیوبند میں دارالعلوم کھول کر مسلمانوں کو ذہنی پریشانیوں سے بچا کر تعلیم کی راہ پر لگایا تھا اور مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بدعات و خرافات کے خلاف علم جہاد بلند کر رکھا تھا۔ علماء بدایوں و بریلی بدعتوں کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ پنجاب کا مسیلمہ کذاب نیا نبی مرزا غلام احمد قادیانی نبوت کے سنگھاسن پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تیسری طرف شاہ اسحاق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں ایک بہاری عالم میاں نذیر حسین صاحب نے تعلیم مکمل کر کے دہلی کی ایک مسجد میں ایک چھوٹا سا مدرسہ کھول لیا اور ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈال دی، اسلامی دنیا میں ائمہ اربعہ میں سے کسی نہ کسی کے مسلک پر

چلنے والے عوام وخواص تھے میاں نذیر حسین صاحب ان سب سے علیحدہ ایک ایسی جماعت تشکیل کرنے میں شب وروز لگ گئے جو ائمہ اربعہ کی اقتداء کے بجائے ان کی اقتداء کرے اور خود مجتہد بن گئے انہوں نے اعلان کر دیا کہ تقلید گمراہی اور ضلالت ہے اس لیے ہم کسی امام کی اقتدا نہیں کرتے اسی لیے ہندوستان میں وہ غیر مقلد کے نام سے مشہور ہوئے شاہ نذیر حسین صاحب کی درسگاہ سے جتنے لوگ پڑھ کر نکلے وہ میاں صاحب کے پر جوش وکیل اور مشینری بن کر پورے ملک میں پھیل گئے اور اپنے استاذ کے مسلک کی تقلید کی مہم پوری طاقت وقوت سے چلائی حضرت گنگوہی کے زمانہ میں غیر مقلدین کی مہم زوروں پر تھی، جگہ جگہ مباحثے ہوتے ایک دوسرے کے خلاف کتابچے اور چھوٹے چھوٹے رسائل شائع کیے جاتے۔

اسی دور میں انبالہ سے ایک صاحب نے بہت سے سوالات حضرت گنگوہی کی خدمت میں لکھ کر بھیجے تھے سوالات کا زیادہ تر تعلق انہیں مسئلوں سے تھا جو احناف اور غیر مقلدین کے درمیان مابہ النزاع ہیں مثلاً آمین بالجہر، قرأت خلف الامام، رفع یدین اور بعض دوسرے مسائل، سائل کی نیت کیا تھی؟ یہ تو نہیں معلوم مگر یہ ضرور تھا کہ وہ احناف کے دلائل معلوم کرنا چاہتے تھے۔اور یہ الزام جو عام طور سے غیر مقلدین کی جانب سے احناف پر بطور طعن کے دیا جاتا تھا وہ یہ کہ یہ لوگ نص چھوڑ کر قیاس اور رائے پر عمل کرتے ہیں اور اپنی رائے کو اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ترجیح دیتے ہیں اور قول صحابی کو ترک کر کے اپنی رائے پر عمل کرتے ہیں۔ایک تکلیف دہ بات وہ یہ کہتے تھے کہ امام ابو حنیفہؒ کو حدیثیں یاد نہیں تھیں ان کی تمام روایتیں ضعیف ہیں اسی کے ساتھ یہ بھی طنز کرتے تھے کہ امام صاحب کو بلاوجہ تابعی ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے حالانکہ وہ تابعی نہیں ہیں غرضیکہ اسی طرح کے تلخ وترش

بہت سے سوالات تھے جوانہوں نے تحریر کر کے کسی کی معرفت حضرت گنگوہی کو بھیجا تھا۔

"سبیل الرشاد" میں انہیں سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں یہ رسالہ سائز کے ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔اسی زمانہ میں مطبع مجتبائی دہلی سے ١٣١٨ھ میں چھپا تھا۔وہی نسخہ میرے سامنے ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا کتابچہ بطور خط کے آپ نے سائل کو بھجوایا تھااوراس کی نقل موجود تھی جس کو بعد میں طبع کرادیا گیاان کے سوالات تو تفصیلی طور پر مذکور نہیں لیکن جوابات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے سوالات کیارہے ہوں گے۔

آپ نے رسالہ کا آغاز صحابی کی تعریف سے کیاہے پھراس کے بعد تابعی کی تعریف لکھی ہے اسی ضمن میں یہ بھی بتادیا کہ امام ابو حنیفہ تابعی ہیں اور علامہ سیوطی کی ایک کتاب کا حوالہ دیاہےاور دوروایتوں کو نقل کیا ہے ایک روایت۔

قال حمزة السهمی سمعت الدارقطنی یقول لم یلق ابو حنیفة احدا من الصحابة الا أنه رأیٰ انساً ولم یسمع منه حمزہ سہمی کہتے کہ میں نے دارقطنی سے سنا کہ ابو حنیفہ نے صرف حضرت انسؓ کو دیکھا ہے لیکن ان سے سماع حاصل نہیں دوسری روایت حافظ ابن حجر عسقلانی نے نقل کی ہےاس کے الفاظ ہیں۔ **ادرك الامام ابو حنفیة جماعة من الصحابة لانه ولد بالکوفة سنة ثمانین من الھجرة وبھا یومئذٍ من الصحابة عبدالله ابن ابی اوفی لانه مات بعدذلك بالاتفاق وبالبصرة یومئذ انس بن مالك مات سنة تسعین او بعد ھا.**

امام ابو حنیفہؒ نے صحابہ کی ایک جماعت کو پایا کیونکہ آپ ۸۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے اوران دنوں حضرت عبد اللہ ابن ابی اوفی کوفہ میں تھے

ان کا انتقال بعد میں ہوا بصرہ میں حضرت انسؓ بن مالک تھے جن کا انتقال ۹۰ھ میں یا اس کے بعد ہوا۔

ان دونوں روایتوں کے بعد آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ دوسرے بہت سے علماء نے آپ کو تابعی کہا ہے اگرچہ رویت ہی سے سہی، ثابت ہے البتہ تبع تابعی ہونے میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں حدیث نبوی میں جو خیر القرون کہا گیا ہے اس میں تبع تابعین کا دور بھی شامل ہے۔

سائل کے سوالنامے میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ اصحابی کالنجوم والی روایت صحیح ہے یا ضعیف؟ آپ نے فرمایا کہ مشکوٰۃ میں یہ حدیث ہے مگر مصنف نے اس پر کوئی کلام نہیں کیا، روایت رزین کی ہے صحاح ستہ میں یہ روایت نہیں، ابن حجر نے اس کی تضعیف کی ہے لیکن بعض صحیح حدیثیں اس کی شاہد ہیں پس یہ سب طرق جمع ہو کر یہ حدیث حسن لغیرہ ہو گئی۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ شروط امام بخاری و امام مسلم کیا ہیں آپ نے اس کا جواب دیا ہے چوتھی بات یہ پوچھی گئی تھی کہ غیر مقلدین کہتے ہیں کہ بمقابلہ نص اور حدیث کے قیاس کرنا ناجائز ہے کیا کسی صحابی نے بمقابلہ نص قیاس کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو اس کا ثبوت کیا ہے؟

سوال بظاہر بے ضرر سا ہے مگر اس کی تہ میں بدنیتی کارفرما ہے، یہ اعتراض غیر مقلدین کا بنیادی اعتراض ہے اسی لیے حضرت گنگوہی نے ذرا تفصیل سے جواب دیا ہے اور آپ کے لب ولہجہ یہاں ذرا تیز ہے، غیر مقلدین حنفیوں پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ حدیث کو ترک کر کے قیاس ورائے پر عمل کرتے ہیں یہ بہت بڑا الزام ہے اور سراسر جھوٹا ہے آپ نے تحریر فرمایا کہ نص کے مقابلہ میں قیاس قطعاً ناجائز ہے اس میں کسی عالم کا اختلاف نہیں، کس کی جرأت ہے کہ نص کے مقابلہ میں اپنی رائے کو دخل دے مگر یہ فرقہ اس جملہ کے مقصد

ومراد کو سمجھتا ہی نہیں اور دوسروں پر اعتراض کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے آپ نے اس جملہ کا مفہوم بتایا اور کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ باوجود حکم نص کے اس کے مقابلہ و مخالفت میں اپنی رائے سے مخالف نص حکم دیا جائے اور اپنے قیاس فاسد کو حکم شریعت کے مقابلہ میں رکھا جائے یہ کام شیطان لعین کا ہے آپ نے مثال میں حضرت آدم کو سجدہ کرنے کے حکم میں ابلیس لعین کے انکار کا ذکر فرمایا ہے اسی واسطے کسی نے کہا ہے اول من قاس ابلیس یعنی نص کے خلاف سب سے پہلے ابلیس نے قیاس فاسد کیا غیر مقلدین نے اپنی کج فہمی سے مطلق قیاس کو اگرچہ صحیح ہو ابلیس کا فعل قرار دے کر جملہ مجتہدین علماء کو صحابہ کرام سے لے کر آج تک گمراہ ٹھہرا دیا معاذ اللہ، یہ موٹی بات ہے کہ مقابل ضد شے ہوتا ہے نص کے مقابل اسی قیاس کو کہا جائے گا جو کسی نص کے موافق نہ ہو، اگر قیاس ایک نص کے خلاف اور دوسری نص کے مطابق ہو تو اس کو قیاس فاسد نہیں کہا جائے گا ورنہ حدیث و قرآن پر عمل کرنا دشوار ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں آپ نے متعدد مثالیں ذکر فرمائی ہیں جن سے قیاس صحیح اور قیاس فاسد کو ذہن نشین کرایا گیا ہے پھر آپ نے بتایا کہ اگر کسی نص میں دو احتمال ہوں یا حقیقت و مجاز کے سبب یا اشتراک معنی کے سبب سے یا بہ نظر ظاہر الفاظ یا علت نص کے اعتبار سے یہاں مجتہد کسی جانب کو ترجیح دیکر ایک کو اختیار کرتا ہے دوسری جانب کو ترک کر دیتا ہے تو یہ نص کے ایک معنی کی ترجیح دوسرے معنی پر ہے اور یہ نص ہی پر عمل کہا جائے گا اس کو کوئی شخص نص کے مقابلہ میں قیاس کرنا نہیں کہہ سکتا ہے۔ احمق لوگ اس ترجیح کو قیاس بمقابلہ نص کہتے ہیں حالانکہ یہ عین نص پر عمل ہے آپ نے مثال میں ایک روایت پیش کی ہے۔

پہلی نظیر:

بنو قریظہ کے خلاف آپ نے صحابہ کرام کو بھیجا اور ان سے فرمایا لَا یُصَلِّیَنَّ اَحَدٌ الْعَصْرَ اِلَّا فِی بَنِی قُرَیْظَۃَ، صحابہ کرام کا لشکر چلا، ابھی بنو قریظہ نہیں پہنچے تھے کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہو گیا۔ کچھ صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منع فرمانے کی وجہ سے عصر کی نماز اس لیے نہیں پڑھی کہ آپ نے تاکید کے ساتھ بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے عصر پڑھنے سے روک دیا تھا۔ صحابہ کرام میں کچھ لوگوں نے کہا کہ حضور کا مقصد یہ تھا کہ جلد سے جلد بنو قریظہ پہنچ جاؤ یہ مطلب نہیں کہ نماز قضا کرو، اور انہوں نے بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے ہی عصر کی نماز پڑھ لی بنو قریظہ سے واپسی کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ صورت حال معلوم ہوئی تو آپ نے دونوں جماعتوں میں سے کسی جماعت کو کچھ نہ فرمایا یعنی دونوں کی تقریر فرمائی ایک جماعت نے ظاہر نص پر عمل کیا اور نماز نہیں پڑھی دوسری جماعت نے معنی مجازی پر عمل کیا کہ مقصد جلدی پہنچنا ہے اور نماز کا اپنے وقت پر ادا کرنے کا حکم قطعی ہے آپ نے نماز قضا کرنے کا حکم نہیں فرمایا ہے اس لیے انہوں نے دن رہتے ہی نماز پڑھ لی اور علت نص پر عمل کیا، علت نص پر عمل کرنا اور ظاہر نص کو چھوڑنا جو فقہاء کرتے ہیں مشروع ہو گیا اور آپنے اس کی تقریر فرمادی جو قیامت تک معمول رہے گی اب یہ قیاس بمقابلہ نص نہیں بلکہ اجتہاد فی مراد النص ہے اور جائز ہے نص کے باوجود صحابہ کرام کی دونوں جماعتوں نے دو عمل کیے، کسی میں یہ جرأت ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کو غلط کار کہہ سکے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر کے بعد یہ جرأت کرنے والا شاید دائرہ ایمان ہی سے خارج ہو جائے۔

دوسری نظیر

چوں کہ اس دور کے غیر مقلدین کا الزام واعتراض انتہائی تکلیف دہ دل آزار ہوتا تھا اور منشاء شریعت کے مطابق عمل کرنے کے باوجود اسلام کی عظیم ترین شخصیتوں پر ان کے اعتراض کی زد پڑتی تھی اور یہ اعتراض بھی ان کی کج فہمی اور بد نیتی کی وجہ سے تھا، اس لیے آپ نے مزید تفصیل کرتے ہوئے ایک نظیر اور پیش کی: آپ نے تحریر فرمایا کہ روایتوں میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ فلاں پر زنا کی تہمت ہے، اس کو قتل کردو۔ وہ ایک جگہ غسل کر رہا تھا، آپؓ کی نگاہ پڑی تو وہ مقطوع الذکر تھا، یعنی عضو تناسل نہیں تھا۔ حضور کے حکم کے باوجود حضرت علیؓ نے اس کو قتل نہیں کیا۔ حضرت علیؓ نے واپس آکر ماجرا بیان کیا اور خبر دی کہ میں نے اس کو قتل نہیں کیا۔ آپؐ نے اس کی تصویب فرمائی۔

کیا یہ روایت آنکھیں کھولنے کے لیے کافی نہیں کہ قتل کا حکم صاف تھا، نص ظاہر موجود تھی، لیکن علت حکم کے نہ پائے جانے کی وجہ سے اس نص صریح پر عمل نہیں کیا اور عمل نہ کرنے ہی کو حضورؐ نے درست عمل بھی قرار دیا۔ تم یہاں کیا تاویل کروگے؟ نص کے مقابلہ میں قیاس کو جرم اور گناہ قرار دوگے، تو یاد رکھو کہ یہ حضرت علیؓ ہی نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن ہوگا، پھر ایمان کا خدا ہی حافظ ہوگا۔ حضرت گنگوہیؒ نے اس سوال کا سات صفحات میں بڑی تفصیل سے روایات کی روشنی میں جواب دیا ہے اور مسئلہ کو واضح کیا ہے۔

سوالنامہ میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ فقہ کے مسائل میں بہت اختلاف ہے، احادیث میں یہ اختلاف نہیں ہوتا ہے، نہ الفاظ میں، نہ معنی

میں، تو کیوں نہ فقہ کو چھوڑ کر صرف احادیث پر عمل کیا جائے؟

اس کے جواب میں آپؒ نے مختصر بات فرمائی اور کہا کہ معترض نے شاید مشکوٰۃ بھی نہیں پڑھی ہے، ورنہ ایسی بے عقلی کی بات نہ کرتا۔ صحاح ستہ میں اور ان کی روایتوں میں جو اختلاف ہے اس کو چھوڑیے، صرف صحیح بخاری میں متضاد روایتیں آئی ہیں، مجتہدین اور فقہاء انہیں اختلاف والی روایتوں کی وجہ سے مسائل فقہیہ میں اختلاف کرتے ہیں، فقہ کے مسائل میں اختلاف احادیث کی روایتوں میں اختلاف ہی کی وجہ سے ہے، سائل ناسمجھ معلوم ہوتا ہے۔

ایک اعتراض یہ تھا کہ اکثر ائمہ بالخصوص امام ابو حنیفہ نے جتنی حدیثیں لی ہیں وہ اکثر محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں، بخاری ومسلم میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں اور نہ کوئی راوی مجروح ہے۔

حضرت گنگوہیؒ نے اس کا مختصر اور مسکت جواب دیا ہے کہ امام ابو حنیفہ اس وقت پیدا ہوئے جب صحابہ کرام کا زمانہ تھا اور ان کے سن شعور تک پہونچنے کے وقت اگر صحابہ کرام جاچکے تھے، تو تابعین اور تبع تابعین موجود تھے، جو صحابہ کرام کے شاگرد تھے انہیں تابعین و تبع تابعین جیسے ثقہ راویوں سے ان کی روایتیں ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان چند واسطے ہیں، وہ بھی سب ثقہ، امام بخاری اور امام مسلم تو اس زمانہ میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اگر امام صاحب کی روایت ان کے نیچے کے راویوں کی وجہ سے ضعیف ہے، یہ تو ان راویوں کے ضعف کی وجہ سے ہے امام صاحب خود جو روایت کرتے ہیں، اس کے ضعیف ہونے کا سوال ہی نہیں۔

معترض نے غیر مقلدین کی وکالت کرتے ہوئے جو یہ اعتراض کیا ہے کہ تمام ائمہ کی اکثر روایتیں ضعیف ہیں، غیر مقلدین کو کیا معلوم نہیں کہ

امام احمد، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ سب کے سب محدث ہیں اور محدثین کے استاد اور شیخ ہیں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم ان ائمہ کی روایتوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اگر ان ائمہ کی روایتیں ضعیف ہیں، تو پھر بخاری و مسلم کی روایتیں بھی ضعیف ہو جائیں گی، کیوں کہ یہ روایتیں انہیں ائمہ سے ہیں جن کی روایتوں کو تم ضعیف کہنے کی جسارت کرتے ہو، یہ بالکل جہالت اور نادانی اور بے عقلی کا الزام ہے اور نہایت خطرناک طرز فکر کی غمازی کرتا ہے، یہ ذہن، یہ فکر تو پورے دین اسلام کی بنیاد ہی ڈھا دینے والا ہے، معترض یہ نہیں سمجھتا کہ اس کے اعتراض کی زد کہاں کہاں پڑتی ہے۔

ایک اعتراض یا سوال یہ بھی تھا کہ جب ظاہر حدیث واجب العمل ہے، تو کسی مجتہد یا فقیہ کو اس میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟ ظاہر حدیث سے جو بات سمجھ میں آتی ہے بس اس پر عمل ہر عالم اور جاہل کر سکتا ہے، کسی کی تقلید کی ضرورت کیا ہے؟ کیا حضورؐ کے زمانہ سے ایسا ہی چلا آرہا ہے یا یہ خیال بعد کے دور میں پیدا ہوا؟

ظاہر حدیث پر عمل

حضرت گنگوہیؒ نے پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ جواب دیا ہے اور تمام شکوک و شبہات کا ازالہ فرمادیا ہے۔ آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اگر ظاہر حدیث پر عمل واجب ہونے سے یہ مراد ہے کہ جو کچھ حدیث کا لفظی ترجمہ ہے اس پر عمل کرنا ہر جگہ واجب ہے، خواہ آیات قرآنی، احادیث نبوی یا اجماع امت کے موافق ہو یا مخالف، تو یہ عقیدہ اور خیال سراسر غلط اور نادانی ہے، کیونکہ بہت سی احادیث کا ظاہر متروک ہے۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں یا تو ظاہر حدیث جو بات بتاتی ہے وہ بعد میں منسوخ ہو گئی یا ظاہر حدیث کا مفہوم دوسری صحیح ترین

احادیث کے مخالف ہو یا اجماع امت سے وہ معارض ہے، ان مقامات میں ظاہر حدیث پر عمل نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ اس کا ترک کرنا ضروری ہے۔ آپ نے مثال میں ترمذی کی ایک روایت پیش کی ہے جس میں رمضان میں سحری کھانے سے متعلق بات کہی گئی ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں: كُلُوا وَ اشْرَبُوا حَتّٰى يَعْتَرِضَ لَكُمُ الأَحْمَرُ (کھاؤ پیو جب تک صبح سرخ نہ پیش آوے) حدیث کا ظاہر یہ بتاتا ہے کہ جب تک صبح کی سرخی نہ ظاہر ہو جائے، تب تک کھاؤ پیو، حالانکہ سرخی اس وقت آتی ہے، جب صبح صادق ہر طرف پھیل جاتی ہے اور پون گھنٹہ صبح صادق کے گذر جانے کے بعد سرخی نمودار ہوتی ہے اور خوب اسفار ہو جاتا ہے۔ اگر اس وقت تک سحری کھانے کا وقت ہو، جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے، تو کسی کا روزہ ہی نہیں ہوگا۔ کیا ظاہر حدیث پر عمل کے مدعی اس کو تسلیم کریں گے؟ اور کیا کسی مجتہد یا فقیہ عالم سے پوچھے بغیر اس حدیث کے ظاہر پر عمل کریں گے؟ سوائے اس کے کہ اس حدیث کی تاویل کریں یا معنی و مفہوم ایسا متعین کریں، جو صحیح مسئلہ کے مطابق ہو یا اس کو منسوخ مانیں، بغیر اس کے چارہ کار نہیں۔ جب ظاہر حدیث میں تاویل یا نسخ وغیرہ کا وہ سہارا لیتے ہیں، تو اسی کو تفقہ کہتے ہیں اور یہ عوام کے بس کا نہیں، یہ علماء متبحرین کا کام ہے۔ اس صورت میں ظاہر حدیث کے خلاف عمل ہوا اور وہ ظاہر حدیث پر عمل کرنے کو واجب کہتے تھے اور یہاں ترک واجب ہو کر حرام ہوا، کیوں کہ غیر مقلدوں کے نزدیک ترک واجب حرام ہوتا ہے اور وہ خود حرام کے مرتکب ہوئے۔

ظاہر حدیث پر تم خود عمل نہیں کرتے

حضرت گنگوہی نے مذکورہ سوال کے دوسرے پہلو پر گفتگو فرماتے

ہوئے کہا کہ اگر اس سوال سے ان کا مقصد یہ ہے کہ حدیث کے ظاہر لفظ سے ایک مفہوم معلوم ہوتا ہے اور دوسرا بطور علت کے ایک مفہوم نکلتا ہے، تو لفظ کے ظاہری معنی پر عمل ضروری ہوگا اور علت نص سے جو مفہوم نکلتا ہے اس کو ترک کر دیا جائیگا، تو یہ بات بھی غلط ہوگی؛ جیسا کہ بنو قریظہ میں عصر کی نماز پڑھنے کی روایت سے معلوم ہوا کہ ایک جماعت نے ظاہر حدیث پر عمل کیا اور دوسری جماعت نے علت حکم سے جو مفہوم معلوم ہوا اس پر عمل کیا اور آپؐ نے دونوں کی تصویب فرمائی اور کسی کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ تم نے غلط کیا۔ اگر ظاہر حدیث پر عمل واجب تھا، تو جس جماعت نے ترک واجب کیا، وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے اور شارع علیہ السلام کی سرزنش ضروری تھی اور جب سرزنش نہیں ہوئی، تو معلوم ہوا کہ ترک واجب ہوا ہی نہیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ خیال ہی غلط ہے کہ ظاہر حدیث ہی پر عمل ضروری ہے۔

غیر مقلد الحاد کا شکار ہو جاتا ہے

آپ نے مزید تحریر فرمایا کہ یہ سب جہالت اور گمراہی کی باتیں ہیں، اب اس کا احساس خود غیر مقلدوں کے ایک طبقہ کو بھی ہو رہا ہے کہ عوام وخواص کو آزاد کر دینا بد دینی کو دعوت دینا ہے۔ پھر اس کے بعد آپ نے مولانا محمد حسین بٹالوی کی تحریروں کے حوالے دیے ہیں، جن میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ پچیس سال کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ جو لوگ بے علمی کے باوجود مجتہد مطلق بن جاتے ہیں اور مطلق تقلید ترک کر دیتے ہیں، وہ آخر میں اسلام ہی کو ترک کر دیتے ہیں اور ملحد بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آزادی رائے دین وشریعت کے معاملے میں خود رائی، ہٹ دھرمی اور ضد کو جنم دیتی ہے اور خود رائی اور خود پسندی کی انتہا دین

کے حدود سے نکل جانا ہے۔

آپ نے مزید روایتوں کے حوالے سے اس نقطۂ نگاہ کی بھرپور تغلیط فرمائی ہے کہ ہر ظاہر حدیث پر عمل واجب ہے۔ حضرت گنگوہی کے چند نظائر میں سے ایک دو نظیروں کو میں نے یہاں ذکر کیا ہے، پوری بحث اصل کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ پھر آپ نے ان سوالات کے جوابات دیئے ہیں، جو آج تک غیر مقلدین اور احناف کے درمیان نزاعی مسئلے ہیں۔ مثلاً قرأت خلف الامام، آمین بالجہر اور رفع یدین وغیرہ۔ احادیث کے درس میں ہمارے تمام مدارس میں ان مسائل پر جس انداز اور تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جاتی ہے، یہ انداز اور یہ تفصیلات وہی ہیں، جو حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ نے اس حدیث کے دوران پیش کی ہیں۔

قرأت خلف الامام

یہ حضرت گنگوہی کے دور کا ایک سلگتا ہوا مسئلہ تھا، ہر طرف اس کے چرچے تھے، بحث و مباحثے جاری تھے، دارالافتاء سے فتوے جاری ہوتے رہتے تھے، حضرت گنگوہی سے بھی اس کے متعلق سوالات ہوتے رہتے تھے۔ آپ نے غیر مقلدین کے مختلف فیہ مسائل پر مستقل ایک کتاب ہی تصنیف فرمادی اور اپنے فتووں میں مسئلہ کی وضاحت فرمائی۔ سب سے اہم مسئلہ قرأت خلف الامام کا تھا، اس لیے اس مسئلہ پر احادیث کی روشنی میں تفصیلی بحث کی موافق و مخالف تمام روایتوں کو آپ نے پیش کر کے احناف کے نقطۂ نگاہ اور ان کے مسلک کی وجوہ ترجیح بھی پیش کیں۔

عہد رسالت میں بھی یہ مسئلہ تھا

حضرت گنگوہی نے صاف صاف تحریر فرمایا کہ یہ مسئلہ نیا نہیں، بلکہ

عہد رسالت ہی میں پیدا ہو گیا تھا؛ متعدد روایتوں سے اس کا پتہ چلتا ہے، صحابہ کرام دونوں نقطۂ نگاہ کے تھے، کچھ صحابہ کرام امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اور کچھ فقہائے صحابہ اس سے روکتے تھے۔ یہ مسئلہ خود حضورؐ کے سامنے پیش ہوا۔ متعدد روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام آپ کی اقتداء میں جب نماز پڑھتے تھے، تو حضورؐ کی قرأت کے ساتھ یہ بھی قرأت کرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں طرح کے عمل کرنے والوں میں سے کسی کو نہ روکا اور نہ کسی کو حکم دیا۔ اگر قرأت ضروری ہوتی، تو جو لوگ قرأت نہیں کرتے تھے ان کو آپ حکم فرماتے کہ بغیر قرأت فاتحہ کے تمہاری نماز نہیں ہوتی، اس لئے سورۂ فاتحہ پڑھا کرو، ورنہ تمہاری نماز ہی نہیں ہو گی، مگر آپ نے کبھی ایسا حکم نہیں دیا۔ اس سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت فاتحہ ضروری نہیں تھی، کیونکہ نماز سب سے اہم فریضہ ہے، قرأت نہ کرنے سے نماز ہی نہیں ہوتی تھی، ایسے اہم معاملہ میں وحی کا آنا ضروری تھا، کیونکہ ایسے موقعوں پر یقین ہوتا تھا، جیسا کہ حضرت جابر کی روایت ہے کہ کُنَّا نَعْزِلُ عَلیٰ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، کیونکہ اگر یہ حرام ہوتا، تو آپ کو وحی کے ذریعہ بتا دیا جاتا اور آپ اس کی حرمت کا اعلان فرما دیتے۔

نماز جیسی عبادت اگر سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے سے نہ ہوتی، تو کیسے یہ ممکن تھا کہ حضورؐ اس کے متعلق کچھ ارشاد نہ فرماتے۔ اس سے کم از کم اتنا تو ضرور معلوم ہو گیا کہ اس کا پڑھنا ضروری نہیں تھا۔ نفی وجوب کے لیے یہ دلیل کافی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے صحابہ کرام کا لشکر بھیجتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا لا یصلّینّ احد العَصْرَ الا فی بنی قُرَیْظَةَ ایک جماعت نے جب عصر کا وقت ہو گیا، تو بنو قریظہ پہونچنے سے پہلے نماز پڑھ لی اور

دوسرے فریق نے نماز قضا کی کیونکہ بنو قریظہ پہونچ کر دن غروب ہو چکا تھا۔ واپسی کے بعد صحابہ نے حضورؐ سے صورت حال بیان کی، تو آپ نے وقت پر نماز ادا کرنے والوں اور عصر کی نماز قضا کرنے والوں میں سے کسی کو سرزنش نہیں کی۔

اس طرح دونوں کے فعل کی تقریر ہو گئی۔ سورۂ فاتحہ کی امام کے پیچھے قرأت بھی اسی درجہ کی اس دور میں تھی، لہٰذا کسی فریق کا دوسرے فریق پر طعن مناسب نہیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ قرأت خلف الامام کا مسئلہ حضورؐ کی وفات کے بعد نہیں پیدا ہوا، بلکہ حیات فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پیدا ہوا تھا۔ یہ مسئلہ کیوں اور کیسے پیدا ہوا؟ احادیث کی روشنی میں اس کی تفصیل یہاں پیش کی جاتی ہے۔

قرأت خلف الامام کا مسئلہ کیوں اور کیسے پیدا ہوا؟

ابتداء اسلام میں تہجد کی نماز فرض تھی، جیسا کہ قرآن میں ہے يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ، قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلاً الخ یہ آیات ابتداء عہد نبوت میں نازل ہوئی تھیں، جیسا کہ علامہ سیوطی نے اپنی کتاب "الاتقان" میں وضاحت کی ہے کہ سب سے پہلے سورۂ اقرأ کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل ہوئیں، پھر سورۂ "ن" اور تیسری سورہ مزمل کی آیتوں کا نزول ہے۔ امام اور مقتدی سب قرأت کرتے تھے۔ حضرت عائشہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ایک سال بعد مکہ ہی میں سورۂ مزمل کی بعد کی آیتیں نازل ہوئیں جس میں فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ہے۔ اس آیت سے وہ طویل نماز تہجد منسوخ ہو کر "قدر ما تیسر" کی قرأت رہ گئی۔ اس وقت بھی امام اور مقتدی دونوں پر قرأت فرض رہی۔ اس کے بعد معراج میں پانچ وقتوں کی نماز فرض کی گئی اور اس کے بعد تہجد کی فرضیت منسوخ

ہو گئی اور پانچوں وقت کی نمازیں پوشیدہ طور پر کسی مکان میں چھپ کر باجماعت پڑھی جاتی رہیں۔ نماز پنجگانہ میں بھی امام اور مقتدی دونوں قرأت کرتے تھے۔ پھر جب سورۂ اعراف نازل ہوئی اور اس میں یہ آیت وَ إِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهُ وَ اَنْصِتُوا نازل ہوئی تو صرف امام قرأت کرتا تھا اور مقتدی کے لیے قرأت منسوخ ہو گئی۔ اس کی شہادت میں بہت سی مرفوع احادیث، موقوف، صحیح، ضعیف روایتیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ میں یہاں ربط کلام کے لیے صرف تین روایتیں پیش کرتا ہوں: مولانا عبدالحئی فرنگی محلی لکھنوئی نے اپنی کتاب "امام الکلام" میں ان کو نقل کیا ہے۔

(۱) اَخْرَجَ اِبْنُ أَبِیْ حَاتِمٍ وَ اَبُو الشَّیْخِ وَ ابْنُ مِرْدَوَیْهِ وَ الْبَیْهَقِیِّ فِی الْقِرَاءَةِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ اَنَّهُ سُئِلَ أَ كُلُّ مَنْ سَمِعَ الْقُرْاٰنَ وَجَبَ عَلَیْهِ الاِسْتِمَاعُ ؟ قَالَ إِنَّمَا نَزَلَتْ هٰذِهِ الاٰیَةُ فَاسْتَمِعُوا و اَنْصِتُوا فِی قِرَاءَةِ الإِمَامِ إِذَا قَرَأَ الإِمَامُ فَاسْمَعْ لَه وَ اَنْصِتْ . (۱)

ابن ابی حاتم، ابو شیخ اور ابن مردویہ اور بیہقی نے قرأت کے بارے میں تخریج کی ہے کہ عبداللہ بن مغفلؓ سے پوچھا گیا کیا ہر شخص پر واجب ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو سنے ؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ آیت فَاسْتَمِعُوْا لَه وَ اَنْصِتُوْا نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جب امام قرأت کرے، تو مقتدی سنے اور خاموش رہے۔

(۲) أخرج عبد بن حمید و ابن جریر و ابن ابی حاتم و ابو الشیخ و البیهقی عن ابن مسعود أنّه صلّی بأصحابه فسمع ناساً یقرؤن خلفه ، فلمّا انصرف قال أمَا ان لَکُمْ اَنْ تَفْهَمُوْا أمَا

(۱) الدر المنثور سیوطی ج ۳ ص ۱۵۵

انَ لَكُمْ أَنْ تَعقلُوا وَ إِذَا قُرِئَ الْقُرآن فَاستَمِعُوا له وَ أَنصِتُوا كمَا أَمَرَكُمُ اللّه (۱)

(۲) عبد بن حمید، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ اور بیہقی نے تخریج کی کہ عبد اللہ ابن مسعودؓ نے کچھ لوگوں کو نماز پڑھائی، انہوں نے اپنے پیچھے کچھ لوگوں کو قرأت کرتے ہوئے سنا، تو نماز سے فراغت کے بعد کہا کہ تمہیں اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ جب قرآن پڑھا جائے، تو اس کو سنو۔

(۳) أخرج سعید بن منصور و ابن ابی حاتم و البیهقی فی القراء ة عن محمد بن کعب القرظی ، قال : کان رسول الله صلی الله علیه وسلم إذا قرأ فی الصلوٰة ، أجابه من ورائه إذا قال بسم الله الرحمٰن الرحیم قالوا مثل ذلك حتی تنقضی الفاتحة و السورة ، فلبث ماشاء الله أن یلبث ثم نزلت وَ إِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَ أَنْصِتُوا ، فقرأ و أنصتوا (۲)

سعید ابن منصور، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے قرأت کے سلسلہ میں ایک روایت کی تخریج کی ہے، محمد بن کعب القرظی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں قرأت کرتے تھے، تو مقتدی بھی اسی طرح قرأت کرتے تھے، جب آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا، تو مقتدیوں نے کہا یہاں تک کہ سورۂ فاتحہ اور سورۃ سب پڑھتے، جب تک اللہ نے چاہا یہی صورت حال رہی، پھر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی واذا قری القران فاستمعوا له و أنصتوا، اس کے بعد حضور قرأت فرماتے اور مقتدی خاموش رہتے۔

حضرت گنگوہیؒ نے ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا کہ

---

(۱) امام الکلام ص ۱۶

(۲) الدر المنثور، سیوطی، ج ۳ ص ۱۵۶

ان روایتوں سے قطعیت کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ اس آیت کے نزول سے قبل نمازوں میں فاتحہ اور سورہ دونوں پڑھی جاتی تھیں، دونوں کا پڑھنا اسی آیت سے منسوخ ہوا۔ نسخ مطلق رکھا گیا اس لیے فاتحہ کو مستثنیٰ کرنا درست نہیں ہو سکتا، مقتدی نہ سورۂ فاتحہ پڑھ سکتا ہے اور نہ دوسری آیات، یہ حکم عام ہی رہے گا۔

حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ اس آیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نہیں، بلکہ خطبہ جمعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس لیے خطبہ کا سننا واجب ہے، نماز کے لیے یہ حکم نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ سورۂ اعراف جس میں یہ آیت ہے، بہ اتفاق محدثین و مفسرین مکی ہے، یہ آیت بھی مکہ میں نازل ہوئی اس لیے اس کا حکم بھی مکہ میں نافذ ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ جمعہ کب فرض ہوا؟ مکہ میں یا مدینہ میں؟ اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ والی آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اس لیے کچھ لوگوں نے یہ دعوی کیا کہ جمعہ کی نماز مدینہ میں فرض ہوئی۔ اگر ہم اس کو تسلیم کرلیں، تو اس کا کیا آپ جواب دیں گے کہ جب مکہ میں جمعہ فرض ہی نہیں ہوا، نہ اس میں خطبہ ہوا، تو اس آیت کے نزول کا کیا معنیٰ ہوا؟ اس آیت کے نزول کا ابھی موقعہ ہی نہیں آیا، اس لیے ظاہر ہے کہ آیت کا تعلق خطبہ جمعہ سے ہو ہی نہیں سکتا۔

دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ جمعہ مکہ میں فرض ہوا اور یہی صحیح بھی ہے۔ تب سوال یہ پیدا ہوتا کہ کیا مکہ میں کبھی نماز جمعہ پڑھی گئی؟ کبھی جمعہ میں خطبہ دیا گیا؟ کوئی محدث نہیں کہتا کہ مکہ میں جمعہ ہوا اور جب جمعہ نہیں ہوا، تو خطبہ بھی نہیں ہوا، پھر اس آیت میں خطبہ سننے اور خاموش رہنے کا کیوں حکم دیا گیا؟

جمعہ چاہے مکہ میں فرض ہوا یا مدینہ میں، کسی صورت میں خطبۂ جمعہ

سے اس کا تعلق درست نہیں، لازمی طور پر اس کا تعلق نماز ہی سے ہے، چونکہ نمازوں میں مقتدی قرأت کیا کرتے تھے، مقتدی کی قرأت کو منسوخ کرنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی؛ اس میں اختلاف کرنے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

بالفرض والتسلیم اگر ہم مان لیں کہ آیت کا نزول خطبہ جمعہ ہی کے سلسلہ میں ہوا، تو یہ متفقہ اصول ہے کہ آیت میں حکم عموم الفاظ کا ہوتا ہے، خصوصی مورد کا نہیں۔ اگر خطبہ میں خاموشی سے سننے کا حکم ہے، تو نماز میں بدرجہ اولیٰ قرأت قرآن کے وقت خاموشی سے سننے کا حکم رہے گا، کیوں کہ الفاظ عام ہیں۔ خود امام بخاریؒ نے جزء القراۃ میں تصریح کی ہے کہ یہ آیت نماز اور خطبہ دونوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے بھی یہی معنی ہوئے کہ حکم دونوں کو شامل ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ مکہ میں قبل ہجرت مقتدی کی قرأت مطلقاً منسوخ ہو چکی تھی۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس کے بعد حضرت گنگوہی نے علماء عصر کے اس استدلال پر گفتگو کی ہے کہ سورۂ مزمل میں فاقرؤا ما تیسر ہے، یہ عام لوگوں کے لیے ہے، اس لیے قرأت خلف الامام باقی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سورۂ مزمل کا نزول پہلے ہوا اور سورۂ اعراف کا نزول اس کے بہت بعد میں ہوا۔ بعد کی وحی پہلے کے لیے ناسخ ہوتی ہے، اس لیے سورۂ اعراف کی یہ آیت مقتدی کے لیے امام کے پیچھے قرأت کی ناسخ ہو گی، اب سابقہ اجازت باقی نہیں رہی۔

مدینہ میں مقتدی امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے

جب آپ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے اور علی الاعلان

مسجد میں جماعت سے نماز ادا کی جانے لگی، تو تمام مقتدی، امام کی قرأت کے وقت خاموش رہتے اور ساکت وصامت رہتے اور عام طور سے سورۂ اعراف کے اس حکم کو صحابہ جاننے لگے تھے اور کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرأت کا حکم نہیں دیا، اس لیے قرأت کے وقت تمام صحابہ خاموش رہتے اور کوئی سورۂ فاتحہ پڑھتا، نہ اور کوئی سورہ۔ خود متعدد روایتوں سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ عام صحابہ إذا قرئ القران فاستمعوا له و انصتوا پر عمل کرتے تھے اور کچھ نہیں پڑھتے تھے۔ میں مثال کے طور پر یہاں چند روایتیں پیش کرتا ہوں: حضرت عبادہ بن صامت کی روایت جس کو قرأت خلف الامام کے مدعی اپنی دلیل میں پیش کرتے ہیں، اس کے الفاظ ہیں: صلّٰی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم الصُّبح ، فثقلت علیه القرأة ، فلمّا انصرف قال إنی أراكم تقرؤون وراء إمامكم . (١)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی تو آپ کو قرأت کرنا دشوار ہونے لگا، تو نماز سے فراغت کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے امام کے پیچھے قرأت کرتے ہو۔

امام ابو داؤد نے ایک روایت میں لعلكم تقرؤون کا لفظ لکھا ہے ایک دوسری روایت میں هل تقرؤون کا لفظ آیا ہے (٢)۔ شاید تم لوگ قرأت کرتے ہو؟ کیا تم لوگ قرأت کرتے ہو؟ سب استفہامیہ جملے ہیں، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ میں نے تم کو کبھی قرأت کرنے کا حکم تو دیا نہیں، پھر امام کے پیچھے کیوں پڑھتے ہو؟ اگر آپ نے حکم دیا ہوتا، تو اس سوال کی ضرورت ہی نہیں تھی، کیونکہ آپ جانتے رہتے کہ صحابہ کو قرأت کرنے کا حکم میں نے دیا ہے، اس لیے لوگ قرأت کرتے ہوں

---

(١) ابو داؤد ج ١ ص ١١٩ (٢) حوالہ مذکور

گے، لیکن چونکہ آپ نے کبھی ان کو یہ حکم نہیں دیا تھا، اس لیے حیرت سے سوال فرماتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگ کچھ پڑھتے ہو، یعنی میرا کوئی حکم نہیں، اس کے باوجود پڑھتے ہو۔ جب آپ کو قرأت کرنی دشوار ہو گئی، تو سوال کرنا پڑا، تو کسی ایک نے جواب دیا کہ ہاں یارسول اللہ! بقیہ سارے صحابہ خاموش رہے۔ معلوم ہوا کہ اور لوگ نہیں پڑھتے تھے، ایک دو نے قرأت کی اور اقرار کے باوجود یہ نہیں کہا کہ آپ نے ہم کو پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنی صوابدید سے پڑھتے تھے، بقیہ واقف کار صحابہ نہیں پڑھتے تھے۔ بظاہر یہ واقعہ ابتداء ہجرت کا ہے، جب عام صحابہ کو مسائل معلوم نہیں تھے۔ کچھ دن قیام کے بعد جب مسجدیں بننے لگیں اور ہر جگہ نماز باجماعت ہونے لگی، تو یہ مسئلہ عام ہو گیا کہ مقتدی کو امام کے پیچھے خاموش رہنا چاہئے، قرأت نہیں کرنی چاہئے۔

اب ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جب نماز کا یہ طریقہ مقرر ہو چکا تھا، تو بعض صحابہ کیوں آپ کے پیچھے قرأت کرتے تھے؟ اس کا جواب آپ نے دیا کہ عام صحابہ تو قرات نہیں کرتے تھے، کبھی کسی صحابی نے قرأت کی، کیونکہ جن کو حکم معلوم ہو چکا تھا، وہ ابتدا سے انتہا تک اس پر عامل رہے اور کبھی قرأت نہیں کی اور نہ اس کو جائز رکھا۔ کچھ محدثین نے ایسے صحابہ کی تعداد ۸۰ تک شمار کی ہے (۱)، جو امام کے پیچھے قرأت کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور نہ معلوم اور کتنے صحابہ رہے ہوں گے، جن کے بارے میں صحیح علم نہ ہو سکا۔ بس وہ صحابہ جن کو مسئلہ معلوم نہیں تھا، نزول آیت کی خبر نہ تھی اور قرأت کی منسوخی کا ان کو علم نہیں تھا، انہوں نے ہی قرأت کی۔ اس کی دلیل خود ابوداؤد کی ایک روایت ہے، اس میں یہ الفاظ آئے ہیں فقال بعضنا انّا نصنع ذٰلِك (۲)۔ حضورؐ کے دریافت کرنے پر بعض

---

(۱) عمدۃ القاری بدرالدین عینی ج ۶ ص ۱۱ (۲) ابوداؤد ج ۱ ص ۱۱۹

صحابہ نے بتایا کہ حضورؐ ہم نے قرأت کی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تمام صحابہ جو جماعت میں شریک تھے، سب کو مسئلہ معلوم تھا اور کسی نے قرأت نہیں کی، صرف ایک دو صحابہ جن کو مسئلہ معلوم نہیں تھا، بس انہوں نے غلطی سے قرأت کی۔

چونکہ بہت پہلے مقتدی اور امام دونوں قرأت کرتے تھے، اسی عادت کے مطابق انہوں نے قرأت کی، ان کو معلوم نہ ہو سکا کہ پہلا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اگر بعض صحابہ کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ نزول آیت کے بعد بھی قرأت کرتے تھے، تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ انہوں نے اجتہاد کیا کہ من ینازعنی فی القران سے ممانعت کی علت یہی سمجھی اور منازعت سے بچنے کے لیے سکتات میں قرأت کرتے رہے ہوں کہ اس سے منازعت نہیں ہوگی، کیوں کہ بعض روایتوں میں ایک لفظ آتا ہے ھذاًنقرأ جلدی جلدی پڑھتے تھے کہ امام قرأت نہ شروع کر دے، ایسے صحابہ نے ممانعت کی علت پر نظر کر کے ایسا کیا ہو؟

إلاّ بفاتحة الكتاب

البتہ بعض روایتوں میں آتا ہے لاتصلّو الا بفاتحة الکتاب فإنّه لا صلوٰة الا بفاتحة الکتاب ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھی جائے گی۔ جو لوگ قرأت خلف الامام کے قائل ہیں، انہوں نے سمجھ لیا کہ آیت سے جو قرأت کی ممانعت آئی تھی، سورۂ فاتحہ کی قرأت کو واجب سمجھ لیا، یعنی آیت کے عموم کو خاص کر دیا۔ قرینہ یہ ملا کہ آپ نے فرمایا کہ لاصلوٰة الا بفاتحة الکتاب۔ لیکن جو لوگ قرأت نہیں کرتے تھے، لیکن ان کی نماز کو فاسد نہیں کہتے تھے، مگر جو نماز جہری ہو یا سری سکتات میں سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے اور حضورؐ نے بھی ان کو منع نہیں

فرمایا اور نہ اس سلسلہ میں کوئی وحی آئی۔ جو صحابہ نہیں پڑھتے تھے حضورؐ کے اس ارشاد کے بعد اس حکم کو ناسخ اور آیت کا مخصص نہیں مانتے تھے، بلکہ اس کو رخصت پر محمول کرتے تھے کہ امام کے سکتات میں جلدی جلدی پڑھ لیں۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیت میں صریح ممانعت کے باوجود سورۂ فاتحہ کے لیے رخصت کیوں دی گئی؟ سکتات میں سورہ کی بھی رخصت ہوتی رخصت کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس سورہ کو نماز سے زیادہ مناسبت ہے، اسی سورۂ فاتحہ کے متعلق حدیث قدسی میں ہے **قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی نصفین** اس لیے فرمایا کہ اگر سکتات میں پڑھ لو تو رخصت ہے۔ آیات بھی مختصر ہیں، ثناء میں پڑھی جا سکتی ہے اور امام سے قرأت میں منازعت نہیں ہو گی۔ اس لیے یہ جملہ بیان رخصت کے لیے ہے، بیان وجوب کے لیے نہیں، **لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب** رخصت کی علت بتانے کے لیے ہے، بیان وجوب کے لیے نہیں ہے۔ چونکہ یہ سورہ ایسی ہے کہ ہر نمازی کو اس کا پڑھنا ضروری ہے، چاہے منفرد ہو یا امام، اگر سورۂ فاتحہ نہیں پڑھے گا تو نماز ہی نہیں ہو گی، اس اہمیت کی وجہ سے اس کی رخصت ہو گئی۔ سورۂ فاتحہ کو صرف سکتات میں پڑھنے کی اجازت دی ہے، کیوں کہ مقتدی کو قرأت سے روکنے کی علت احادیث سے معلوم ہے **انا اقول مالی ینازعنی فی القران**۔ اگر امام کی قرأت کے ساتھ سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے، تو منازعت ہوتی ہے، جو ممنوع ہے، مگر سکتات میں بھی نہ پڑھنا اولیٰ ہے، کیونکہ نہی سے جو استثناء ہوتا، وہ درجہ اباحت کا ہوتا ہے، اس لیے ہم اس کو مباح اور رخصت کہتے ہیں، اس لیے آیت کا حکم مثل سابق اپنے عموم پر ہے، اس میں کوئی تخصیص نہیں ہوئی، جو لوگ پڑھتے تھے اور جو لوگ نہیں پڑھتے تھے دونوں میں

سے کسی کو رد نہ فرمایا، بلکہ تقریر فرمادی اور نہ اس امر میں پھر وحی آئی، اس لیے دونوں فریق کو مصاب ٹھہرلیا، بالکل اسی طرح جیسے بنو قریظہ میں نماز پڑھنے والے اور نہ پڑھنے والے دونوں فریق میں سے کسی کو کچھ نہیں فرمایا اس طرح دونوں کے عمل کی تصریح ہو گئی اور دونوں کو صحیح مان لیا گیا، اسی طرح قرأت خلف الامام پر عمل کرنے والے اور نہ عمل کرنے والے دونوں کا عمل اللہ کے نزدیک کامل ہے، کسی میں کوئی فساد نہیں اور نہ کراہیت ہے۔

حضرت گنگوہیؒ نے اس آخری قطعی فیصلہ کے بعد اس سلسلہ میں آنے والی تمام روایتوں کی تطبیق فرمائی ہے۔ جن روایتوں سے قرأت فاتحہ کا وجوب معلوم ہوتا ہے، فریق مجوز اس کو عام کہتے ہیں کہ امام اور مقتدی دونوں پڑھیں گے اور مانعین اس کو امام اور منفرد کے لیے خاص مانتے ہیں، امام بھی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھے گا اور منفرد بھی نماز پڑھے گا، تو وہ سورۂ فاتحہ ضرور پڑھے گا، کیونکہ دونوں میں سے کسی کی نماز بغیر سورۂ فاتحہ کے نہیں ہوگی۔ عبادہ بن صامت کی ایک روایت کے الفاظ ہیں **لا صلوٰة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب فصاعداً**(۱) معمر نے امام زہری سے روایت کی ہے۔ اسی طرح سفیان نے بھی امام زہری سے یہ روایت فصاعداً کے ساتھ کی ہے اور محدثین کے نزدیک

یہ اصول تسلیم شدہ ہے کہ ثقہ کی زیادتی حجت ہوتی ہے، اس لیے یہ روایت حجت ہے اور فصاعداً کے لفظ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مقتدی کے لیے نہیں کیونکہ آپ پہلے ہی سورۂ فاتحہ سے زائد پڑھنے سے منع کر چکے ہیں، تو لازمی طور پر یہ حکم مقتدی کے لیے نہیں ہوگا۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں فما زاد کا لفظ ہے، ظاہر ہے کہ یہ مقتدی

---

(۱) ابوداؤد ج ۱ ص ۱۱۹

کے لیے نہیں، کیونکہ فاتحہ سے زیادہ پڑھنا ممنوع ہے۔ اسی طرح ابو سعید کی روایت میں ہے امرنا ان نقرأ بفاتحۃ الکتاب و ما تیسّر (۱)، تو یہ روایت بھی مقتدی کے لیے نہیں ہوگی ۔ ان کے علاوہ جتنی روایات مرفوع یا موقوف میں مقتدی کو فاتحہ پڑھنے کی اجازت ہے ، وہ بطور رخصت ہے، نہ کرے تو بہتر ہے۔ یہ رخصت بھی خواص کے لیے ہے کہ وہ سکتات کی رعایت کے ساتھ فاتحہ پڑھ لیں، تو ان کو اجازت یا رخصت ہے کیونکہ وہ سکتات کی رعایت کر سکتے ہے، عوام کے لیے یہ رخصت بھی نہیں کیونکہ وہ اس کی رعایت نہیں کر سکتے، اس لیے امام سے قرأت میں منازعت ہوگی اور اس سے سختی کے ساتھ روکا گیا ہے۔

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ قرأت خلف الامام کے تارک کی نماز نہ فاسد ہوگی نہ ناقص، جیسا کہ قاری کی نماز میں نہ نقصان ہے اور نہ فساد کیونکہ یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے اور ہر ایک رائے تاویل صحابہ او تقریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے، کسی کو کسی پر طعن کرنے کی گنجائش نہیں۔ اگر مجتہد اور تبعاً علماء کسی ایک جانب کو ترجیح دیں، تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن عوام کو اس مسئلہ میں گفتگو کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ احناف کے دلائل ترجیح اپنی جگہ ہیں، یہاں ان کا ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔

تقلید کا مسئلہ

آخری سوال تھا کہ غیر مقلدین کہتے ہیں کہ ایک امام کی تقلید باطل ہے بلکہ ایک امام کی تقلید کو واجب جاننا شرک ہے، یہ قول ان کا حق ہے یا باطل؟ اس سوال کے جواب میں آپ نے ذرا تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے اور یہ بحث کئی صفحوں تک چلی گئی ہے اور اسی سوال کے جواب میں یہ

(۱) ابوداؤد، ج:۱، ص:۱۱۹

رسالہ مکمل ہو جاتا ہے۔ اس دور میں یہ مسئلہ بہت زور و شور کے ساتھ اٹھایا گیا تھا اور مختلف علاقوں میں قلمی جنگ چھڑی ہوئی تھی، یہاں نذیر حسین بہاری کے تلامذہ اپنے مشن میں بہت پرجوش تھے اور حنفیوں پر جارحانہ اور دل آزار انداز میں بحث کرتے تھے، اس لیے حضرت گنگوہی نے تقلید کی حمایت میں کچھ بنیادی دلائل دیے ہیں۔

حضرت گنگوہیؒ نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ تقلید کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم حرام ہے اور دوسری قسم واجب اور ضروری ہے۔ پہلے آپ نے تقلید کا مفہوم و معنی بتایا ہے کہ تقلید نام ہے کسی بات کو بلا دلیل مان لینا اور اس پر عمل کرنا اور اس کی دو شکلیں ہیں: ایک یہ کہ مقلد نے جس بات کو قبول کیا ہے، اس پر کوئی حجت شرعی بالکل نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے صریح خلاف ہو اور محض ظن و تخمین مقلد کا ہو اور اس کی ذہنی پیداوار ہو، جیسا کہ جاہلی عرب اپنے آباء و اجداد کے طریق کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مقابلہ میں مانتے تھے یہ صریح شرک ہے اور یہ علماء امت کا متفق علیہ مسئلہ ہے، اس میں کسی کو اختلاف نہیں، جہاں جہاں بھی تقلید کو شرک کہا گیا ہے، اس سے یہی تقلید مراد ہے۔

دوسری قسم تقلید کی وہ ہے کہ مسائل شرعیہ سے ناواقف شخص کسی معتبر عالم سے مسئلہ پوچھے اور وہ عالم دلیل نہ بتائے، اگرچہ دلیل اس کے پاس موجود ہے، مگر سائل نے دلیل نہیں پوچھی، اس عالم کے بتائے ہوئے مسئلہ کو تسلیم کر لیا اور عمل کرنے لگا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہم نے ایک معتبر اور مستند عالم سے مسئلہ پوچھا ہے، وہ حکم شریعت کے خلاف ہرگز نہ بتائے گا، اس لیے بلا دلیل اس کو تسلیم کر لینا تقلید ہوئی اور وہ بالاتفاق جائز ہے۔ قرآن نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے فاسئلوا اهل الذکر إن کنتم لا تعلمون اس میں صیغہ امر فاسئلوا استعمال کیا گیا ہے

جو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر ناواقف کو حکم شرعی معلوم کرنا واجب ہے۔ یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ دلیل کے ساتھ مسئلہ معلوم کرو اس لئے سوال کرنا واجب ہوا اور " اہل الذکر " واحد اور جمع دونوں پر بولا جاسکتا ہے؛ تو چاہے فرد واحد سے مسائل معلوم کرے یا پوری جماعت سے۔ اگر فرد واحد ہی سے پوچھا، تو تقلید شخصی ہوئی اور اگر متعدد " اہل ذکر " سے معلوم کیا، تو تقلید غیر شخصی ہوئی۔ اس طرح مطلق تقلید تو ہر مسلمان پر واجب ہوئی اور مطلق کے سب افراد فریضہ میں متساوی ہوتے ہیں جس کسی فرد پر عمل کر لیا دوسرے فرد پر عمل کرنا واجب نہیں رہا۔ پس جب خدا نے مطلق تقلید کو فرض کیا اور عمل کرنے کا دونوں فرد پر اختیار دے دیا، تو بندہ کو اختیار ہے کہ کسی بھی فرد پر عمل کرے، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا شفاء العیّ السؤال خواہ تمام ضروریات دین کا ایک عالم سے سوال ہو یا متعدد علماء سے، جس سے دونوں نوع تقلید مطلق کی معمول اور مفروض ہوئی۔

ان کے علاوہ متعدد آیات واحادیث سے مطلق تقلید کا وجوب معلوم ہوتا ہے اور تقلید کی دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی پابندی کہیں سے نہیں معلوم ہوتی، اس لیے کوئی قسم ممنوع نہیں ہوئی۔ مفروض مطلق کی کوئی قسم بدعت وشرک اور حرام ہو، یہ تو کوئی پاگل ہی کہہ سکتا ہے، کیونکہ شرک فرض کی ضد ہے، اس لیے فرض کے تحت شرک آ ہی نہیں سکتا، اس لیے یہ مسئلہ بے داغ ہے کہ تقلید مطلقاً ہر شخص پر فرض ہے۔

کچھ لوگوں نے تفسیر کے حوالوں سے یہ بات کہی ہے کہ " اہل الذکر " سے مراد اہل کتاب ہیں اور شان نزول کو ثبوت میں پیش کیا، مگر یہ مسئلہ بھی اجماع امت سے ثابت ہے کہ آیات میں اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے، نہ خصوص مورد کا، تو ہم تسلیم بھی کر لیں کہ یہ اہل کتاب ہی

کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے، مگر الفاظ اپنے عموم کی وجہ سے جملہ علماء کو واجب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے عام طور پر اسکو عام ہی تسلیم کیا ہے اور اہل کتاب تک محدود نہیں رکھا ہے۔ تفسیر بیضاوی کے الفاظ ہیں و فی الأیة دلالة علیٰ وجوب المراجعة إلی العلماء فی مالایعلم ۔ اس عبارت کے نقل کرنے کے بعد آپ نے تحریر فرمایا کہ پس ان جہال کا قول قابل قبول نہیں کہ محض جہالت ہے اور جاہل کو عالم سے پوچھنا الیٰ قیام القیامۃ فرض اس سے ہو گیا ہے (ص۲۹)

پھر حضرت گنگوہیؒ نے قرآن کی آیت یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ امنوا أَطِیْعُوا اللّٰہ و اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ أُوْلِی الامْرِ مِنکُمْ سے ثابت کیا ہے کہ علماء کی تقلید واتباع فرض ہے أُوْلِی الأمْر اپنے عموم کی وجہ سے خلفاء، علماء، فقہاء سب کو شامل ہے۔ اس آیت پر گفتگو کے بعد آپ نے جابر بن عبد اللہؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، عطاء، مجاہد اور ضحاک اور ابو العالیہ، حسن بصری، صحابہ، تابعین و تبع تابعین کا حوالہ دیا ہے کہ ان حضرات نے "أُوْلِی الامْرِ" سے علماء، فقہاء ہی کو مراد لیا ہے، مزید تائید میں نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کا نام پیش کیا ہے کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں قاضی شوکانی، ابن کثیر، قاضی بیضاوی اور مدارک وغیرہ تفسیروں کے حوالے سے "أُوْلِی الامْر" سے مراد علماء اور فقہاء ہی کو لیا ہے۔

اس طرح غیر عالم کے لیے علماء کی اتباع ضروری ہو جاتی ہے۔ تقلید واتباع دونوں ہم معنی ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے حضرت گنگوہی نے آیت وَ اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَیْکُمْ مِنْ رَبِّکُمْ وَ لَاتَتَّبِعُوا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِیَاءَ پیش کیا ہے کہ کتاب اللہ منزل من اللہ ہے اور احادیث کی حیثیت بھی منزل من اللہ ہی کی ہے، کیوں کہ کہا گیا ہے۔ ما ینطق عن الھوی إِنْ ھُوَ إِلاَّ وَحْیٌ یُوْحیٰ اسی لیے رسول کی اطاعت کے لیے کہا گیا

مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَ مَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ مجتہدین علیہم الرحمۃ کے استنباطات بھی منزل من اللہ ہی کے زمرے میں آتے ہیں، کیونکہ جو کچھ اشارات و دلالات نصوص سے مستخرج ہے من و عن حکم نص ہوتا ہے اور یہ بھی تسلیم شدہ بات ہے کہ قیاس مظہر حکم ہوتا ہے، مثبت حکم نہیں ہوتا، اس لیے مجتہد نے جو استنباط کیا وہ عین حکم حق تعالیٰ ہوا۔ پس آیت سے سب افراد امت کے لیے کتاب و سنت سے صراحتاً جو حکم معلوم ہوتا ہے، یا استنباط سے معلوم ہوتا ہے، قبول کرنا فرض قرار دیا ہے، اس سے کسی اہل ایمان کو انحراف نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ سارے مسائل ظاہر کتاب و سنت سے معلوم نہیں ہو سکتے۔ ہزارہا جزئیات مسائل ہیں کہ قیامت تک پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔ اگر قیاس واجتہاد کا حکم نہ ہوتا، تو ان کا شرعی حل کیسے ہوتا، نئے واقعات میں شریعت کا حکم کیسے معلوم ہوتا۔ مگر یہ کام عامی آدمی کا نہیں، یہ فقیہ و مجتہد کا کام ہے؛ اسی لیے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَ لَوْ رَدُّوْہُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ، لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ؛ مفسرین نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے:

اُولُوالْاَمْرِ ھم اھل العلم و البصر و العقول الراجحۃ

اس کے بعد حضرت گنگوہی نے غیر مقلدین کے دو مستند عالموں کا بھی حوالہ دیا ہے اور لکھا ہے قال الشوکانی و النوّاب صدیق حسن خان، و فی ھٰذہ الاٰیۃِ إشارۃ إلیٰ جواز القیاس و أن فی العلم ما یدرک بالنصّ و منہ مایدرک بالاستنباط و ھو القیاس علی الکتاب و السنۃ

آپؒ نے مزید فرمایا کہ یہی استنباط و قیاس کی ضرورت و اہمیت تھی کہ امام بخاریؒ کو اپنی صحیح میں ایک ترجمۃ الباب قائم کرنا پڑا باب من شبہ

اصلاً معلوما باصل مبین اسی کو ہم قیاس اور استخراج مسائل کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں کہ تعلیم امت کے واسطے شارع علیہ السلام نے تعلیم دی ہے اور ان مسائل کا قبول کرنا خود تقلید مجتہد ہے۔

اس وضاحت کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ جو تقلید و اتباع فرض ہے اور ہر جگہ صیغۂ امر سے اس کو بیان کیا گیا کہ اس کی فرضیت میں کوئی شک و شبہ نہ رہے، اسی فرض خداوندی کو شرک کہنا خود مشرک بننا ہے۔ خدا جس بات کو فرض کہتا ہے، تم خدا کے مقابلے میں اسکو شرک کہنے کی جرأت کرتے ہو۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ پھر اس کے بعد آپؒ نے مجتہد کے مقام و مرتبہ اور اس کے اجر و ثواب کو قلمبند فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ اگر مجتہد مصیب ہوتا ہے، تو اس کو دہرا اجر ملتا ہے، اگر اتفاقاً خطا ہو گئی، تب بھی ایک اجر کا مستحق ہوتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

فَإِنْ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ وَإِنْ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ وَاحِدٌ

پھر اس کی صحیح بخاری سے کچھ مثالیں دی ہیں، آخر میں حاصل بحث کے طور پر تحریر فرمایا کہ:

"تقلید مطلق جو شخصی اور غیر شخصی دونوں کو شامل ہے، کتاب و سنت سے ثابت ہے اور کہیں کتاب و سنت میں یہ نہیں فرمایا کہ عالم سے سوال کا جواب بلا دلیل قبول نہ کریں۔ اسی پر صحابہ کے دور میں عمل رہا کہ سائل نے سوال کیا اور اس کا جواب حسب حال سائل کے بادلیل یا بلا دلیل دیا گیا اور سائل نے اس پر عمل کیا"

اس سلسلے میں عبد اللہ ابن عباسؓ کا واقعہ بیان کیا کہ مکہ مین جب انہوں نے مسائل بیان کیے تو بہت سے صحابہ سے وہ مسائل مختلف ہوئے، مگر اہل مکہ نے عبد اللہ بن عباسؓ کے فتاویٰ پر عمل کیا، دوسرے

صحابہ کے بعض مسائل کو ترک کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ عبد اللہ بن عباسؓ کی اہل مکہ نے تقلید شخصی کی۔ یہ تاریخ کا سچا واقعہ ہے کہ سارے مکہ والوں نے عبد اللہؓ بن عباسؓ کو اعلم وافقہ سمجھ کر صرف ان کے فتاویٰ پر عمل شروع کیا اور دوسرے اقوال کو انہوں نے چھوڑ دیا؛ یہ تقلید شخصی نہیں، تو اور کیا ہے؟

تقلید کبھی نہیں رہی

عام طور پر غیر مقلدین کہتے ہیں کہ تقلید عہد رسالت و عہد صحابہ میں نہیں تھی، مگر یہ اعتراض ان کی کم علمی اور نادانی ہے، ان کو معلوم نہیں کہ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بیان کرنے سے کتنا بچتے تھے اور بدرجہ مجبوری ہی حضورؐ کی احادیث بیان کرتے۔ احادیث اور روایات کے ذخیرے میں اس طرح کے مشہور صحابہ کے بارے میں بیانات ہیں، ابن ماجہ میں ایک روایت عمرو بن میمون کی ہے، ان کا بیان ہے کہ میں ہر جمعرات کی شام کو عبد اللہ بن مسعود کی خدمت میں لازمی طور پر حاضر ہوتا تھا، مگر کبھی کبھی میں نے یہ نہیں سنا کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی حتی الامکان روایت حدیث سے بچتے تھے، لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ وہ فقیہ بھی تھے، اس لیے ہر دم مسائل پوچھنے والے ان کی خدمت میں آیا کرتے تھے اور وہ مسئلہ بتایا کرتے تھے۔ اسی طرح زید بن ارقم کی روایت میں ہے کہ ہم لوگ حضورؐ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات کہنے میں سخت احتیاط کرتے تھے۔ عامر شعبی کی روایت ہے کہ میں عبد اللہ بن عمرؓ کی صحبت میں برسوں بیٹھا، مگر میں نے کبھی نہیں سنا کہ انہوں نے کہا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا۔

ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام روایت حدیث میں

انتہائی احتیاط برتتے تھے، مگر تابعین مسائل انہیں سے پوچھتے تھے اور مسئلہ بتانا بھی فرض تھا جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے من سئل عن علم علمه ثم كتمه الجم يوم القيامة بلجام من نار۔ اس وعید کے بعد کون صحابی مسئلہ بتانے سے انکار کر سکتا ہے، اس لیے مسائل تو سب صحابہ بتاتے تھے، مگر دلیل یا حدیث نہیں بیان کرتے تھے اور تمام لوگ بغیر دلیل کے مسئلہ معلوم کرتے اور اس پر عمل کرتے تھے ۔ تابعین کی پوری جماعت اس طرح صحابہ کی تقلید کرتی تھی، اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟

ایک تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بہت سے صحابہ کرام مختلف شہروں اور گاؤں میں آباد ہو گئے۔ جس شہر یا آبادی میں صحابہ کرام رہے، ان کی ذات مرجع خلائق بن گئی، دین و شریعت کے سارے مسائل اس آبادی یا اس شہر کے تمام لوگ انہیں سے پوچھتے تھے اور اسی پر عمل کرتے تھے، کسی دوسرے سے ان کو پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ یہ حضرات حضورؐ کے صحبت یافتہ تھے۔ اس آبادی یا اس شہر کے تمام لوگ اسی صحابی کے بتائے ہوئے مسئلوں پر عمل کرتے تھے اور اسی صحابی کی تقلید کرتے تھے۔ کیا کوئی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ مسئلہ پوچھنے والے صحابہ کرام سے دلائل بھی پوچھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا، وہ بلا دلیل مسئلہ پوچھتے، اس پر عمل کرتے، اس طرح اس صحابی کی تقلید شخصی کرتے تھے۔ یہ تو ہر شہر اور ہر دور میں رہا ہے، اس لیے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خیر القرون میں تقلید شخصی نہیں تھی اور ہر شخص اپنی مرضی اور رائے پر عمل کرتا تھا، یہ تو بہت بڑا اتہام ہے۔ کتاب کی آخری سطروں میں آپ نے غیر مبہم لفظوں میں لکھا کہ:

''امام ابو حنیفہؒ تابعی ہیں علی التحقیق۔ ان کی ولادت ۸۰ھ میں ہوئی اور انتقال ۱۵۰ھ میں ہوا۔ اس اثناء میں ان کے استنباطات اور ہزار ہا آدمیوں کا اقتدا ان کے مسائل کا، ہر خاص و عام کو معلوم ہے امام مالکؒ ۹۰ھ میں پیدا ہوئے، ۱۷۹ھ میں انتقال فرمایا۔ اس درمیان ان کے اجتہاد کا چرچا رہا اور ہزار ہا لوگوں نے ان کی تقلید کی۔ امام شافعیؒ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۴ھ میں انتقال کیا، اس کے درمیان ہزار ہا لوگوں نے ان کی تقلید کی۔ امام احمدؒ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کی تقلید ہزار ہا لوگوں نے کی۔ سوائے اس کے سفیان ثوری ابن ابی لیلیٰ اور اوزاعی وغیرہ بھی مجتہد ہوئے اور ہزار ہا آدمی ان کے بھی مقلد ہوئے، مگر بالآخر سب مذاہب مندرس ہو کر یہ چار مذاہب عالم میں شائع ہوئے اور آج تک جاری ہیں اور کروڑوں علماء و فقہاء و محدثین ان کی تقلید کرتے تھے، پس ہر کور بصیرت پر روشن ہو جاتا ہے کہ خیر القرون میں تقلید شخصی اور غیر شخصی دونوں بلانکیر جاری رہی، صحابہ، تابعین و تبع تابعین کے طبقات میں کسی نے تقلید شخصی کو حرام اور شرک یا مکروہ یا بدعت نہیں کہا اور کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس امر کو کتاب و سنت فرض و واجب فرمادے، اس کو کوئی اہل حق رد کر دے، یہ کام بدون بددین جاہل کے کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ (۱)

کتاب سبیل الرشاد کتاب کے بجائے ایک مختصر سا رسالہ ہے، جس کے کل ۴۰ صفحات ہیں، لیکن ان مخصوص مسائل کے سلسلہ میں معلومات، دلائل و براہین اور حقیقت یہ ہے کہ علم کا بیش قیمت خزانہ اس چھوٹے سے رسالے میں بھر دیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان مباحث کو سہل زبان میں تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع کر کے مدارس اسلامیہ کے دورۂ حدیث کے طلبہ کو مطالعہ کے لیے لازم کر دیا جائے۔

---

(۱) سبیل الرشاد حضرت گنگوہیؒ ص ۳۷-۳۸

(۳) الرای النجیح

یہ رسالہ در حقیقت ایک مستفتی کے جواب میں لکھا گیا، جو حضرت گنگوہی کے مجموعہ فتاویٰ میں شامل ہے، پھر اس کو ایک رسالہ کی شکل میں شائع کر دیا گیا اور "الرای النجیح" کے نام سے کئی بار شائع ہوا۔

رکعات تراویح کی بحث حضرت گنگوہی کے عہد کا ایک سلگتا ہوا مسئلہ ہے۔ شاہ نذیر حسین صاحب اور ان کے نئے فرقہ کے لوگ جس طرح ان کے تین چار جزوی مسئلے ہیں، انہیں کی طرح تراویح کی رکعتوں کا بھی مسئلہ ہے۔ وہ لوگ بیس رکعات تراویح کو بدعت کہتے تھے، چوں کہ یہ نیا فرقہ بے لگام اور ہمیشہ جارحانہ اور دل آزار انداز بیان اختیار کرتا ہے، اس لیے اس کے لب و لہجہ اور انداز گفتگو سے دلوں کو سخت ٹھیس پہونچتی تھی۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ خلافت فاروقی کے عہد سے بیس رکعات تراویح عالم اسلام میں جاری ہوئی، اس لیے اس کو بدعت کہدیا اور یہ نہیں سمجھا کہ اس بدعت کی ایجاد کو جس ذات گرامی کی طرف منسوب کرنے کی وہ جرأت کر رہے ہیں، وہ عشرۂ مبشرہ بالجنۃ میں داخل ہیں اور ان کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: لو کان بعدی نبیٌ لکان عمر مگر ان لوگوں کی زبان کو کون لگام دے کہ ان کی جرأت و جسارت کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ وہ صحابہ کرام کو بھی نہیں بخشتے، جن کے ذریعہ ان کو ایمان کی توفیق ملی، ان کے ذریعہ ساری دنیا میں اسلام پھیلا، ان کے ذریعہ ہم کو قرآن ملا، شریعت کے احکام معلوم ہوئے، انہیں مقدس صحابہ کرام کی ایک جلیل القدر شخصیت کو بدعت کا موجد قرار دینا، گویا ان کا ایمان صحابہ کے ایمان سے بھی بڑھا ہوا ہے۔

غیر مقلدین تراویح کی آٹھ رکعتوں کے قائل ہیں، احناف بیس

رکعات پڑھتے ہیں اور عالم اسلام میں یہی بیس رکعات عام طور پر پڑھی جاتی ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ کے سامنے جب یہ سوال بصورت استفتاء آیا، تو آپ نے فضا کو مد نظر رکھ کر تفصیلی جواب دیا۔ آپ کی پوری بحث محدثانہ انداز پر ہے، موافق و مخالف ساری روایتوں کو جمع کر دیا ہے اور پھر محدثانہ اصول پر ان میں جمع و تطبیق سے کام لیا ہے، لیکن کبھی کوئی تلخ جملہ نہیں آنے دیا ہے، نہ کسی پر طنز ہے، بلکہ خالص علمی انداز پر سمجھانے کی کوشش نظر آتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دورۂ حدیث کے طلبہ کو صحاح ستہ کی کوئی کتاب پڑھا رہے ہیں۔ یہ مختصر سا رسالہ اہل علم کے لیے بصیرت افروز ہے کہ متضاد روایتوں میں تطبیق کے کیا کیا طریقے ہیں، متضاد بیانات کو کس طرح جمع کیا جاتا ہے، کسی قول کو اختیار اور کسی کو ترک کرنے کے لیے کن باتوں اور اصولوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے، ان دونوں طرح کی روایتوں سے مسئلہ کا استنباط کس طرح ہوتا ہے، تاکہ ایک روایت کو اختیار کرنے اور دوسری روایت کو چھوڑنے کا الزام نہ عائد ہو سکے۔

پھر اسی سلسلے میں آپ نے بتایا ہے کہ بدعت کسکو کہتے ہیں، کیا حضرت عمرؓ کے اس فعل کو بدعت کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ بہت سی باتیں عہدِ رسالت میں عوام کو واضح طور پر نہیں معلوم تھیں اور خلفاء راشدین نے ان باتوں کو اپنے اپنے عہد میں جاری کیا، تو کیا ان کو بدعت کہنا جائز ہو سکتا ہے؟ علیکم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين کا کیا مفہوم ہے؟ اسی بحث کے ضمن میں ان مسائل پر آپؒ نے مفصل روشنی ڈالی ہے، آپ نے صرف احناف کے وکیل ہونے کی حیثیت سے گفتگو نہیں کی ہے، بلکہ ایک غیر جانبدار محدث کے منصب پر بیٹھ کر پوری علمی ذمہ داری سے بحث کی ہے، درجنوں روایتوں کا ذکر، ان پر علمی بحثیں فرمائی ہیں، اس لیے سب کو سمیٹنا میرے لیے مشکل ہے، اجمالی

طور پر اس رسالہ کے نتیجہ بحث کو میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔

تراویح اور تہجد دو نمازیں ہیں

آغاز گفتگو میں آپ نے بتایا ہے کہ تراویح اور تہجد دو نمازیں ہیں اور متعدد روایتوں سے اس دعوے کو ثابت کیا ہے، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دنوں تک جو نماز تراویح پڑھی ہے، روایتوں سے اس کی تفصیل دی ہے، آپ نے روایت کَتَبَ اللّٰہُ عَلَیکُمْ صِیَامَہُ وَ سَنَنْتُ لکم قِیَامَہُ سے ثابت کیا ہے کہ روزے کی فرضیت تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی اور تراویح کی نماز اللہ کے حکم سے آپؐ نے تطوعاً مقرر فرمایا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تراویح مستقل ایک نماز ہے، تہجد نہیں، کیونکہ تہجد کا حکم پہلے ہی سے تھا، تہجد کا حکم تو خود قرآن سے معلوم ہوا؛ البتہ تراویح کی نماز احادیث رسولؐ سے معلوم ہوئی۔ تہجد آپ نے ہمیشہ آخر شب میں ادا فرمائی اور تنہا ادا فرمائی بخلاف اس کے تراویح اول شب میں ادا فرمائی اور جماعت سے ادا فرمائی اور تہجد میں بالقصد جماعت نہیں قائم فرمائی، اتفاقاً لوگ آکر مل گئے، یہ الگ بات ہے۔ نوافل میں تداعی نہیں ہے اور نماز تراویح میں تداعی ہے۔ معلوم ہوا کہ تراویح کی نماز ایسی نفل ہے، جس کا حکم ہر نفل سے علیحدہ ہے، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ تراویح تہجد کے علاوہ ایک مستقل نماز ہے۔ البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ ہمیشہ تراویح ادا فرمائی ہے اور نہ پورے رمضان میں ادا فرمائی ہے، بلکہ روایتوں میں آتا ہے کہ آپ نے تین دنوں تک نماز تراویح پڑھی، پھر اس کے بعد آپ نے ترک فرمادیا۔ آپ نے مشکوۃ سے اس روایت کو یہاں نقل کیا ہے، جس سے تین دنوں تک تراویح پڑھنے کا پتہ چلتا ہے اور بقیہ ایام میں تراویح نہیں پڑھی گئی۔ یہ روایت حضرت ابوذر

رضی اللہ عنہ کی ہے، جس کو ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے لیا ہے۔ اس میں تینوں دنوں کی رکعتوں کا ذکر نہیں۔ ایک روایت جابر بن عبد اللہؓ کی ہے، جس میں آٹھ رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھنے کا ذکر ہے، ہو سکتا ہے کہ ابوذرؓ کی روایت میں عدد کا ذکر اس لیے نہیں ہے کہ عدد غیر معین تھا۔

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں ایک روایت ذکر کی ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیس رکعات تراویح پڑھنے کا ذکر ہے، مگر یہ روایت ضعیف ہے، مگر اس کی تائید آثار صحابہ سے ہوتی ہے کہ انہوں نے بیس رکعت تراویح پڑھی ہے اور ظاہر ہے کہ صحابہ حضورؐ کے عمل پر اضافہ نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے حضورؐ سے اس کی اجازت سمجھی ہو گی، اس لیے بیس رکعات پڑھی۔ علامہ عینی نے اپنی شرح بخاری عمدۃ القاری میں لکھا ہے:

قلت روی عبد الرزاق فی المصنف عن داؤد بن قیس وغیرہ عن محمد بن یوسف عن السائب انّ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جمع الناس فی رمضان علی اُبی بن کعب و علی تمیم الداری علی احدیٰ و عشرین رکعة ، یقومون بالمئین و ینصرفون فی بزوغ الفجر (۱) قلت قال ابن عبد البر و ھو محمول علی أنّ الواحدة للوتر وقال ابن عبد البر و روی الحارث بن عبد الرحمن ابن ابی ذیاب عن السائب بن یزید قال کان القیام علی عھد عمرؓ بثلاث و عشرین رکعة (۲) قال بن عبد البر ھذا محمول علیٰ أنّ الثلاث للوتر و قال شیخنا و ماحمله علیه فی الحدیثین صحیح بدلیل ماروی محمد بن نصر من روایة یزید بن خصیفة عن السائب بن یزید انھم کانوا

يقومون فی رمضان بعشرین رکعة فی زمان عمر بن الخطاب و اما اثر علیؓ فذکره وکیع عن حسن بن صالح عن عمر و بن قیس عن ابی الحسناء عن علیؓ أنه امر رجلاً یصلی بهم رمضان عشرین رکعة و أما غیرهما من الصحابة فرُوِیَ ذلك عن عبد الله بن مسعود رواه محمد بن نصر المروزی قال اخبرنا یحییٰ بن یحییٰ اخبرنا حفص بن غیاث عن الاعمش عن زید بن وهب قال کان عبد الله بن مسعود یصلی لنا فی شهر رمضان فینصرف و علیه لیل قال الاعمش کان یصلی عشرین رکعة و یوتر بثلاث .

وأما القائلون به من التابعین شتیر بن شکل و ابن ابی ملیکة و الحارث الهمدانی و عطاء بن ابی رباح و أبو البحتری و سعید بن ابی الحسن البصری اخو الحمق و عبد الرحمن بن ابی بکر و عمران العبدی و قال ابن عبد البر و هو قول جمهور العلماء فیه قال الکوفیون و الشافعی و اکثر الفقهاء و هو الصحیح عن ابی بن کعب من غیر خلاف من الصحابة و قال الترمذی فی سننه و اختلف اهل العلم فی قیام رمضان فرأیٰ بعضهم أن یصلی احدی و اربعین رکعة مع الوتر و هو قول اهل المدینة و العمل علی هذا عند هم بالمدینة و أکثر أهل العلم علیٰ ما روی علیؓ و عمر و غیرهما من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم عشرین رکعة و هو قول سفیان الثوری و ابن المبارك و الشافعی ، و قال الشافعی هکذا ادرکت ببلدنا بمکة یصلون عشرین رکعة . قال احمد روی فی ذٰلك الوان لم یقض فیه بشیٔ و قال اسحاق بل نختار احدیٰ و اربعین رکعة علی ما

روی عن ابی بن کعب .

عبد الرزاق نے مصنف میں ، داؤد ابن قیس وغیرہ نے محمد بن یوسف سے انہوں نے سائب سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابی بن کعب اور تمیم داری کی اقتدا میں لوگوں کو جمع کیا دو سو آیتوں والی سورتوں کے ساتھ اور لوگوں نے ۲۱ رکعتیں پڑھیں اور صبح صادق کے طلوع ہونے سے ذرا پہلے وہ فارغ ہوئے۔ علامہ عینی کہتے ہیں کہ ابن عبد البر نے کہا کہ ایک رکعت وتر کی تھی۔

سائب بن یزید کی روایت ہے کہ حضرت عمر کے زمانہ میں تراویح ۲۳ رکعات پڑھتے تھے، ابن عبد البر نے کہا کہ تین رکعات وتر تھی۔

ہمارے شیخ نے کہا کہ دونوں حدیثوں میں وتر کی وضاحت کی دلیل وہی سائب بن یزید کی روایت ہے، ان کا بیان ہے کہ لوگ رمضان میں بیس رکعات حضرت عمر کے زمانہ میں پڑھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس سے زائد کی رکعتیں وتر کی تھیں۔ اسی طرح حضرت علیؓ کا ایک اثر ہے انہوں نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ لوگوں کو تراویح کی ۲۰ رکعتیں پڑھائیں۔ اسی طرح عبد اللہ بن مسعودؓ کا بھی ایک اثر ہے، جس کے راوی زید بن وہب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعودؓ جب تراویح کی نماز سے فارغ ہوتے، تورات کا ایک حصہ گذر جاتا تھا۔ اعمش نے وضاحت کی کہ عبد اللہ ابن مسعود ۲۰ رکعات تراویح اور تین رکعات وتر کی پڑھتے تھے۔

بیس رکعات تراویح کے قائل بہت سے تابعین ہیں۔ جیسے شتیر بن شکل، ابن ابی ملیکہ، حارث ہمدانی، عطاء بن ابی رباح، ابو البختری، سعید ابن ابو الحسن بصری، عبد الرحمٰن بن ابی بکر اور عمران العبدی۔

ابن عبد البر کہتے کہ جمہور علماء اسی کے قائل ہیں، اہل کوفہ اس کے قائل ہیں اور امام شافعیؒ بھی اور اکثر فقہاء۔ یہی صحیح ہے۔ ابی بن کعب

کی روایت یہی ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ امام ترمذی نے اپنی سنن میں کہا ہے کہ اہل علم رمضان کی تراویح کی رکعتوں میں مختلف ہیں کچھ لوگ مع وتر کے ۴۱ رکعتوں کے قائل ہیں اہل مدینہ کا یہی قول اور یہی عمل بھی ہے اور اکثر اہل علم اس روایت پر عمل کرتے ہیں، جو حضرت علیؓ و حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ سے ہے کہ تراویح بیس رکعت ہے۔ سفیان ثوری کی بھی یہی رائے ہے اور یہی رائے عبد اللہ بن مبارک اور امام شافعیؒ کی ہے۔ امام شافعیؒ تو اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے وطن شہر مکہ میں لوگوں کو تراویح بیس رکعات پڑھتے ہوئے پایا ہے۔ امام احمد کہتے ہیں کہ اس بارے میں روایتیں مختلف ہیں، کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، اسحاق کہتے ہیں کہ ہمیں ۴۱ رکعات پسند ہے، جو ابی ابن کعب کی روایت ہے۔

ان تمام تفصیلات کے پیش کرنے کے بعد حضرت گنگوہیؒ کے لیے یہی ایک راستہ ہے کہ ان روایتوں میں کسی کو راجح اور کسی کو مرجوح قرار دیں، وہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں۔ چنانچہ آپ نے یہی کیا، ترجیح کے ساتھ ترجیح کی وجہ بھی بیان فرمادی۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ ہمارے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم ان صحابہ کرام کی روایت اور عمل کو ترجیح دیں اور اختیار کریں، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب ترین صحابہ تھے، جن کے فضائل و مناقب خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے امت کو معلوم ہیں اور آپ نے ہم کو ان کی اتباع کا حکم بھی فرمایا ہے۔ مثلاً عبد اللہ بن مسعودؓ کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے اِمسِکُوا بعَھدِ ابنِ مَسعُودٍ یعنی عبد اللہ بن مسعود کی وصیت پر عمل کرو۔ انہیں عَبد اللہ بن مسعود کے بارے میں احادیث میں موجود ہے کان اقرب النّاس ھدیاً و دلاً و سمتاً

برسول الله صلی الله علیه وسلم (۱) یعنی عبد اللہ بن مسعودؓ لوگوں میں سیرت واخلاق اور طور طریق میں حضورؐ سے قریب تر تھے، یعنی مشابہ تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے صحابی کا عمل تراویح میں بیس رکعات کا ہے اور وہ اس کی پابندی کرتے تھے، یقیناً حضورؐ کا عمل انہوں نے دیکھا ہوگا۔

خلفاء راشدین میں حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ بھی بیس رکعت ہی کے قائل تھے اور لوگوں کو بیس رکعت پڑھنے اور پڑھانے کا حکم دیتے تھے، یہ صحیح ترین روایتوں سے ثابت ہے۔ خلفاء راشدین میں شیخین کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے اقتدوا باللذین من بعدی ابی بکر و عمر، میرے بعد تم لوگ ابو بکر اور عمر کی اقتداء کرنا۔ عام خلفاء راشدین کے بارے میں آپؐ کا ارشاد ہے علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین میری سنت پر عمل لازم کرلو اور خلفاء راشدین جو ہدایت یافتہ ہیں، ان کے طریقہ کو اپنے اوپر لازم کرلو۔ ان تمام حضرات نے جب بیس رکعت تراویح کا حکم دیا، تو اس سے انکار حضورؐ کے ارشاد کا ایک گونہ انکار ہوا اور ان کی سنت کے ترک کے گناہ گار ہوتے ہیں۔ مذکورہ صحابہ کرام ہی نہیں، بلکہ جمیع صحابہ نے ان حضرات کے امر پر عمل کر کے حجت تمام کردی اور بیس رکعت پر صحابہ کا اجماع ہوگیا۔ اسکے باوجود اگر ہم اس کو ترک کر کے اپنی الگ راہ بناتے ہیں، تو احادیث رسولؐ کی صریح خلاف ورزی اور خود رائی ہے۔

وجوہ ترجیح

حضرت گنگوہیؒ نے بیس رکعت کی روایت کو قبول کرنے کے لیے ترجیح کی چار وجہیں بیان کی ہیں، پہلی وجہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

(۱) مشکوۃ جامع المناقب ص ۵۷۴

تراویح پڑھنے کا حکم دیا، مگر رکعتوں کی تعداد نہیں بتائی، اس لیے سب اعداد مطلقاً مسنون ہو گئے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فعل رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے احیاناً اس کا استحباب ثابت ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ صحابہ کی اقتداء کی ہمیں تاکید کی گئی، ان کے عمل سے بیس کا عدد ثابت ہے، تو صحابہ کا فرمانا اور عمل کرنا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور عمل کرنا ہو گیا۔ چوتھی بات یہ کہ سوائے ان صحابہ کے جن کا روایتوں میں نام ہے صدہا صحابہ تھے، ان میں سے کسی نے بیس رکعت سے انکار نہیں کیا اور سب نے اس کو بہ طیب خاطر قبول کر لیا، ان وجوہ سے بیس رکعت پر عمل سب سے انسب صحیح اور درست ہے۔

روایتوں میں تضاد نہیں

معترضین کے اعتراضات کو ذہن میں رکھتے ہوئے حضرت گنگوہیؒ نے اس بحث کو بھی اٹھایا ہے کہ روایتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں کہیں گیارہ کا حکم ہے، کہیں ۲۱ کا اور کہیں ۲۳ کا حکم ملتا ہے۔ آپ نے بتایا کہ اس میں نہ تعارض ہے اور نہ ضعف، کیونکہ اس میں اختلاف زمان ہے، مختلف وقتوں میں تینوں حکم صادر ہوئے، ہو سکتا ہے پہلے آٹھ رکعت تراویح اور تین رکعت وتر کا حکم دیا ہو، پھر ۱۸ رکعت تراویح اور تین رکعت وتر کا حکم دیا۔ تیسری دفعہ بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر کا حکم دیا ہو، یہ تینوں حکم تین وقتوں میں ہیں، اس لیے تینوں عدد سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سنۃ خلفاء راشدین سے کیا مراد ہے؟

ایک سوال اور رہ جاتا ہے کہ سنت الخلفاء سے کیا مراد ہے؟ کیا

حضورؐ کے قول و فعل کے علاوہ صحابہ کا کوئی قول و فعل معلوم ہو، تو اس کو بھی اسی میں شامل مانیں گے؟ حضرت گنگوہیؒ نے اس مسئلہ کو بھی صاف کر دیا ہے اور دلائل کی روشنی میں واضح کیا ہے، آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ سنت الخلفاء سے حدیث میں وہ امر مراد ہے کہ اس کی اصل کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں موجود ہو مگر اس کا شیوع نہیں ہوا، پھر کسی خلیفہ نے اس کا شیوع کیا، اس لیے سنت خلفاء در حقیقت سنت رسولؐ ہی ہے، لیکن عام لوگوں کو اس کا علم پہلے نہیں تھا اس لیے مجازاً اس کو خلفاء کی سنت کہا گیا۔ یہ تعریف اس لیے ہے کہ جو امر خلاف سنت رسول ہو گا وہ امر بدعت ہو گا۔ صحابہ کرام اسی سنت خلفاء کا التزام کرتے تھے، جس کی اصل سنت رسول میں موجود ہو اور جب تک عام صحابہ کو سنت خلفاء کی اصل معلوم نہیں ہوتی تھی وہ اس کو قبول نہیں کرتے تھے، چنانچہ زید بن ثابتؓ کا واقعہ صحیح روایتوں میں آتا ہے کہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت کو بلا کر جمع قرآن کا حکم دیا تو انہوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ جس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، میں اس کو کیسے کر سکتا ہوں زید بن ثابت کہتے تھے کہ اگر یہ حضرات مجھے پہاڑ اٹھانے کو کہتے، تو میں اس کو سہل سمجھتا، مگر جمع قرآن میرے لیے اس سے زیادہ مشکل تھا، کیونکہ جس کام کو حضورؐ نہ کریں، تو اس کو بدعت ہی کہا جائیگا، اسی لیے انہوں نے انکار کر دیا۔ معلوم ہوا کہ عام صحابہ کسی بھی ایسے کام کو قبول کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہ تھے جس کی اصل سنت رسول میں موجود نہ ہو اور اگر صحابہ کرام کسی امر پر متفق ہو گئے، تو سمجھ لیجئے کہ ہر ایک نے اس کی اصل سنت رسول میں سمجھ لی ہے۔

بیس رکعت نماز تراویح پر اجماع کی یہی صورت حال ہے۔ حضرت

زید کا واقعہ انکار پھر قبول کرنا سب بخاری میں موجود ہے اور جب اجماع ثابت ہو گیا، تو اجماع کا حجت ہونا سب کو تسلیم ہے، کیونکہ حضور کا ارشاد ہے لاتجتمع اُمّتی علی الضلالۃ۔ ان واضح دلیلوں کے بعد بھی کوئی بیس رکعت تراویح کو بدعت کہنے کی کیسے جسارت کرتا ہے؟ یہ انتہائی حیرت کی بات ہے۔

(۴) اوثق العریٰ

جمعہ فی القریٰ کی بحث بھی غیر مقلدین بلکہ خاص طور سے میاں نذیر حسین صاحب کی اٹھائی ہوئی ہے۔ ان کا ایک فتویٰ شائع ہوا تھا، جس میں انہوں نے ثابت کیا تھا کہ جمعہ ہر شخص پر فرض ہے، جہاں چند مسلمان ہوں اور جماعت قائم کی جا سکتی ہو، وہاں جمعہ پڑھنا فرض ہے، جماعت کی اقل تعداد دو ہے، یعنی اگر دو آدمی بھی ہوں تو وہاں جمعہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت سی روایتوں سے استدلال کیا تھا، اس فتویٰ پر ان کے دستخط اور مہر کے ساتھ ان کے مدرسہ کے دو مدرسین کے بھی دستخط تھے، یہی فتویٰ اور اس کے ساتھ ایک اور استفتاء حضرت گنگوہی کی خدمت میں بھیجا گیا تھا، اس لیے آپ نے استفتاء کے جواب کے ساتھ شاہ نذیر حسین صاحب کے فتویٰ کا بھی علمی جائزہ لیا ہے اور ان کے دلائل پر بھی مفصل بحث کی ہے، یہ جواب عام فتووں سے دراز ہو گیا اور اوسط سائز کے تقریباً ۱۴ صفحات میں آیا ہے اس فتویٰ کو بعد میں "اُوثق العریٰ فی تحقیق الجمعۃ فی القریٰ" کے نام سے اسی زمانہ میں شائع کیا گیا تھا، پھر بعد میں بھی یہ فتویٰ شائع ہوتا رہا۔ اس رسالہ میں ابتداءً میاں نذیر حسین صاحب اور دوسرے لوگوں کے فتاویٰ بھی دیے گئے ہیں، اس کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے جو مفصل بحث کی ہے، اس کو رکھا گیا ہے۔

جمعہ کب فرض ہوا؟

جمعہ فی القریٰ کا مسئلہ فقہاء کے درمیان قدیم زمانہ سے موضوع بحث رہا ہے احناف چھوٹی آبادیوں میں جمعہ کے قائل نہیں ہیں، ان کے نزدیک مصر ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ بحث اٹھتی ہے کہ جمعہ کب فرض ہوا؟ مکہ میں یا مدینہ میں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سورۂ جمعہ مدینہ میں نازل ہوئی إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ، اس لیے جمعہ مدینہ میں فرض ہوا، جبکہ دوسری صحیح ترین حدیثوں سے ثابت ہے کہ جمعہ قبل ہجرت مکہ مکرمہ میں فرض ہو چکا تھا، مگر مشرکین کے غلبہ کی وجہ سے وہاں جمعہ قائم نہیں کیا جا سکا اور جب مدینہ میں مسلمانوں کی معتد بہ جماعت ہو گئی تو آپ نے حکم دیا کہ مدینہ میں جمعہ قائم کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے قباء میں تشریف لائے، تو آپ نے یہاں ۱۴ دن قیام فرمایا۔ اس دوران دو جمعے آئے، کیونکہ آپ سوموار کو قبا پہونچے ہیں اور سوموار ہی کو وہاں سے مدینہ کے لیے روانہ ہوئے، اس لیے دو جمعہ درمیان میں آئے، لیکن آپ نے قبا میں جمعہ نہیں ادا فرمایا اور جب آپ مدینہ تشریف لائے، تو آپ نے یہاں جمعہ کی نماز پڑھی، مدینہ کے اطراف و جوانب میں جہاں تھوڑی تعداد میں مسلمان تھے جیسے عوالی مدینہ و قباء وغیرہ وہاں جمعہ قائم نہیں ہوا اور نہ آپؐ نے ان کو جمعہ قائم کرنے کا حکم دیا اور نہ جمعہ نہ پڑھنے پر باز پرس فرمائی۔ اگر ان پر جمعہ فرض ہوتا، تو بحیثیت پیغمبر کے ترک فرض پر ان کو سرزنش فرماتے، لیکن کسی روایت میں یہ ذکر نہیں کہ عوالی مدینہ اور قبا میں رہنے والوں کو جمعہ ترک کرنے پر آپ نے تنبیہ فرمائی، اس لیے معلوم ہوا کہ شہر میں

جمعہ ہوگا، چھوٹی آبادی میں نہیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں جمعہ قائم کیے جانے کے بعد سب سے پہلا جمعہ مدینہ کے باہر بحرین کے ایک مقام جُواثیٰ میں قائم ہوا۔ ابو داؤد نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد جواثی کی تفسیر میں لکھا ہے: قال جواثیٰ قریة من قریٰ البحرین (۱) اس سے انہوں نے سمجھ لیا کہ جواثی قریہ تھا اور حضور کے عہد مبارک میں یہ جمعہ قائم ہوا، اس لیے معلوم ہوا کہ قریہ میں جمعہ جائز ہے، لیکن حقیقت کیا تھی؟

جواثی قریہ تھا یا کوئی مرکزی مقام اور کوئی بڑی جگہ تھی؟ علامہ عینی نے شرح بخاری میں لکھا ہے کہ حکیٰ ابن القیس عن الشیخ أبی الحسن أنها مدینة ، و فی الصحاح للجوهری جواثیٰ حصنٌ من البحرین و قال ابو عبد البکری هی مدینة بالبحرین لعبد القیس قال امر إلقیس ؎

ورحنا کانا من جواثیٰ عشیة☆تعالی النعاج بین عدل و محقب

علامہ عینی نے جواثی کے شہر ہونے پر یہ تین شہادتیں پیش کی ہیں۔ شیخ ابوالحسن کا بیان ہے کہ جواثی ایک شہر ہے، جوہری نے کہا کہ وہ بحرین میں ایک قلعہ ہے، ابو عبد بکری نے بھی اس کے شہر ہونے کو بتایا ہے۔ مشہور شاعر امرالقیس نے اپنے قصیدہ میں مذکورہ بالا شعر لکھا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم لوگوں کے پاس زر و مال و متاع تھا کہ ہم لوگ جواثی کے بیوپاریوں اور تاجروں میں سے معلوم ہوتے تھے۔ تاجروں کی کثرت اس آبادی کے بڑے ہونے کی علامت ہے۔ ان شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ جواثی کوئی چھوٹی سی آبادی نہیں تھی۔ بالفرض ہم یہ بھی مان لیں کہ وہ قریہ تھی، لیکن اتنی شہادتوں کی موجودگی میں یہ خیال ضرور آئے گا کہ

---

(۱) ابو داؤد ج ۱ ص ۱۵۳ کتاب الصلوٰۃ باب الجمعۃ فی القریٰ

پچھ لوگ اس کو شہر کہتے ہیں إذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال جب جواثی کا قریہ ہونا محقق نہیں ہوا، تو اس سے قریہ میں جمعہ ہونے کا استدلال کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ اس سے بھی نیچے اتر کر ہم تسلیم کر لیں کہ وہ قریہ تھا، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جواثی میں جمعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم یا اجازت سے قائم ہوا تھا یا کم از کم وہاں جمعہ قائم ہونے کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی، تو آپ نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا یا یہ خبر سن کر سکوت فرمایا؟ ان میں سے کوئی بات بھی ثابت ہو جاتی، تو جواثی میں جمعہ قائم کرنے کا جواز نکل آتا۔

حضرت گنگوہی نے تحدی کے طور پر فرمایا کہ اگر کسی کے پاس ثبوت ہو تو صحیح روایتوں کے حوالے سے پیش کرے، ہم اس کو تسلیم کریں گے۔ ظاہر ہے کہ کسی حدیث میں اس کا ذکر نہیں، اس لیے جواثی میں جمعہ قائم کرنے سے قریہ میں جمعہ قائم کرنے کا جواز ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

دلائل کا تجزیہ

میاں نذیر حسین صاحب کے فتویٰ میں فتح الباری کے حوالے سے آثار صحابہ میں سے کچھ نقل کیے گئے ہیں، جن میں خاص طور پر حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ وغیرہ کے آثار ہیں۔ حضرت عمرؓ کے اثر کے بارے میں لکھا ہے کہ:

أنّ عمر كتب إلى أهل البحرين أن جمعوا حيث ما كنتم قال هذا يشمل القرية و المدن

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل بحرین کو لکھا تھا کہ جہاں بھی ہو، وہاں جمعہ قائم کرو، یہ قریہ اور شہر کو شامل ہے۔

حضرت گنگوہیؒ نے اس طرح کے آثار کے بارے میں فرمایا کہ لفظ

حیثما کنتم اس سے عموم امکنہ مراد لیتے ہیں کہ مدینہ اور قریٰ دونوں کو شامل ہے، تو ہمارا سوال ہے کہ اگر عموم امکنہ مراد ہے، تو یہ صحرا اور سمندر کو بھی شامل ہو گا، حالانکہ کوئی وہاں جمعہ قائم کرنے کا قائل نہیں، اگر صحاریٰ و بحار کا استثناء کریں گے، تو ہم بھی قریٰ صغیرہ کو مستثنیٰ کریں گے، کیوں کہ ہمارے پاس نص مرفوع موجود ہے اس لیے حیثما کنتم سے قریہ میں جواز جمعہ کی دلیل قابل التفات نہیں۔

یہی حال تمام آثار صحابہ کا ہے، کسی سے استدلال کرنا فریق مخالف کے لیے درست نہیں کیوں کہ مرفوع کے مقابلہ میں موقوف روایتوں سے استدلال درست نہیں ہوتا اور ان کی تاویل کرنی پڑتی ہے اور ان کو مرفوع بنانا پڑتا ہے

عوالی مدینہ اور قبا میں جمعہ کیوں نہیں قائم کیا گیا؟

حضرت گنگوہیؒ نے اس پہلو پر بھی بہت زور دیا ہے کہ اگر قریہ اور چھوٹی آبادیوں میں جمعہ جائز ہوتا، تو عوالی مدینہ میں جمعہ کیوں نہیں قائم ہوا؟ جبکہ دس سال حضور کو مدینہ میں قیام کئے ہوئے ہو گئے۔ ترک جمعہ پر سخت سے سخت وعیدیں فرمائیں، تارکین جمعہ کے سلسلہ میں سخت سے سخت الفاظ آپ نے استعمال فرمائے، عوالی مدینہ کے مسلمان بھی یہ الفاظ سنتے، مگر پھر بھی انہوں نے جمعہ اپنی آبادی میں نہیں قائم کیا، صرف اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ تنبیہ اور سرزنش اور وعیدیں انہیں کے لیے ہیں، جن پر جمعہ فرض ہے، ہم پر جمعہ واجب نہیں، اس لیے کہ ان وعیدوں کا تعلق ہم سے نہیں اور حضور کی دس سالہ زندگی میں ان لوگوں نے جمعہ نہیں قائم کیا، بلکہ ان کا جو معمول تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس کا ذکر آیا ہے، وہ فرماتی ہیں:

عن عائشةؓ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت کان الناس یتناولون الجمعة من منازلھم و العوالی (۱)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مسلمان عوالی مدینہ اور اپنی آبادیوں سے باری باری کر کے جمعہ پڑھنے آتے تھے، یعنی کچھ لوگ تو اپنے گھروں پر رہ جاتے تھے اور کچھ لوگ مدینہ آکر جمعہ پڑھتے تھے، دوسرے جمعہ کو گھر پر رہ جانے والے مدینہ جاکر جمعہ پڑھتے اور باقی لوگ گھر پر رہ جاتے تھے۔ یہ طرز عمل بھی بتاتا ہے کہ جمعہ ان پر فرض نہیں تھا، کیوں کہ جو لوگ عوالی مدینہ رہ جاتے تھے، وہ ظہر پڑھتے تھے۔ اگر جمعہ فرض ہوتا، تو تمام مسلمانوں کو مدینہ آکر جمعہ کی روانگی ضروری تھی یا خود ان آبادیوں میں جمعہ قائم ہوتا، کیونکہ ترک جمعہ سے آدمی فاسق ہو جاتا ہے۔ عوالی مدینہ کے مسلمان تمام کے تمام جمعہ نہیں ادا کرتے تھے، تو اب مسئلہ کے لحاظ سے آپ ان لوگوں کو کیا کہیں گے؟ ہمارا ایمان تو صحابہ کرام کے بارے میں انتہائی حساس ہے، ہم ان کو کامل ترین مسلمان ہر حال میں جانتے ہیں، آپ حکم لگانے میں بہت جری ہیں، کہہ دیجئے کہ تارک جمعہ تھے، نعوذ باللہ نعوذ باللہ وہ فاسق تھے۔

حافظ ابن حجر جو اس مسلک کے پر جوش حمایتی ہیں، مگر انہوں نے صاف لفظوں میں اس موقعہ پر لکھا ہے **لانّہ لو کان واجباً علیٰ اھل العوالی مایتناوبون و لکانو یحضرون جمیعا** (۲) یعنی اگر اہل عوالی پر جمعہ واجب ہوتا، وہ باری باری نہ آتے، بلکہ تمام لوگ جمعہ میں شرکت کرتے۔

حضرت علیؓ کا ایک اثر

اس فتویٰ کے آخر میں حضرت گنگوہیؒ نے حضرت علی کے اس اثر پر

(۱) بخاری ج ۱ ص ۱۲۳ کتاب الجمعہ باب من این توتی الجمعہ

(۲) فتح الباری ج ۲ ص ۳۸۶ مطبوعہ مملکت سعودیہ عربیہ

گفتگو کی ہے، جس کو احناف اپنی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا اثر ہے **لا جمعة و لا تشریق و لا فطر و لا اضحیٰ الاّ في مصر جامع** . اس اثر پر معترضین کو یہ اعتراض ہے کہ یہ حضرت علی کا قول ہے اور اس کے خلاف حدیث مرفوع موجود ہے، یعنی حضورؐ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے لیے مصر کا ہونا شرط نہیں اور احناف کا قاعدہ ہے کہ قول صحابی کے خلاف اگر حدیث مرفوع ہوتی ہے، تو وہ قول حجت نہیں ہوتا، اس لیے حضرت علیؓ کا اثر اس مسئلہ میں اس لیے حجت نہیں ہو سکتا کہ وہ حدیث مرفوع کے خلاف ہے۔

حضرت گنگوہیؒ نے خالص علمی انداز میں معترضین کا جواب دیا ہے کہ وہ حضرت علی کے قول کو مخالف حدیث مرفوع قرار دے کر حنفیوں ہی کے قاعدے سے کالعدم قرار دینا چاہتے ہیں، حالانکہ معترض نے حنفیوں کے قاعدہ کو سمجھا ہی نہیں اور اتنا بڑا دعویٰ کر دیا اور فتح القدیر کا حوالہ دے دیا۔

احناف کے نزدیک وہ قول صحابی جس میں قیاس کو دخل ہو، وہ حدیث مرفوع کے مقابلہ میں معتبر نہیں ہوتا اور جس حدیث موقوف میں قیاس کو دخل نہ ہو، بلکہ حدیث مرفوع سے اس کی تائید ہوتی ہو، تو وہ حدیث موقوف حدیث مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ کا یہ اثر اسی قسم ثانی سے ہے، کیونکہ شرائط عبادات رائے اور قیاس سے ثابت نہیں ہوتیں، بلکہ اس کے لیے نص صریح ضروری ہے، اس لیے حضرت علیؓ کا صحت جمعہ کے لیے مصر کی شرط لگانا بغیر شارع علیہ السلام کی نص صریح کے نہیں ہو سکتا۔ بقول معترضین کے **یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا إِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ** الخ عام ہے اور احادیث سے بھی عام ہونا معلوم ہوتا ہے اور حضرت علیؓ اس کو جانتے

ہوں اور پھر نصوص قطعیہ کو وہ اپنی رائے سے مخصوص بنادیں، تخصیص نسخ ہوتی ہے، تو نصوص میں معاذ اللہ حضرت علیؓ سے کیسے ہو سکتا ہے کہ آیات قرآنی اور احادیث رسول کو اپنی رائے سے نسخ کردیں، یہ تو معمولی آدمی بھی نہیں کرسکتا چہ جائیکہ حضرت علیؓ جیسا ذہین فرد۔ یقیناً یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ حضرت علیؓ کو علم تھا کہ ان نصوص میں تخصیص ہے، اس لیے انہوں نے تخصیص فرمائی۔ ایک اور بات بھی ذہن میں رکھیے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تیسرے دن حضرت علیؓ ہجرت کر کے مکہ سے قبا پہونچے ہیں، جمعہ کی فرضیت کا مکہ میں ہونا ان کو معلوم تھا، قبا میں جاکر دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں جمعہ نہیں ادا فرمایا۔ اس سے ان کو علم ہو گیا کہ قریہ میں نماز جمعہ نہیں ہوتی۔ حضورؐ کا عمل ان کی نگاہوں کے سامنے تھا، پھر پورے دس سال مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے، اس عرصہ میں کسی قریہ اور گاؤں میں جمعہ نہیں ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہونے کے باوجود کہ فلاں قریہ میں جمعہ نہیں ہوتا، آپؐ نے کبھی ان کو اقامت جمعہ کا حکم نہیں دیا اور عدم اقامت جمعہ پر کسی قریہ والوں کو آپ نے سرزنش بھی نہیں فرمائی اور نہ استحباباً فرمایا، یہ فعل رسول نص قطعی تھا۔ ان تمام مشاہدات کے پیش نظر آپؓ نے جمعہ کے لیے مصر کی شرط لگائی۔ اب یہ موقوف، موقوف نہیں رہا، بلکہ مرفوع کے حکم میں ہو گیا، یعنی حضرت علیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی ترجمانی کرتے ہوئے حضورؐ ہی کی منشاء کے مطابق حکم لگایا کہ قریہ میں جمعہ نہیں، مصر میں جمعہ ہوگا۔ سند کے لحاظ سے اگر یہ اثر ضعیف ہو کر مرفوع کے درجہ میں نہیں ہوا، تو یہ ضعف حدیث مرفوع کی وجہ سے دور ہو گیا اور یہ اثر حسن کے درجہ میں آ گیا۔ پس ایسی حدیث جو حکماً مرفوع ہو، اس کو ضعیف کہنا، جس کی تائید دوسری صحاح حدیث سے

بھی ہوتی ہو، اصول سے ناواقفیت کی دلیل ہے، اسی لیے احناف کے نزدیک حضرت علیؓ کا یہ اثر قابل قبول ہے اور اسی پر ان کا فتویٰ ہے۔

(۵) تصفیۃ القلوب

یہ کتاب کچھ کم وبیش ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے، یہ حضرت گنگوہیؒ کی طبع زاد تصنیف نہیں بلکہ یہ ان کے شیخ و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف "ضیاء القلوب" جو فارسی زبان میں ہے کی اردو زبان میں ترجمانی ہے۔

چونکہ حضرت حاجی صاحبؒ نے اس کتاب کے آخر میں حضرت گنگوہی پر اپنے کامل اعتماد کا اظہار فرمایا تھا اور اپنے متوسلین و منتسبین کو ہدایت دی ہے کہ موصوف کو میری جگہ سمجھیں اور ان سے تعلیم و تربیت حاصل کریں، خدا نے ان کو علم سے نوازا ہے اور ان کا مقام و مرتبہ علوم شریعت میں بہت بلند ہے، اس لیے میں اپنے متوسلین کو ہدایت دیتا ہوں کہ ان کی ذات سے استفادہ کریں۔ اس اظہار اعتماد کی بنا پر حضرت گنگوہیؒ نے ضروری سمجھا کہ "ضیاء القلوب" جو فصیح و بلیغ فارسی میں ہے، اس کو اردو میں منتقل کر کے اس کی افادیت کو عام کر دیں، پس اسی خیال سے آپ نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا اور "تصفیۃ القلوب" نام رکھا۔ کتاب کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ سلوک کے بہت سے طریق ہیں تین طرق کو خاص طور سے اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے پہلے طریق کو "طریق اخیار" اور دوسرے طریق کو "اصحاب مجاہدات و ریاضات" اور تیسرے طریق کو "اصحاب شطاریہ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ طریق شطاریہ کی دس خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ کتاب کے باب اول اور فصل دوم میں بیعت کے طریقے کو سمجھایا گیا ہے، اس کے آداب کو بتایا اور سمجھایا گیا ہے اور

مندرجہ ذیل عنوانات سے طریق ذکر کو بتایا گیا ہے۔

باب اول، فصل اول

ذکر نفی واثبات | ذکر اثبات مجرد
طریق ذکر اسم ذات | طریق ذکر پاس انفاس
طریق ذکر چہار ضربی | طریق اسم ذات قلندری
طریق ذکر جاروب | طریق ذکر حدادی
طرق ذکر ارّہ

فصل دوم دربیان اشغال ذکر

طریق ذکر برائے دفع خطرات فاسدہ | طریق حبس نفی واثبات
طریق شغل سہ پایہ دورہ چشتیہ | طریق شغل سلطاناً نصیراً
طریق شغل سلطاناً محموداً | طریق شغل سلطان الاولیاء
طریق شغل سلطان الافکار | طریق شغل سرمدی
طریق شغل بساط

فصل سوم دربیان مراقبات وغیرہ

طریق مراقبہ (۱) | طریق مراقبہ (۲)
مراقبہ رویت | مراقبہ قربیت
مراقبہ وحدت وہمہ اوست | دگر مراقبات (۹ مراقبات کا ذکر)

باب دوم اذکار واشغال عالیہ قادریہ جیلانیہ

طریق حبس نفی واثبات | طریق پاس انفاس
طریق اسم ذات باضربات

فصل دوم اشغال قادریہ

شغل اسم ذات خفیہ | شغل برزخ اکبر
شغل اسم ذات (دیگر) | طریق شغل دوریہ قادریہ

چلہ"۔ آخر میں کلمات پندو نصیحت ہیں اور اسی پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

یہ فہرست مضامین حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانویؒ کی ضیاء القلوب کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے، اسی کتاب کا ترجمہ تصفیۃ القلوب ہے، جو اس وقت میرے سامنے نہیں ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے کتاب کا من وعن ترجمہ فرمادیا ہے یا اس میں کچھ حذف و اضافہ فرمایا ہے، اس کے متعلق سر دست کوئی رائے دینے سے معذور ہوں، اگر تصفیۃ القلوب دستیاب ہو گئی، تو اس پہلو سے بھی کتاب کا مطالعہ کیا جائے گا انشاء اللہ تعالی.

(۶) ہدایۃ الشیعہ

حضرت گنگوہیؒ کے زمانہ میں ایک شیعی عالم ہادی علی لکھنوئی تھے، انہوں نے ایک سوالنامہ جاری کیا تھا کہ اگر علماء اہلسنت مرے ان سوالوں کا تشفی بخش جواب دے دینگے، تو میں اہلسنت والجماعت کا مسلک اختیار کر لوں گا۔ شیعہ ان دنوں بڑی سرگرمی سے اپنی اشاعت میں لگے ہوئے تھے اور نئے نئے ہتھکنڈے استعمال کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند سے بھی ایک لکھنوی شیعی عالم سے میرٹھ میں سامنا ہو گیا تھا، جس کا ذکر تفصیل سے میں اپنی کتاب "مولانا محمد قاسم نانوتویؒ حیات اور کارنامے" میں لکھ چکا ہوں۔

یہاں حضرت گنگوہی سے شیعی عالم سے بالمشافہہ گفتگو نہیں ہوئی، لیکن اس سوالنامہ نے آپ کو مجبور کیا کہ آپؒ ان کی ہفوات کا جواب دے کر اس کو خاموشی پر مجبور کر دیں۔

پوری کتاب کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ سوالنامہ میں وہی سوالات ہیں، جو عام طور پر شیعوں کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں ان میں حضرت علیؓ کا خلیفہ بلا فصل ہونا، اماموں کو درجہ نبوت تک پہونچانا،

حضرت فاطمہؓ کی میراث فدک وغیرہ کا مسئلہ شامل ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے اپنے رسالہ میں ان اعتراضات کو نقل نہیں کیا ہے، بلکہ نمبر شمار دیکر ان کے جوابات تحریر فرمائے ہیں جوابات کے مطالعہ سے سوالات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

پہلے سوال کا جواب

ہادی علی شیعی کا پہلا سوال عام صحابہ کرام کا ایمان ثابت کرنے کے سلسلہ میں تھا، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صرف چار پانچ افراد مسلمان رہ گئے تھے، بقیہ سب مرتد ہو گئے نعوذ باللہ من هٰذه الخرافات۔ اس کے جواب میں حضرت گنگوہیؒ کے قلم میں تندی اور تیزی ہے، آپ نے قرآن کی اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ الخ سے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب جمعؔ پر الف لام آتا ہے، تو استغراق کے لیے آتا ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ سب مہاجرین وانصار کو خدا نے اپنی رضامندی اور جنت کی بشارت دی ہے۔ خدا دلوں کا حال جانتا ہے، جب وہ ان تمام کے ایمان کامل کی شہادت دیتا ہے، تو تم کو منافق کہنے کی کیسے جرأت ہو گئی؟ اس آیت کے بعد صحابہ کرام کو منافق اور مرتد کہنا قرآن کی اور خدا کی تکذیب کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ تم خود سوچو کہ تم مؤمن رہے یا نہیں؟ تم کہتے ہو کہ خدا کو "بدا" (۱) ہو گیا ہے، یہ تو صراحتاً خدا کو جھوٹا کہنا ہے اور خدا کے بارے میں ایسا عقیدہ کفر ہے، قرآن میں صاف صاف کہا گیا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ شیعہ اس آیت کے بارے

---

(۱) "بدا" شیعوں کا عقیدہ ہے، خدا کوئی فیصلہ کرتا ہے، لیکن کبھی کبھی اس کو بدل دیتا ہے، یہ ان کا مشہور عقیدہ ہے۔ یہاں بھی نعوذ باللہ خدا کو بدا ہو گیا (اسیر ادروی)

میں کہتے ہیں کہ الحاقی ہے، جمع کرنے والوں نے اپنی طرف سے یہ اضافہ کر دیا ہے۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ خدا نے قرآن کی حفاظت کا خود وعدہ فرمایا ہے اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ کہ قیامت تک اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ جب خدا اس کی حفاظت کی خود ذمہ داری لیتا ہے، تو اس میں کمی بیشی کا امکان ہی کہاں رہا۔

شیعہ کہتے ہیں کہ محافظت کا تعلق محفوظ سے ہے، خدا نے قرآن جو لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے، اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، ہمارے ہاتھوں میں جو قرآن ہے اس کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں لی ہے۔

اس کے جواب میں حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ شیعوں کے اس جواب سے تو عذر گناہ بدتر از گناہ معلوم ہوتا ہے۔ توریت اور انجیل میں تحریف ہوئی ہے، قرآن خود اس کی شہادت دیتا ہے کہ اہل کتاب نے اپنی کتابوں میں تحریف کر ڈالی ہے، کیونکہ خدا نے ان کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں لی، اس کے باوجود اس میں کمی بیشی ہوئی، تو تمہارے قول کے مطابق اہل کتاب نے لوح محفوظ میں کتر بیونت کر ڈالی! یہ کتنی احمقانہ بات ہے، کسی انسان کی رسائی لوح محفوظ تک کہاں ممکن ہے، اس لیے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اسی قرآن کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

تقیہ کیا ہوگا

تم کہتے ہو کہ تقیہ کیا ہوگا۔ تقیہ تو تمہارے امام کرتے ہیں، جن کے بارے میں تمہارا عقیدہ ہے کہ ان کو علم ماکان و مایکون حاصل ہوتا ہے، تمام غیب کی باتیں جانتے ہیں، اپنی موت و حیات پر ان کو اختیار حاصل ہے، تمہارے ایسے قادر مطلق زندگی بھر اپنا ایمان چھپائے رہے، اپنے

دشمنوں سے ڈرتے رہے اور تقیہ کی چادر میں منہ لپیٹے پڑے رہے، تمہارا خدا بھی ان کی حفاظت نہ کر سکا، شیعوں کا خدا بھی اتنا کمزور اور بے بس ہے کہ ان کے اماموں کی جان اور مال اور ایمان کی بھی حفاظت نہ کر سکا، ہمیشہ ایمان، جھوٹ اور نفاق کی آڑ میں بچاتے رہے۔ نعوذ باللہ، واستغفر اللہ.

حضرت علیؓ کی گواہی

آپ نے پہلی آیت سے تمام صحابہ کے مومن کامل اور جنتی ہونے کو ثابت فرماتے ہوئے دوسری آیت بھی پیش کی لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ . آپ نے سوال کیا کہ کیا شیعوں کو پتہ نہیں چلتا کہ بیعت شجرہ کرنے والے تمام مہاجرین و انصار تھے اور خدا نے ان کی مغفرت اور نصرت کا وعدہ کیا، ان کی صفات و کمالات کا ذکر کیا ہے اور کیسے کیسے شاندار وعدے کئے ہیں؟ کیا خدا کے وعدے کسی کافر، کسی منافق یا مرتد ہونے والوں سے ہو سکتے ہیں؟ صحابہ کرام کے ایمان کامل کی اس سے مکمل شہادت اور کیا ہو سکتی ہے۔

اب تم اپنے امام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خیالات بھی سن لو، جن کو رسول ہی نہیں خدا کے درجے تک پہونچاتے ہو۔ وہ تمام صحابہ کرام مہاجرین و انصار کے بارے میں کیا فرماتے ہیں اور تمہارے ہی جیسے کسی شیعہ کی کتاب نہج البلاغۃ ہے، اس میں ارشاد گرامی ہے لقد رأیت اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ما ارىٰ احداً منكم يشبهم و لقد كانوا يصبحون شعثاً اغبر باتوا سجداً و قياماً يراوحون جباههم و اقدامهم يقفون على مثل الجمر من ذكر معادهم كان بين اعينهم ركبٌ من طول سجودهم إذا ذكر الله

هملت أعينهم حتىٰ بل جباههم و مادوا كما يميد الشجر في اليوم العاصف خوفا من العقاب و رجاء للثواب حضرت علی کہتے ہیں کہ میں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے، ان جیسا میں تم کو نہیں پاتا ہوں، وہ پراگندہ بال اور غبار آلود صبح کرتے، وہ سجود و قیام میں نوبت بنوبت راحت پاتے تھے، ان کی زندگی ایسی تھی جیسے چنگاری پر ہوں خوف آخرت کی وجہ سے، سجدہ کے نشانات ان کی پیشانیوں پر تھے، ذکر خدا میں ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی تھیں، جیسے سخت ہوا میں درخت کانپتے ہیں، خوف عقاب اور امید ثواب سے۔

اسی طرح نہج البلاغۃ میں انہیں کا قول ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے، ہمارے باپ، ہمارے لڑکے، ہمارے بھائی، ہمارے چچا، ہمارے ماموں اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے تھے، اس سے ہماری ایمان میں زیادتی ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ اللہ نے ہماری مدد کی اور دشمنوں کو ذلت و خواری نصیب ہوئی، یہاں تک کہ اسلام مضبوط اور توانا ہو گیا۔

حضرت گنگوہیؒ لکھتے ہیں کہ ان عبارتوں سے تم اندازہ کر لو کہ مہاجرین اور انصار کے بارے میں تمہارے امام حضرت علیؓ کتنا مخلصانہ یقین رکھتے تھے اور کیسی کیسی ان کی تعریفیں کرتے تھے۔ پھر آپؒ نے ان کی کتاب سے امام صادق کا قول نقل فرمایا ہے، جس میں بارہ ہزار صحابہ کے ایمان کامل کا بیان ہے اور ان کی تعریف میں شاندار الفاظ استعمال کیے ہیں۔ حیرت ہے کہ تمہارے امام تو ہزاروں ہزار صاحب کو مؤمن کامل مانتے ہیں، مگر تم لوگ صرف چار پانچ ہی اصحاب رسول کو مسلمان کہتے ہو، معلوم ہوا وہ نہیں، تم جھوٹے ہو یا اپنے اماموں سے جھوٹ نقل کرتے ہو۔

ان دلائل کے بعد بھی آپ نے بہت سے شیعوں کی کتابوں سے عام

صحابہ کے ایمان کامل پر سندیں اور شہادتیں جمع کی ہیں۔

دوسرے سوال کا جواب

دوسرا سوال سقیفہ انصار میں جمع ہونے سے متعلق تھا کہ وہاں پر مسئلہ کے تصفیہ کے لیے اہل بیت کے فضائل و مناقب کو کیوں نہیں بیان کیا گیا اور مجمل بات کیوں کہی گئی کہ الأئمة من قریش جبکہ حضرت علیؓ کے فضائل کے ذکر کا موقع تھا، کیونکہ قریش میں سب سے زیادہ خلافت کے وہی مستحق تھے۔

حضرت گنگوہیؒ نے اس کی تفصیل کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ سقیفہ انصار میں اجتماع اس لیے ہوا تھا کہ وہ انصار میں سے امیر منتخب کرنا چاہتے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے وہاں جاکر حضورؐ کا ارشاد بتادیا کہ امیر و خلیفہ قریش میں سے ہوگا۔ تمام انصار نے حضورؐ کا ارشاد سن کر تسلیم کرلیا۔ پھر کوئی اعتراض نہیں ہوا اور سب نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

قرآن میں کہیں خلافت کی ترتیب مذکور نہیں۔ مسئلہ اس وقت در پیش تھا انتخاب امیر کا اور جب ان کو معلوم ہو گیا کہ انصار میں سے امیر نہیں ہوگا اور حضورؐ کا بھی ارشاد ہے۔ حضورؐ کا ارشاد صحابہ کے لیے اتنا ہی قطعی الثبوت ہے جتنا قرآن۔ انصار مدینہ شیعہ نہیں تھے کہ سیکڑوں آیات قرآنی اور نصوص ائمہ سن کر بھی ایمان نہیں لاتے، وہ اہل صدق و ایمان تھے، صرف سن کر تسلیم کرلیا۔ آپ کو اعتراض حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب پر ہے تو حضرت علیؓ کی زبانی سن لیجئے، انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو جو خط لکھا تھا اس میں یہ بھی تحریر تھا:

"تم کو میری بیعت کرنی ضروری ہے، تم شام میں تھے اس لیے

بیعت عمومی کے وقت تم موجود نہیں تھے، مدینہ میں بیعت تمام ہونے کے بعد حاضر و غائب کسی کو بھی اس سے انکار کی گنجائش نہیں، کیونکہ مجھ سے بیعت ان لوگوں نے کی ہے جنہوں نے حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان سے جس شرط پر بیعت کی تھی مجھ سے بھی اسی شرط پر بیعت کرلی۔ انصار و مہاجرین جمع ہو کر جس شخص کو اپنا امام مقرر کرلیں، وہ اللہ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہوتا ہے۔"

تمہاری کتاب اور تمہارے ہی امام نے تینوں خلفاء کے بارے میں صاف لکھ دیا کہ مہاجرین و انصار کی بیعت کے بعد خدا کے محبوب اور پسندیدہ ہونے کی علامت ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ کو ان تینوں حضرات کے خلیفہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، بلکہ ان حضرات کو اللہ کا مقرب ترین بندہ تصور کرتے تھے۔ اس کو کہتے ہیں مدعی سست اور گواہ چست۔ حضرت ابو بکرؓ کے مستحق خلافت ہونے کو خود حضرت علیؓ نے بیعت کر کے تسلیم کرلیا اگرچہ چھ ماہ کے بعد یہ تاخیر کسی ڈر کی وجہ سے نہیں، نہ وہ تقیہ کیے ہوئے تھے، بلکہ اس کے کچھ دوسرے اسباب تھے۔

شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ میں خلافت کی صلاحیت نہیں تھی، تو سوال یہ ہے کہ چھ ماہ کے بعد کیسے صلاحیت آگئی کہ حضرت علی بیعت کرلی؟ شیعہ کہتے ہیں کہ کہ بیعت زبردستی کی گئی، ان کی گردن میں رسی باندھ کر لایا گیا تھا اور مجبوراً انہوں نے بیعت کی۔ شیعہ بھی کتنے بے عقل ہیں کہ اپنے امام کو اتنا بزدل سمجھتے ہیں۔ یہ کون سی عقیدت ہے کہ جو شخص ہزاروں میں بہادر شخص تھا، اس کو شیعوں نے نامرد کہدیا۔ لاحول و لا قوۃ الا باللہ۔

حضرت گنگوہیؒ نے کلثوم کی شادی حضرت عمرؓ سے جو ہوئی تھی،

اس کا حوالہ دے کر سوال کیا ہے کہ نعوذ باللہ حضرت عمرؓ مسلمان نہیں، تو سوچو کہ حرام کاری میں کون مبتلا ہوا؟ یہی امام کی بیٹی کی عزت ہے؟ تم شیعوں نے کسی کی بھی عزت و حرمت کا پاس و لحاظ نہیں رکھا۔

تیسرے سوال کا جواب

شیعوں کا اعتراض ہے کہ حضرت فاطمہؓ کو ان کے باپ کی میراث نہ دے کر، خلفاء نے بددیانتی کی ہے، جبکہ وہی تنہا وارث تھیں۔ حضرت گنگوہیؒ نے اس کے جواب میں لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضورؐ کے ارشاد کے پیش نظر ایسا کیا اور حضرت فاطمہ کو بتا دیا کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ نحن معشر الانبیاء لانورث ما ترکناه صدقة حضرت فاطمہؓ خاموش ہو گئیں۔ جس طرح حضورؐ اپنی حیات میں اس جائداد سے جہاں جہاں خرچ کرتے تھے، انہیں موقعوں پر اس کی آمدنی ہمیشہ خرچ ہوتی رہے گی، یہ کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس وضاحت کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ آپؒ نے لکھا کہ فدک در حقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی جائداد نہیں تھی، بلکہ وہ بیت المال کی ملکیت تھی اور بقدر ضرورت اس میں سے صرفہ میں لاتے تھے۔ اس کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے یہاں اس آیت کو نقل کیا ہے، جس میں اس کا ذکر ہے۔

شیعوں نے ابو بکر صدیقؓ کی بیان کردہ روایت کو جھوٹی کہا۔ حضرت گنگوہیؒ نے خود شیعوں کی کتابوں سے اس کی تائید پیش کر دی۔ کافی کلینی سے جعفر صادق کا قول نقل کیا ہے، جس میں یہی الفاظ ہیں إن العلماء ورثة الانبياء و ذلك أنّ الأنبياء لا يورث درهما و لا دينارا الخ جب انبیاء درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے تو زمین و جائداد کا

کیسے وارث بنائیں گے۔ خود شیعوں کی کتابوں سے ثابت ہے کہ جہاں جہاں انبیاء کی وراثت کا ذکر آیا ہے، تو اس سے ان انبیاء کے علوم اور تعلیمات و ہدایات ہی مراد ہیں، مال و دولت نہیں؛ اس لیے حضرت ابو بکرؓ کی روایت صحیح، سچی اور بے داغ ہے اور خود شیعہ بھی حضرت ابو بکرؓ کو صدیق ہی کہتے ہیں اور جو ان کو صدیق نہیں کہتے اس کے بارے میں بد دعا کرتے ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ نے شیعوں کی کتابوں سے "کشف الغمه عن معرفة الائمه" کے حوالے سے ایک لمبی عبارت نقل کی ہے، جس میں امام جعفر نے حضرت ابو بکرؓ کو صدیق کہا، تو راوی نے کہا کہ آپ ان کو صدیق کہتے ہیں! تو امام اُچھل پڑے اور کہا کہ ہاں وہ صدیق ہیں، صدیق ہیں، صدیق ہیں اور جو ان کو صدیق نہ کہے، تو اے اللہ دنیا و آخرت میں اس کی بات کو سچی نہ بنانا۔

اس عبارت کے نقل کرنے کے بعد حضرت گنگوہی نے تحریر فرمایا کہ شاید ان کے امام کی اس بد دعا ہی کا اثر ہے کہ آج تک شیعہ جھوٹ بولتے چلے جا رہے ہیں اور قیامت میں بھی جھوٹ بولیں گے اور قدرت کی طرف سے سزا پائیں گے۔

شیعوں کی ایک اور کتاب محجاج السالکین کے حوالے سے آپ نے ثابت کیا کہ حضرت فاطمہؓ بھی حضرت ابو بکرؓ کے فیصلہ پر راضی ہو گئی تھیں۔ آپ نے کتاب کی ایک لمبی عبارت نقل فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

> "جب حضرت ابو بکرؓ کو اندازہ ہوا کہ فاطمہؓ کو میری بات سے انقباض ہوا اور ملاقات ترک کر دی اور گفتگو بند کر دی اور پھر کبھی فدک کی بات نہیں کی، تو ان کو بڑی گرانی ہوئی اور ان کو راضی کرنے کا تہیہ کیا، تو ان کے گھر گئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسول کی بیٹی! آپ سچ کہتی ہیں، آپ کا دعویٰ سچا ہے، لیکن میں نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ وہ اس میں سے فقراء اور مساکین اور مسافروں کی مدد فرماتے تھے اور اس میں جائداد کے کارندوں کو اور آپ کے اخراجات دیتے تھے۔ تو فاطمہؓ نے کہا کہ آپ وہی کیجئے جو میرے والد کرتے رہے ہیں، تو انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ میں وہی کرونگا جو حضورؐ نے کیا تو وہ خوش ہو گئیں اور حضرت ابو بکرؓ سے اس کا عہد و پیمان لیا، پھر حضرت ابو بکر ہمیشہ حضرت فاطمہ کے اخراجات دیتے رہے۔ جو باقی بچتا تھا وہ غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

حضرت گنگوہیؒ نے اس عبارت کو نقل کر کے ہادی علی شیعی لکھنوی کے منہ پر سیاہی پھیر دی کہ حضرت فاطمہؓ تو حضرت ابو بکرؓ کے فیصلے سے خوش تھیں اور تم آج تک اپنی ناراضی کا اظہار کرتے جا رہے ہو۔

چوتھے سوال کا جواب

ہادی علی شیعی لکھنوی نے سوال کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ پر رسول کا بھیجنا واجب ہے، تو خلفاء کی تقرری بھی منجانب اللہ ہونی چاہیے، کوئی امام بغیر خدا کے حکم کے مقرر ہوا تو اس کی نشاندہی کیجئے۔

حضرت گنگوہیؒ نے جواب میں فرمایا کہ شیعوں کو سوال کی بھی تمیز نہیں۔ خدا پر کوئی چیز واجب نہیں، وہ بندوں کی فوز و فلاح و خیر کے لیے جو کچھ کرے سب اس کا احسان ہے۔ رسول ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے بھیجے جاتے ہیں، سارے رسولوں کو خدا ہی نے بھیجا ہے۔ معلوم نہیں شیعوں کے پیغمبروں کو کون بھیجتا ہے، وہ تو آپ جانیں۔ انبیاء کی بعثت خدا کی طرف سے ضرور ہوتی ہے، لیکن شیعہ کہتے ہیں کہ ائمہ کی تقرری بھی اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، ہم کو اس سے انکار ہے۔ خدا

کی طرف سے نص ہونی ضروری نہیں خود تمہاری کتاب نہج البلاغۃ، جس کو قرآن سے زیادہ تم اہمیت دیتے ہو اس کے اندر تمہارے امام حضرت علی کا قول موجود ہے، جس میں خود ان کی تقرری مہاجرین و انصار کی شوریٰ نے کی ہے، منصوص من اللہ نہیں۔ حضرت معاویہؓ کے نام خط میں حضرت علیؓ کا قول ہے إنما الشوریٰ للمهاجرين و الأنصار فإن اجتمعوا على رجل و سموه اما ما كان الله رضى مہاجرین وانصار کی مجلس شوریٰ جس کو امام مقرر کرے، وہی امام خدا کو پسندیدہ ہوتا ہے۔ نہج البلاغۃ میں یہ بات حضرت علیؓ نے اپنی بیعت کے بعد کہی ہے۔ جب تمہارے پہلے ہی امام شوریٰ سے منتخب ہوئے، تو دوسرے ائمہ کہاں سے منصوص من اللہ ہو گئے۔ اگر اللہ کی طرف سے حضرت علیؓ خلیفہ بنائے جاتے، تو حضرت علی خدا اور رسول کے حکم کو بیان فرماتے، نہ کہ شوریٰ کا حوالہ دیتے۔ تمہاری ہی کتاب منہاج میں غلطی سے صحیح بات لکھ دی گئی ہے إنما الشوریٰ للمهاجرين و الانصار الخ

تم نے پھر یہاں وہی بات دہرائی ہے کہ صحابہ میں اکثر منافق تھے، ان کا کیا اعتبار، حالانکہ تمہارے بڑے پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں کہ ۱۲ ہزار مخلص اور مومن کامل تھے۔ تم نے بخاری شریف کا حوالہ دے کر دو تین کے نام گنائے ہیں، ان کا کون انکار کرتا ہے، وہ تینوں نام تو پورے عالم اسلام میں مشہور ہیں، ان کے علاوہ اگر کوئی نام ہو تمہارے پاس، تو ثبوت کے ساتھ پیش کرو۔ عبد اللہ بن ابی، ذوالخیر بصرہ، جد بن قیس یہ تو سب کے نزدیک منافق ہیں۔ تم نے بخاری کے حوالے سے کہا ہے کہ اس میں تمام منافقین کے نام ہیں، اس فریب دہی سے کام چلنے والا نہیں، اگر جرأت ہے، تو اس فہرست کو پیش کر دیا حوالہ دو کہ بخاری کے کس صفحہ پر کس باب میں یہ نام آئے ہیں؟ جاہلوں کو ورغلانے کا نتیجہ کچھ نہیں ہوگا۔

حضرت عمرؓ کے ایمان پر اس شیعہ نے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے کہ ساری زندگی شرک و کفر میں گذری، چند دن کے لیے بظاہر مسلمان ہو گئے اور صلح حدیبیہ کے موقع پر ان کے ایمان کی بھی قلعی کھل گئی۔

حضرت گنگوہیؒ نے ان ہفوات کا بہت تفصیلی جواب دیا ہے۔ مختصر یہ کہ حضرت عمرؓ کا اسلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے نتیجہ میں تھا۔ آپ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! دونوں میں سے ایک سے اسلام کو قوت دے عمر یا ابو جہل سے۔ اللہ نے حضرت عمرؓ کے بارے میں دعا قبول کر لی اور نبوت کے چھٹے سال آپؓ اسلام لائے اور ابو جہل مشرک کا مشرک ہی رہا۔ حضرت عمرؓ کے اسلام سے دین کو طاقت پہونچی اور ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کی فتوحات کا پرچم اتنا بلند کیا کہ دنیا حیرت زدہ ہو کر رہ گئی۔ تقریباً تیس سال آپ نے جہاد میں حصہ لیا۔ تم نے طعنہ دیا ہے کہ ساری زندگی بت پرستی میں گذار کر ایمان لائے، جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ بلوغ کے بعد آپؓ اسلام لائے، پھر پوری زندگی اِعلاء کلمۃ اللہ میں گذاری۔ اسلام لانے کے وقت آپؓ کی عمر تیس پینتیس کے درمیان تھی۔ تم ان کو طعنہ دیتے ہو کہ ساری زندگی بت پرستی میں گذاری اور نعوذ باللہ منافق رہے۔ جن کو تم مسلمان کہتے ہو، ان میں حضرت سلمان فارسی ہیں، جن کی عمر کا زیادہ حصہ مجوسیت، نصرانیت میں گذرا، آخر عمر میں مدینہ آکر مسلمان ہوئے، وہ تو تمہارے نزدیک مسلمان رہ گئے اور حضرت عمر جوانی میں مسلمان ہو کر ۶۳ سال کی عمر میں انتقال کیا، وہ نعوذ باللہ منافق رہے۔ حضرت عمرؓ کے ایمان کے بارے میں صلح حدیبیہ میں ان کے اعتراض کو بہانہ بنا رہے ہو، یہ تو ان کے کمالِ ایمان کی دلیل تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو جھک کر صلح کرنے کو دین کی عظمت کے خلاف اور اپنی جاں نثاری و فداکاری کے بھروسے پر

برداشت نہیں کر رہے تھے کہ ہم کافروں سے دب کر کیوں رہیں، ان کا مقصد تھا کہ جان چلی جائے، لیکن کافروں سے ذلت آمیز صلح نہ کی جائے۔

یہ بالکل جھوٹ ہے جو ہادی علی شیعی کہتا ہے کہ عمر نے کہا کہ جتنا حضورؐ کی نبوت میں مجھے آج شبہ ہوا، کبھی نہیں ہوا۔ اگر سچا تھا تو اس کا ثبوت پیش کرنا چاہئے تھا، کس کتاب میں کس روایت میں، کس تاریخ میں یہ الفاظ آئے ہیں؟ اتنا صریح جھوٹ صرف شیعہ ہی بول سکتا ہے، کیونکہ ان کے امام کی بد دعا ان پر پڑی ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں جھوٹے رہیں گے۔

تمہارے امام کیا کہتے ہیں، تم کو کچھ خبر نہیں۔ قریر العین جو نہج البلاغۃ کی شرح ہے، اس میں حضرت علیؓ کا قول لکھا ہوا ہے، جو انہوں نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں کہا ہے۔

لعمری إنّ مكانهما من الإسلام يعظم و إنّ المصاب بهما الجرح في الإسلام شديد رحمهما الله و اجزأهما بأحسن ما عملا.

اپنی بقاء کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسلام میں ان دونوں کا بڑا مرتبہ ہے، ان دونوں کے انتقال میں اسلام کا شدید نقصان ہے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے اور ان کے اعمال کی بہتر جزا دے۔

کیا اب بھی حضرت عمر کے اسلام کے بارے میں شک ہے؟ خدا کی بات تم نہ مانو، رسول کی بات تم نہ مانو، تو اپنے امام کی بات پر تو ایمان رکھو، مگر جھوٹوں کا کیا اعتبار؟ پھر کلثوم کی حضرت عمر سے شادی و نکاح تمہارے امام کی طرف سے ان کے کامل الایمان ہونے کی سند نہیں؟ کیا حضرت علی اپنی بیٹی کو کسی کافر یا منافق کو دے سکتے ہیں؟ اگر تمہارا تقیہ یہاں کام کر رہا ہو تو یہ بھی سوچو کہ زنا کا الزام کس کے سر جائیگا اور کون کون اس میں ماخوذ ہوگا۔

تمہارے امام حضرت عمرؓ کی خلافت پر بیعت کریں، تمہارے ائمہ حسن حسین ان کے دست مبارک پر بیعت کریں، ہر قسم کا تعاون دیں، ان کے حکموں کی تعمیل کریں، ان کے کاموں میں مددگار ہوں، تب بھی تمہارا مالیخولیا کم نہیں ہوتا، آخر اس جنون اور پاگل پن کا کب تک دورہ پڑتا رہے گا۔ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت میں تو تمہارے امام نے چھ ماہ تاخیر کی، مگر حضرت عمرؓ کی بیعت میں تو پہلے ہی مرحلہ پر بیعت کرلی۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ کی خلافت کے موقعہ پر بیعت کرنے والوں کی پہلی صف میں حضرت علیؓ اور خاندانِ رسالت اور اہل بیت تھے۔ کیا یہ تمام غیر مؤمن کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے؟ اگر خلافت حضرت امیر کے باب میں خدا کا نازل کردہ فرمان تھا تو خلافت بلا فصل کہاں سے نکل آئی؟ خلافت تو ان کو مل گئی، پھر تلملاہٹ کیوں؟ روز غدیر حضورؐ کا ارشاد **من کنت مولاہ فعلی مولاہ** ہم بسر و چشم منظور کرتے ہیں اور حضورؐ کے اس ارشاد پر حضرت علیؓ کو سب سے پہلے مبارکباد دینے والے حضرت عمر فاروقؓ ہی تھے، جن سے تم لوگ دلی بغض رکھتے ہو۔ یہ جملہ ہماری تمام کتابوں میں موجود ہے، اس سے کون انکار کر سکتا ہے، مگر تمہاری بلادت و غباوت ہے کہ مولیٰ کا معنی نہیں سمجھتے ہو۔ مولیٰ کا معنی دوست اور مددگار کے ہیں۔ یہی معنی یہاں مراد بھی ہے، جیسا کہ اس کے بعد والی عبارت شہادت دیتی ہے اللّٰھمّ وال من والاہ و عاد من عاداہ اس عبارت سے وہی معنی لو جو تمہارے دماغ میں پک رہا ہے۔ دوستی اور دشمنی دونوں یہاں بالمقابل بولے گئے ہیں، تم اولیٰ بالتصرف معنی بتاتے ہو، کبھی لغت بھی دیکھی ہے؟ تو ہم کو بھی دکھادو، پھر اس کے بعد خلافت بلا فصل کا دعویٰ کرنا۔

حضرت گنگوہیؒ نے ہادی علی شیعی کی اس ہفوات کا بھی ذکر کیا، جو

اس نے قرآن کے معنی میں تحریف کرنے کی جسارت کی تھی یا ایھا الرّسول بلّغ ما أنزل إليك الخ آیت کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ اس میں حضرت علیؓ کی خلافت کی تبلیغ کا حکم تھا اور ستر بار اس کی یاددہانی کی گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں اس کی تبلیغ نہیں فرمائی؟ رسول پر تہمت لگانے والوں نے حضورؐ پر حق تبلیغ نہ ادا کرنے کی تہمت لگائی، سن لیں کہ یہ موجب کفر ہے، آیت میں احکام دین کی تبلیغ کا حکم ہے، خلافت کا کیا ذکر؟ شیعوں نے کہاں سے یہ مفہوم نکالا؟ اگر اللہ کو خلافت علیؓ کی تبلیغ کا حکم دینا تھا، تو ایسی مجمل عبارت کیوں ارشاد فرمائی؟ حضورؐ صاف صاف حکم فرماتے کہ اے لوگو! میرے بعد بلا فصل خلیفہ اور وصی علی ابن ابی طالب ہیں۔ نعوذ باللہ حضور پر فریضۂ نبوت میں کوتاہی کا الزام اور اللہ تعالیٰ پر مجمل عبارت نازل کرنے پر ناراضگی، ان کفریات کا سلسلہ کہاں تک جاتا ہے؟

پانچویں سوال کا جواب

ہادی علی شیعی نے لکھا تھا کہ عترت کو کاذب کہنے اور جاننے والا کافر ہوتا ہے۔ اہل سنت کو کب اس سے انکار ہے، البتہ تم اپنے بارے میں سوچو کہ تم کیا ہو؟ اللہ تعالیٰ مہاجرین و انصار کو مؤمن کامل اور جنتی فرماتے ہیں، تم ان کو کافر و منافق کہہ کر قرآن کی، خدا کے فرمان کی تکذیب کرتے ہو، پھر تم کیا ہوئے؟ تمہارے امام نے کہا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کو جو صدیق نہ کہے، وہ دنیا و آخرت میں جھوٹا ہے، تم کو اس سے انکار ہے، تمہارا اشمار بھی اسی گروہ میں ہو۔ حضرت امیر ان کو مقرب و مقبول خدا کہتے ہیں اور خلفائے ثلثہ کی خلافت کا حق تسلیم کرتے ہیں، تو کیا وہ مکذب الثقلین ہوئے اور دائرۂ ایمان سے خارج اور سزاوار دار البوار جہنم۔

دیکھو اس کا مصداق سنی ہے یا شیعہ؟

چھٹے سوال کا جواب

ہادی علی شیعی نے ایک روایت تحریف کر کے لکھی اور اس کا ترجمہ لکھا کہ جس نے اپنے امام زمانہ کو نہیں پہچانا، وہ کافر مرا۔ حضرت گنگوہیؒ نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ شیعہ دھوکا دیتا ہے کہ یہ روایت فریقین کے نزدیک متفق علیہ ہے، وہ جھوٹ بولتا ہے، کسی اہل سنت کی کتاب میں یہ روایت نہیں ہے۔ یہ شیعوں کی خبیث عادت ہے کہ پہلے عبارت میں تحریف کرتے ہیں اور عوام کو دھوکہ دینے کے لیے غلط ترجمہ کرتے ہیں تاکہ دنیا کو دھوکا دے سکیں۔ اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں **من لم یعرف امام زمانه فقد مات میتة جاهلیة** جس نے اپنے وقت کے امام کو نہیں پہچانا، وہ جاہلیت کی موت مرا۔ جاہلیت کی موت کا مطلب یہ ہے کہ اسلام سے پہلے کوئی نظام حکومت نہیں تھا، ہر قبیلہ الگ الگ تھا، اسلام نے ان میں اتحاد پیدا کیا، ان کی اجتماعی اور متحدہ طاقت بنائی اور ان کو ایک مرکز پر جمع کیا، جب تک رسول اللہ اس دنیا میں رہے، ان کے جھنڈے کے نیچے مسلمان رہے، ان کے بعد ان کے خلفاء ان کے جانشین ہوئے، اب ان کی اطاعت ضروری ہوئی، تاکہ مسلمانوں کی وحدت قائم رہے۔ یہ وحدت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے، جب خلیفہ کی اطاعت اس کے جھنڈے کے نیچے جہاد جاری رہے۔ اب جو آدمی اپنے خلیفہ سے الگ رہے اور تعاون نہ کرے، ایسا شخص مرتا ہے، تو اس کی موت ویسی ہی ہوتی ہے، جیسی جاہلیت کے زمانے میں، حالت انتشار میں موت ہوتی ہے، وہ نہ عاصی ہے، نہ کافر۔

امام کا ایک معنی تو حاکم اور خلیفہ کے ہیں، ایک معنی مقتدا اور دینی

پیشوا کے ہیں۔ اگر کوئی خلیفہ نہ ہو تو مقتدائے دین کے اتباع کی جائے گی۔
یہ مطلب نہیں کہ ہر زمانہ میں ایک امام خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، جیسا کہ شیعوں کا عقیدہ ہے، جو معصوم بھی ہوتا ہے اور عالم الغیب بھی اور حد یہ ہے کہ ان کا ایک امام غائب بھی ہے۔ ایسے اماموں کا وجود اہل سنت کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔ امام خدا کی طرف سے انبیاء کی طرح نہیں بھیجے جاتے، بلکہ مسلمانوں کی مجلسِ شوریٰ ان کو منتخب کرتی ہے۔ اگر فتنہ کا زمانہ ہے، تو امام کا انتخاب بھی نہیں ہوگا، تو اس دور میں کوئی امام نہیں ہوگا۔ ائمہ عشرہ کی امامت شیعوں کی گڑھی ہوئی ہے، خدا نے کب کہا ہے کہ ہم نے ان کو امام بنایا ہے، امام تو مجلسِ شوریٰ مسلمانوں کی بناتی ہے۔ خود حضرت علیؓ کی بھی امامت شوریٰ ہی کے ذریعہ ہوئی اور خود ان کو اس کا اقرار بھی ہے جیسا کہ پہلے جواب میں نہج البلاغۃ کے حوالے سے ان کے خط بنام حضرت معاویہ کے سلسلہ میں ذکر کیا گیا۔ اس لیے بغیر مجلس شوریٰ کے انتخاب کے کوئی امام نہیں ہو سکتا۔

یہ بات بھی شیعوں کی غلط ہے کہ ہر زمانہ میں ایک امام ظاہر ہوتا ہے، جب مسلمانوں کی مجلس شوریٰ نہیں تو امام کہاں سے آگیا؟ ہادی علی شیعی کہتا ہے کہ حضرت علی مکذب امامت ابو بکر تھے اور حضرت فاطمہ ان سے ناراض۔ یہ سب فریب اور جھوٹ ہے، جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ ایک شگوفہ اس نے یہ بھی چھوڑا ہے کہ حضرت عائشہؓ، حضرت عثمانؓ کی خلافت کو نہیں مانتی تھیں، بلکہ ان کو گمراہ سمجھتی تھیں اور ان پر لعنت بھیجتی تھیں، جھوٹے پر خدا کی لعنت۔ معلوم نہیں کہاں سے اس نے یہ الزام تراشا ہے؟ یہ روافض کی عام عادت ہے کہ وہ بہتان طرازی کرتے ہیں اور بے بنیاد الزامات لگاتے ہیں۔ ہماری کسی کتاب میں یہ بات نہیں ہے۔ ہمارے مذہب میں امام کے ساتھ گستاخی حرام ہے، البتہ شیعوں

کے یہاں یہ عین دین ہے کہ اپنے ائمہ کو سب کچھ بنا رکھا ہے اور ان کی شان میں گستاخی سے بھی باز نہیں آتے۔

حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ پر لعنت کریں گی اور انہیں کے قتل کے الزام میں اپنے بھائی سے برہم بھی ہوں گی؟ اور اس سے قصاص طلب کریں گی؟ جب ان کو معلوم ہوا کہ میرا بھائی خلیفہ کے قتل میں شریک ہے، تو قصاص کے لیے انہوں نے کتنی مصیبتیں جھلیں، کیسے کیسے مصائب کا سامنا کیا، جنگ جمل کی پریشانیاں اٹھائیں، قاتلین عثمانؓ سے قصاص ہی کے لیے تو ام المؤمنین نے یہ تگ و دو کی تھی۔ پھر کس منہ سے تم کہتے ہو کہ حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کو گمراہ کہتی تھیں اور ان پر لعنت بھیجتی تھیں؟ اتنی موٹی موٹی حقیقتوں کو تم نہیں سمجھتے، دیوانوں اور پاگلوں جیسی باتیں کرتے ہو۔ خود شیعوں کا ایک راوی ابن اسحاق محمد بن الحنفیہ سے روایت کرتا ہے کہ حضرت علیؓ کو جب خبر ملی کہ حضرت عائشہ قاتلین عثمانؓ پر لعنت کرتی ہیں، تو حضرت علی نے بھی دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر منہ کے سامنے کیا اور فرمایا کہ میں بھی لعنت کرتا ہوں قاتلین عثمان پر پست زمین اور پہاڑ پر اور دو تین بار یہ جملہ آپ نے کہا۔ تمہاری اس روایت سے تو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ قاتلین عثمان پر لعنت کرتی تھیں اور حضرت علیؓ بھی قاتلین عثمانؓ پر لعنت بھیجتے تھے۔ حضرت علیؓ جب خلیفہ ہوئے، تو حضرت عائشہؓ نے ان کی خلافت کو بھی تسلیم کیا۔

ساتویں اعتراض کا جواب

ہادی علی رافضی لکھنوی نے کہا تھا کہ حضرت امیر جو امام اور خلیفہ تھے، ان سے جنگ کر کے حضرت عائشہ کافرہ ہو گئیں (نعوذ باللہ)، کیونکہ وہ مسلمانوں کے خلیفہ بلا فصل تھے۔

حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ تو قاتلین عثمان سے قصاص لینے بصرہ گئی تھیں، حضرت علیؓ سے جنگ کرنے نہیں؛ چنانچہ قعقاع سے گفتگو کی تھی۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے صاف کہدیا تھا کہ ہم لوگ جنگ کرنے نہیں آئے ہیں۔ قعقاع مطمئن ہو کر چلے گئے۔ قاتلین عثمانؓ نے دیکھا کہ جنگ نہیں ہوگی تو ہم لوگ گرفتار ہو کر قتل کر دیئے جائیں گے، اس لیے انہوں نے سازش کر کے حضرت عائشہؓ کے ہمراہیوں پر حملہ کر دیا اور شور مچادیا کہ طلحہ اور زبیر نے غداری کی اور صلح کا اظہار کر کے جنگ چھیڑ دی۔ تب تک حضرت علیؓ بھی بصرہ پہونچ گئے تھے، جب کہ ان کے مشیروں نے ان کو بصرہ جانے سے روکا تھا۔ جب حضرت علیؓ پہونچے، تو وہ خود جنگ میں شریک ہو گئے۔

تم کہتے ہو کہ حضرت علیؓ کو علم ماکان ومایکون حاصل تھا، کیا ان کو پتہ نہیں چلا کہ میرے حمایتی جھوٹ بولتے ہیں کہ حضرت طلحہ اور زبیر نے غداری کی، ساری شرارت قاتلین عثمان کی ہے؟ اگر علم تھا تو انہوں نے خود جنگ کا آغاز کیا، حضرت عائشہؓ نے نہیں، خطاکار تمہارے امام ہوئے، حضرت عائشہؓ کیسے خطاکار ہو گئیں۔ اگر بالفرض حضرت عائشہؓ نے جنگ کی تو انہوں نے اس کو اپنی خطاء اجتہادی سمجھی اور بعد میں اس سے توبہ بھی کی؛ اس لیے وہ کسی طرح خطاکار نہیں ہو سکتیں۔ خود حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ اور ان کے ساتھیوں کو مسلمان کہتے اور سمجھتے تھے، تم ان کو کافر کہنے والے کون ہوتے ہو؟ تم اپنے امام کی خود تکذیب کرتے ہو۔ حضرت علیؓ کا خود بیان ہے کہ أصبحنا نقاتل اخواننا فی الإسلام ہماری جنگ اپنے ہی مسلمان بھائیوں سے تھی۔ تم نے حضرت عائشہؓ اور ان کے ساتھیوں کو کافر کہہ کر حضرت علیؓ کی تکذیب کر دی، اس لیے تم خود کافر ہو گئے۔

حضرت علیؓ کو خلیفہ بلا فصل ماننا تمہارے دماغ کا فتور ہے اور حضرت ابو بکر نے خلیفہ ہو کر خدا اور رسول کے حکم کو منسوخ کر دیا یہ تم الزام دیتے ہو، تمہارے پاس کوئی ثبوت کوئی دلیل پہلے تھی نہ اب ہے۔ اگر علیؓ خلیفہ بلا فصل تھے، تو چھ ماہ کے بعد ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر کے خود ہی اللہ اور رسول کے حکم منسوخ کرنے والے بنتے ہیں، جب وہ خلیفہ بلا فصل تھے، تو انہوں نے بیعت کیوں کی؟ خدا اور رسول کے حکم کے خلاف کیا، تمہارے پاس نہ عقل ہے، نہ دماغ، پھر حماقت یہ ہے کہ تم اپنی کتابوں کو بھی نہیں مانتے ہو۔ خود تمہاری کتابوں میں حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ بلا فصل مانا گیا ہے، تم کو خبر نہیں اور مباحثہ کرنے چلے آئے۔ طبری آپ کا مفسر ہے، جامع البیان میں اس کا بیان موجود ہے، اس کا آخری جملہ ہے لما حرم مارية اخبر حفصة أنه يملك من بعده ابو بكر و عمر الخ

طبری کے پورے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کی باری میں ایک بار اپنی جاریہ قبطیہ سے خلوت فرمائی، حفصہ کو معلوم ہو گیا، تو حضور نے ان سے فرمایا کہ عائشہ کو مت بتانا اور ماریہ قبطیہ کو اپنے اوپر حرام کیا تھا، تو اس وقت آپ نے حفصہ کو بتایا تھا کہ میرے بعد ابو بکر اور عمر خلیفہ ہونگے۔ دیکھا تم نے، ایک شیعہ مفسر نے کتنا صاف اقرار کیا کہ ابو بکر حضورؐ کے بعد خلیفہ ہوں گے۔ اگر اس کا عقیدہ ہوتا کہ حضرت علیؓ خلیفہ بلا فصل ہیں، تو یہ تفسیر کیوں کرتا؟ اور حضورؐ کا ارشاد کیوں نقل کرتا؟ اس بیان کی روشنی میں اللہ اور رسول کے حکم کو جھٹلانے والا شیعہ ہے، جو علیؓ کو خلیفہ بلا فصل کہتا ہے اور کفر میں مبتلا ہو گیا۔ حضرت ابو بکرؓ کا صدیق ہونا تو تمہارے بڑے مانتے ہیں، تم کس گنتی میں ہو؟ امام معصوم محمد باقر کا بیان پہلے لکھ چکا ہوں۔ تم کو شکایت ہے کہ انہیں کو صدیق کیوں کہا گیا؟ صدیق حضرت امیر ہیں، یہ تمہاری

حماقت وسفاہت ہے، اتنی بھی عقل نہیں کہ سمجھ سکیں کہ حضرت علیؓ کو اسد اللہ کا خطاب ملا حسنؓ حسینؓ، عمارؓ وحذیفہؓ کو کیوں نہیں ملا، یہ بھی کوئی باریک مسئلہ ہے کہ سمجھ میں نہیں آیا۔

تم نے لکھا ہے کہ اہل بیت اور عترت ازواج مطہرات سے افضل و برتر ہیں، دلیل یہ دی ہے کہ انبیاء کی بیویاں کافر اور مرتد بھی ہو گئیں، عترت کبھی کافر و مرتد نہیں ہوتی ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اندھوں کو کچھ نظر نہیں آتا، حضرت نوح کے لڑکے کا کافروں کے ساتھ ہونا اور طوفان میں غرق ہونا خود قرآن میں تفصیل سے مذکور ہے، اس کے باوجود دعویٰ کہ عترت کافر و مرتد نہیں ہوتی، اس جہالت کی بھی کوئی حد ہے۔ معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں عترت اور زوجہ برابر ہیں۔ تم دعویٰ کرتے ہو کہ عائشہ اور حفصہ مرتد ہو گئی تھیں، تو سوال یہ ہے کہ وہ کب مرتد ہوئیں، حضورؐ کی حیات میں یا بعد وفات؟ اگر حیات میں مرتد ہوئیں، تو ساری زندگی حضورؐ نے ان کو اپنی صحبت میں رکھا اور ظاہر ہے کہ کافرہ مرتدہ عورت حرام ہو جاتی ہے، تو تمہارا الزام سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر براہ راست جاتا ہے کہ نعوذ باللہ نعوذ باللہ حرام عورتوں کو زوجیت میں رکھا۔ اگر بعد وفات مرتد ہوئیں، تو سوال یہ ہے کہ گناہ آج ہوا اور اس کا حکم عرصہ دراز کے بعد ہوا اگر دوسرے گناہ کی وجہ سے مرتد ہوئیں، تمہارے دماغ میں جو خناس بھرا ہوا ہے کہ حضرت علیؓ سے جنگ کر کے مرتد ہوئیں، تو اس کا جواب ابھی ابھی دے چکا ہوں۔

قرآن میں ازواج مطہرات کو آیت تخییر کے بعد اپنی زوجیت میں رکھنے کا خدا کی طرف سے حکم دیا گیا اور ان کی توبہ کو قبول کیا گیا اور پھر ساری زندگی حضورؐ کی صحبت میں رہیں، یہی ثبوت ہے ان کے مؤمن

کامل ہونے کا، جو قرآن سے ثابت ہے اور قرآن کی ایک آیت کا بھی انکار کفر ہے، تم تو خدا جانے کتنی آیتوں سے انکار کرتے ہو، تمہارے کفر کا کوئی ٹھکانہ ہے، محض کلمہ پڑھ لینے اور قبلہ رو کھڑے ہونے سے مسلمان نہیں ہو سکتے ہو۔ تم نے نہ عترت کو بخشا، نہ ازواج مطہرات کو اور نہ اللہ کے رسول ؐ کو ایذائیں پہونچانے سے باز آئے۔ تم نے اتہام لگانے اور گندی باتیں کہنے میں کبھی شرم نہیں کی۔ کلثوم ؓ کی شادی جب حضرت عمر ؓ سے ہوئی، تو تمہارا بدزبان مجتہد کہتا ہے:

"أول فرج غصبت منا"

لاحول ولا قوة الا باللہ، کتنا گندا انداز بیان ہے۔ یہ تمہارا عترت رسول کے ساتھ حال ہے۔ حضرت عائشہ ؓ کو ام المؤمنین کی جگہ ام الکافرین کہہ کر حضور کو ایذا پہونچاتے ہو، کیونکہ وہ محبوبہ رسول ہیں اور رسول کو ایذا پہونچانا کافروں کا کام ہے۔ تم ان کو ام المؤمنین نہیں مانتے، تو گویا تمہاری ماں نے تم کو عاق کر دیا اور ماں کا عاق کردہ جہنمی ہوگا، کیونکہ حضرت عائشہ ام المؤمنین، محبوبہ رسول امین کا عاق کردہ قطعاً جہنمی ہے، ایسے شریروں کی تکفیر و تفسیق ہر مسلمان پر واجب ہے۔

آٹھویں اعتراض کا جواب

ہادی علی رافضی نے دعویٰ کیا کہ حضرت حسن ؓ کے ساتھ ایک لاکھ آدمی تھے اور ان پر جان فدا کرنے والے تھے، مگر بحفاظت خون مسلم حضرت معاویہ سے صلح کر لی، حضرت حسین نے مددگار و ناصر پانے کے باوجود شہادت پائی۔ سنی ان کو امام نہیں مانتے، جبکہ خلفاء ثلاثہ ظالم تھے۔

حضرت حسین ؓ نے حضرت حسن ؓ کے صلح کرنے کے بعد جو کہا تھا، وہ شیعوں کی کتابوں میں موجود ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ "اگر میری ناک

کاٹ لی جاتی، تو بہتر تھا اس صلح سے جو حسن نے کی ہے" یعنی حضرت حسینؓ کو بھی حسن کی طاقت و قوت کا اندازہ تھا، غیرت کا اظہار ایسے ہی موقعوں پر ہوتا ہے، لیکن حسین کے پاس تو سوائے چند اہل خاندان کے کوئی حامی و ناصر نہ تھا، اس کے باوجود وہ جنگ کر کے شہید ہوئے۔ حسن نے تو حضرت معاویہؓ کی خلافت کو جائز رکھا، جب کہ ان میں مقابلہ کی طاقت تھی۔ معلوم ہوا کہ غیر معصوم بھی خلیفہ ہو سکتا ہے۔

اہل سنت کے نزدیک چار ہی خلیفہ برحق ہوئے۔ شیعہ اس کے برخلاف حضرت حسنؓ سے امام مہدی تک امام مانتے چلے جاتے ہیں۔ ہم ایسے اماموں کے قائل نہیں۔ یہ روافض اتنا بھی نہیں سوچتے کہ امام اور خلیفہ کس لیے ہوتا ہے، گھر میں چھپ کر گمنام بن جانے کے لیے یا ملک و مال اور رعایا مظلوم کی دادرسی اور کفر و شرک کے خلاف جہاد کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ تم نے دل میں یہ خیال خام پکا لیا کہ وہ امام ہیں۔ کوئی پاگل گھر بیٹھے، کھانے پینے کو کچھ نہیں اور کہہ دے میں شاہ جہاں ہوں، اس حماقت کا کوئی جواب ہے۔ جب امام ہی ماننا ہے، تو بارہ کا عدد ہی کیوں ہو؟ بارہ ہزار امام مان لو، کرنا دھرنا تو کچھ نہیں، صرف زبانی دعویٰ ہی کرنا ہے، تو زبان سے کہہ دینے میں کیا لگتا ہے، اپنے منہ میاں مٹھو بنے پھرتے ہو، ہوئی و ہوس کی پرستش کرتے ہو، ایسا امام تو ہر عامی اور جاہل بن سکتا ہے، تم میں کیا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے۔ حضرت حسینؓ کے دعویٰ کرنے سے وہ خلیفہ تو نہیں ہو گئے۔ اگر ان کے ہاتھ پر بیعت ہو جاتی، تو یقیناً وہ خلیفہ ہو جاتے اور ساری دنیا تسلیم کر لیتی، زبانی باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر حضرت حسن کی چھ مہینہ کے لیے بیعت کر لینے کے بعد حضرت حسین کے ہاتھ پر لوگ بیعت کر لیتے، تو ہم ان کو چھٹا خلیفہ مان لیتے۔ جب نہیں ہوئے تو اب کیا مان لیں۔ تم کہتے ہو کہ اجماع کوئی ضروری نہیں، بغیر

بیعت کے بھی وہ امام اور خلیفہ ہو گئے۔ اگر بیعت عام اور اجماع کی کچھ حقیقت نہیں اور اس کی وجہ سے کوئی امام اور خلیفہ نہیں ہوتا، تو حضرت امیر بھی خلیفہ نہیں ہوئے، نہ حضرت حسن خلیفہ ہوئے، کیوں کہ ان حضرات کو خلیفہ اجماع ہی کی وجہ سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ تو گویا تم نے ان دونوں کی خلافت سے بھی انکار کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے دماغ میں عقل نہیں، تم لوگ اپنے ہی بزرگوں کی پگڑیاں اچھالتے ہو۔

نویں سوال کا جواب

ہادی علی شیعی نے قرآن کی آیت نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ کا مطلب پوچھا تھا اور شیعی نقطۂ نگاہ سے اس نے خود اس آیت کا مطلب بیان کیا تھا۔ اس کے جواب میں حضرت گنگوہیؒ نے تحریر فرمایا کہ آیت کا مطلب ہے کہ بعض کو مانے اور بعض کو نہ مانے۔ مثلاً آیات مدح مہاجرین و انصار کو اور آیت ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ کو اور آیت فَإِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا کو اور آیات حرمت تقیہ وغیرہ کو نہ مانے، کسی کو الحاقی کہہ دے، کسی میں تحریف معنوی کر دے، کسی کو تحریف لفظی بتا دے۔ جیسا کہ آیت أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ میں أُمَّة کی جگہ أَئِمَّة بنا دے اور علیٰ ہذا معنیٰ حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ کے مطابق آیت الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ أَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي کے ہیں۔ خدا نے اس کو تکمیل دین قرآن شریف سے بتایا ہے، کتاب اللہ سب کے لیے کافی ہے۔ حضورؐ نے جو فرمایا ہے کہ میں تم میں دو بڑی بھاری چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، اس کو مضبوطی سے پکڑے رہنا: ایک قرآن دوسرے میرے اہل خاندان ان دونوں چیزوں کو قیامت تک پکڑے رہنا لَنْ يَتَفَرَّقَا حَتَّىٰ يَرِدُوا عَلَيَّ الْحَوْضَ۔ یہ ٹکڑا بتا رہا ہے کہ ثقلین دونوں باہم

مطابق ہیں اور قرآن عترت سے اعظم ہے اور دونوں کا افتراق بھی ناممکن ہے، اس لیے جس نے قرآن کو مضبوطی سے تھام لیا، اس نے ثقلین کو مضبوطی سے تھام لیا، اسی لیے حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ کہا گیا، قرآن اور عترت دونوں ایک ہی ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ قرآن کو اختیار کرنے والا عترت کو ترک کر رہا ہے، جیسا کہ رافضی کہہ رہا ہے نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ کا اطلاق اس پر کسی طرح جائز نہیں۔ تم البتہ قرآن کے کچھ حصے کو مانتے ہو اور کچھ کو نہیں مانتے ہو اور قرآن کی ایک آیت سے بھی انکار کفر ہے۔ یہ آیت روافض پر صادق آتی ہے، اہل سنت پر نہیں۔

دسویں سوال کا جواب

قرآن کی ایک آیت میں رسول کے اعزہ واقارب کو عمل صالح کی تاکید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ نیک عمل ہی تمہارے کام آئے گا، رسول سے قرابتداری نہیں۔ اگر تمہارے پاس نیک عمل نہیں ہوگا، تو سخت عذاب میں گرفتار ہوگے۔ اس مفہوم کی آیت کو ہادی علی شیعی نے ازواج مطہرات کے ساتھ خاص کر دیا اور کہا کہ خدا نے ان کے کفرو شرک سے ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ آیت کے مخاطب اخص الخواص مومنین اہل بیت اور حضورؐ سے قرابت رکھنے والے سب لوگ ہیں اور آیت کا مطلب ہے کہ کوئی بھی شخص حضورؐ کی قرابت، تقرب یا زوجیت یا کسی طرح کے رشتہ کی بنیاد پر رسول کی نافرمانی نہ کرے، یا گناہ پر اصرار نہ کرے، ورنہ کوئی چیز ان کو عذاب آخرت سے نہیں بچا سکتی۔ حضرت نوح کے لڑکے اور حضرت لوط کی بیوی عذاب خداوندی میں گرفتار ہوئے، نبی کے لڑکے ہونے اور نبی کی بیوی ہونے کی وجہ سے عذاب الٰہی سے نہ بچ سکے اور دوزخ میں گئے

،ایسے ہی کوئی بھی کریگا تو وہی سزا ہو گی۔

آیت تخییر میں بھی فہمائش کی گئی کہ جو رسول کا انتخاب کرے گی، اس کو بڑا اجر ملے گا، پھر اس کے بعد خدا نے رسولؐ سے کہا کہ ان کو اپنے سے علیحدہ نہ کرو، اسلئے آپؐ نے ساری عمر ان کو اپنی زوجیت میں رکھا، رسولؐ کی معیت کی وجہ سے یقیناً ان کو آخرت میں اجرِ عظیم ملا ہو گا، کیوں کہ وعدۂ خداوندی ہے اور دشمنانِ اہل سنت کو خسران اور عذاب نصیب ہوا۔

آیت میں تہدید شفقت خداوندی کے ساتھ ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف آیات میں عتاب آمیز انداز میں مخاطب کیا گیا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے مثال میں یہاں متعدد آیات درج فرمائی ہیں، جس میں عتاب کا انداز ہے، اس کے بعد آپ نے شیعوں سے سوال کیا ہے کہ ازواج مطہرات پر عتاب آمیز انداز بیان پر دشنام طرازی کرتے ہو، ان آیتوں کو دیکھ کر کیا تم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی وہی سب کچھ کہہ سکتے ہو جو ازواج مطہرات کے بارے میں کہتے ہو؟ اگر ایسا کرو گے تو سیدھے جہنم میں جاؤ گے۔

حضرت گنگوہیؒ جب ہادی علی شیعی لکھنوی کے سارے سوالات و اعتراضات کے جواب سے فارغ ہوئے، تو انہوں نے اس کی آخری عبارت پر تھوڑی سی گفتگو فرمائی ہے۔ انہوں نے تحریر فرمایا کہ سائل اپنے آپ کو متمسک سفینہ نجات اور اہل سنت کو متخلف عن سفینۃ العترۃ و الآل قرار دیتا ہے، تو اس کے جواب میں "قبقاب لآل الکذاب" کی عبارت کچھ تبدیل کر کے نقل کرتا ہوں اور اسی پر اس کے سارے جوابات تمام ہو جائیں گے، اگرچہ الفاظ لکھنے کا قصد نہ تھا، پھر آپ نے اس کتاب سے یہ عبارت نقل فرمائی ہے:

"علم یہ اٹھائیں، تعزیے بنا کر مشرکانہ کام یہ کریں، جب کہ

ان کی کتاب من لا یحضر میں صاف لکھا ہے کہ جس نے قبر کی نقل کی یا کوئی تمثال بنائی اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دی اور ایک نیا دین ٹھہرالیا، وہ دین اسلام سے نکل گیا، یہی سفینۂ تمسک ہے نجات کا ؟ دلدل سدھایئے، تابوت پھرایئے، طفیل بن جعد ایک گندھی کی دکان سے کرسی اٹھالایا اور اس کا نام تابوت سکینہ رکھ دیا، یہی تمسک ہے ؟ کہ بھس اڑایئے پچھتیوں میں نوحے گایئے، ڈھول بجایئے، مرثیے کے پردے میں حضرت شہر بانو کا انڈا پکایئے، لوگوں کو ناحق رلایئے، کتاب حسینہ کی اوٹ میں جناب نرگس کا سہاگ پوڑہ دکھایئے، سلاطین کے سامنے سجدہ کیجئے، شاہ عباس اور طہماسپ کو اپنا مسجود بنایئے، جناب مرتضوی کو خائف اور بزدل بتایئے، آپؓ کی اولاد کو کذاب اور مغضوب ٹھہرایئے، عید غدیر کا جشن منایئے اور شہادت فاروقی کو سن کر خوشی کے ترانے گایئے، جس کا موجد احمد بن اسحاق شیعی ہے، عید نوروز پر ان کے مجوسی بادشاہوں کی ایجاد کردہ رسم پر جشن کیجئے۔

یہ سارے مشرکانہ و کافرانہ اعمال و افعال شب و روز کر کے دین و ایمان کو تباہ کر کے جہنم کے سزاوار بنئے اور اپنے منہ میاں مٹھو بنتے رہئے کہ ہم متمسک سفینۂ نجات ہیں اور اہل سنت اس کشتی سے پیچھے رہ جانے والے ہیں، مشرکین مکہ خود کو متبع ملت ابراہیمی کہتے تھے اور مسلمانوں کو صابی کہتے تھے، یہود و نصاریٰ خود کو موسوی اور عیسوی بتاتے تھے اور دوسروں کو گمراہ اور بددین، لیکن سوائے ذلت و رسوائی ان کو کیا حاصل ہوا! تم نے بھی شرم و حیا کو خیر باد کہہ دیا، جو چاہو کرو اور عذاب آخرت کے لیے تیار رہو۔ و ما علینا الا البلاغ

(۷) ہدایۃ المعتدی

یہ رسالہ ۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ پورا نام "ہدایۃ المعتدی فی

قراء ۃ المقتدی " ہے، جو مسئلہ قرأت خلف الامام پر ہے۔ اس سے قبل آپؒ نے " سبیل الرشاد " کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا، جس میں اس مسئلہ پر محد ثانہ اصولوں پر گفتگو فرمائی تھی؛ چنانچہ اس رسالہ میں اس گفتگو کا حوالہ ہے، مگر اس رسالہ میں ان مباحث کو دہرایا نہیں گیا ہے، اس رسالہ میں صرف ان دلائل کا جائزہ پوری علمی بصیرت سے لیا گیا ہے ، جو مدعیان قرأۃ خلف الامام پیش کرتے ہیں اور ان کو نمبر شمار دے کر مختلف احادیث کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ ان روایتوں سے مقتدی کا سورۂ فاتحہ پڑھنا کسی طرح صحیح نہیں ہے، ان دسوں دلائل کے مباحث کا اجمالی تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) مدعیان قرأۃ خلف الامام کہتے ہیں کہ قرآن میں " فَاقْرَأُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآن " آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اور مقتدی دونوں پر قراءت فرض ہے، کیونکہ یہ حکم عام ہے۔

حضرت گنگوہیؒ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ یہ آیت سورۂ مزمل کی آیتوں میں سے ہے، جو ابتداء عہد نبوت میں مکہ میں نازل ہوئی ہے، جب کہ ابھی نماز پنجگانہ فرض بھی نہیں ہوئی تھی، اس وقت طویل نماز تہجد فرض تھی اور اس میں امام اور مقتدی دونوں قرأت کرتے تھے۔ تقریباً ایک سال تک یہی صورتِ حال رہی، اس کے بعد سورۂ مزمل کی وہ آیت نازل ہوئی، جو مدعیان قرأت پیش کرتے ہیں فَاقْرَأُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآن ۔ اس آیت سے طویل نماز تہجد منسوخ ہو گئی، مگر مختصر نماز تہجد کی فرضیت بحال رہی۔ اس وقت بھی اس مختصر نماز تہجد میں بھی امام اور مقتدی دونوں قرأت کرتے تھے، پھر ایک عرصہ بعد نماز پنجگانہ جب فرض ہو گئی، تو قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی " إِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَ أَنْصِتُوا " جس سے مقتدی کی قرأت منسوخ ہو گئی اور

صرف امام کے لیے قرأت باقی رہی۔ جیسا کہ بیہقی کی روایت میں ہے۔

عن محمد بن کعب القرظی قال ، کان رسول الله صلی الله علیه وسلم إذا قرأ فی الصّلوٰۃ أجابه من وراء ہ إذا قال بسم الله الرحمن الرحیم قالوا مثل ذٰلك حتی تنقضی الفاتحة و السورة ، فلبث ما شاء الله أن یلبث ثم نزلت إذا قرئ القران فاستمعوا له و انصتوا (انتهیٰ)(۱)

اس روایت کے پیش کرنے کے بعد آپؒ نے تحریر فرمایا کہ جو حکم منسوخ ہو چکا، اس کو دلیل میں پیش کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے، تفصیلی بحث سبیل الرشاد میں دیکھی جاسکتی ہے۔

(۲) ان کی دوسری دلیل عبادہ بن صامتؓ کی روایت ہے، جو بخاری و مسلم، ابوداؤد، ترمذی، مسند احمد وغیرہ میں ہے۔ کسی میں یہ روایت مختصر ہے، کسی میں مفصل، کسی میں روایت کا پہلا جزء ہے، دوسرا نہیں، کسی میں دوسرا جزء ہے، پہلا جزء ذکر نہیں گیا گیا اور بعض کتابوں میں مکمل روایت ہے۔ اب جن لوگوں نے بعض کتابوں میں اس روایت کے ایک جزء کا ذکر کیا ہے، اس کو ایک مستقل روایت مان کر دلیل مان لیا، حالانکہ وہ ایک لمبی روایت کا صرف ایک جزء ہے۔ استنباط مسائل کے لیے ضروری ہے کہ مکمل روایت کو پیش نظر رکھا جائے۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ اصولی بات یہ ہے کہ ان احادیث کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مکمل روایت کو سامنے رکھا جائے، سیاق و سباق، موقعہ و محل کا لحاظ رکھا جائے، حضورؐ نے کس موقعہ پر اور جتنا کچھ ارشاد فرمایا ہے، سب کو پیش نظر رکھا جائے؛ تب ہی منشاء رسالت کو صحیح طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

مدعیان قرأت خلف الامام سے یہی غلطی ہوئی کہ انہوں نے ایک

---

(۱) سیوطی نے الدر المنثور ج ۳ ص ۱۵۵ پر یہ روایت نقل کی ہے۔

روایت کے مختلف اجزاء جو الگ الگ کتابوں میں آئے ہیں، ان کو مستقل اور مکمل روایت سمجھ لیا اور اس کو اپنا مستدل بنالیا اور پوری روایت کو پیش نظر نہیں رکھا اور سیاق وسباق کو پیش نظر نہیں رکھا، جس کی وجہ سے وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور غلط نتیجہ اخذ کر لیا۔

عبادہ بن صامتؓ کی روایت میں ایک جملہ ہے **لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب** روایت کے ابتدائی کلام کو حذف کر دیا اور سمجھ لیا کہ یہ عام جملہ ہے، اس لیے مقتدی کے لیے بھی سورۂ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے، حالانکہ روایت کا یہ مقصد نہیں، آگے پیچھے کی عبارت کو چھوڑ کر بیچ کا ایک جملہ لے لیا، یہ حدیث پر غور کرنے کا غلط طریقہ ہے۔ اس کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی پوری روایت نقل فرمائی ہے: **عن عبادة بن الصامتؓ قال صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم الصبح فثقلت عليه القراء ة فلمّا انصرف قال إنى أراكم تقرؤون وراء إمامكم . قال قلنا يا رسول الله ! اى ، و الله ، قال لاتفعلوا إلا بامّ القرآن فإنه لا صلوٰة لمن لم يقرأ بها كذا فِي الترمذى** ۔ حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں: ایک یہ کہ حضورؐ نے سورۂ فاتحہ کے علاوہ مقتدی کو پڑھنے سے قطعاً منع کر دیا اور حرام قرار دیا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا مباح ہے، کیونکہ نہی کے بعد جو استثناء ہوتا ہے، وہ مفید اباحت ہوتا ہے، اس سے وجوب یا استحباب ثابت نہیں ہو سکتا، جب تک کوئی دوسری دلیل وجوب یا استحباب کے لیے نہ ہو، اس لیے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر مقتدی نے سورۂ فاتحہ پڑھ لی، تو اس سے نماز میں فساد نہیں آیا، البتہ اس سے زیادہ پڑھے گا تو مرتکب حرام ہوگا۔

بخاری ومسلم نے اس روایت کے آخری جزء **لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ**

بفاتحة الکتاب کو لکھا ہے اور اصل مکمل روایت میں " فانہ" کا جو لفظ ہے ، اس کو ترک کر دیا ہے، جس کی وجہ سے بظاہر یہ ایک مستقل حدیث معلوم ہوتی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، یہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی اسی روایت کا ٹکڑا ہے جو ذکر کی گئی، الگ سے مستقل کوئی دوسری روایت نہیں۔ مستقل حدیث تسلیم کر لینے کی وجہ سے وہ سورۂ فاتحہ کو واجب قرار دیتے ہیں، کیونکہ یہاں صیغہ نہی استعمال نہیں ہوا اور نہ نہی کے بعد استثناء ہے، جو اباحت کی دلیل ہے۔

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ جب یہ ٹکڑا مستقل حدیث نہیں تو اس ٹکڑے سے استدلال بھی صحیح نہیں ہوگا۔ اس ٹکڑے کا مستقل حدیث نہ ہونا خود بخاری کی کتاب " جزء القراءت " سے ثابت ہے۔

اس ٹکڑے کے مستقل حدیث نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس جملہ کے ساتھ امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں حضرت معمر سے نقل کیا ہے:

قال مسلم اخبر معمر عن الزهري بهذا الاسناد منه فزاد فصاعداً امام نسائی نے بھی اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔ امام ابوداؤد نے امام زہری کے دوسرے شاگرد حضرت سفیان سے بھی فصاعداً کا لفظ روایت کیا اور یہ مسلمہ اصول ہے کہ ثقہ کی زیادتی تمام محدثین کے نزدیک معتبر ہوتی ہے۔ حضرت معمر اور حضرت سفیان تمام محدثین کے نزدیک ثقہ ترین راویوں میں سے ہیں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم ان دونوں کی روایتوں سے بھری ہوئی ہیں، ایسے دو راوی جب فصاعداً کا لفظ روایت کرتے ہیں، تو اس کی صحت میں کوئی کلام نہیں رہ جاتا ہے۔ بخاری و مسلم کی روایت کردہ اس جزء کے ساتھ فصاعداً کا لفظ مل کر عبارت یہ ہوئی **لا صلوٰة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب فصاعداً**۔ اب عبارت کا مفہوم یہ ہوا کہ کوئی نماز بغیر سورۂ فاتحہ اور **مازاد على الفاتحه** کے درست نہیں ہوتی،

توسوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس عموم میں مقتدی کی نماز داخل ہے، تو پوری حدیث کا مفہوم کیسے صحیح ہوگا؟ کیوں کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے سورۂ فاتحہ کے علاوہ پڑھنا حرام کہا جاچکا ہے، یہاں اس کے برعکس مازاد علی الفاتحۃ کا بھی پڑھنا واجب بتایا جارہا ہے، پس اول حدیث آخر حدیث کے ساتھ متعارض ہوگئی۔ ایک ہی روایت میں دو متضاد باتیں کہی گئیں جس کی وجہ سے روایت بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے حالانکہ نبی کا کلام متعارض نہیں ہوسکتا۔ آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ فصاعداً کی زیادتی ہم تسلیم نہیں کرتے، کیوں کہ یہ محدثین کے تسلیم شدہ اصول کے خلاف ہوگا، اس لیے روایت کا وہی مفہوم صحیح ہوگا، جس میں یہ تعارض نہ ہو اور وہ یہی ہے کہ جیسے مکمل روایت سے سورۂ فاتحہ کی قرأت کا مباح ہونا معلوم ہوا تھا، اس جزء سے بھی اس کا مباح ہونا ہی تسلیم کیا جائے، نہ کہ سورۂ فاتحہ کا وجوب ثابت کیا جائے۔ یہ محض ہمارا خیال ہی نہیں، بلکہ حقیقت واقعہ ہے۔ حضرت سفیانؒ نے امام زہریؒ سے فصاعداً کا لفظ جو روایت کیا ہے، تو وہاں قال سفیان لمن یصلی وحدہ کی وضاحت موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم منفرد کے لیے ہے، مقتدی کے لیے نہیں پس سفیان اور معمر کی روایتوں سے یہ بات محقق ہوگئی کہ حضرت عبادہؓ کی روایت سے مقتدی پر قراءت سورۂ فاتحہ کا وجوب کسی حال میں ثابت نہیں ہوسکتا۔ امام بخاری نے فصاعداً کی زیادتی سے انکار ضرور کیا ہے، مگر یہ قاعدۂ مسلمہ کے خلاف ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کی توجیہ کی کوشش کی ہے۔

پھر حضرت گنگوہیؒ نے دوسری اور روایتوں کو بطور ثبوت پیش کیا ہے اور ان تمام روایتوں کو پیش نظر رکھا ہے، جو عام طور سے اس مسئلہ میں پیش کی جاتی ہیں اور ہر روایت پر محدثانہ اصولوں پر بحث کی ہے۔ یہ

بحث بڑے سائز کے ۱۲ صفحات پر پھیلی ہوئی۔ سچ پوچھیے تو آپؒ نے اس دلیل میں اس بحث کو مکمل طور پر پیش کر دیا ہے، مزید دوسرے دلائل کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔

(۳) مخالفین کی تیسری دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، جس کے الفاظ ہیں کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بأمّ الکتاب فھی خداج (۱) وہ کہتے ہیں کہ یہ ہر مصلی کے لیے ہے، جس میں مقتدی بھی شامل ہے، اس لیے مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، ورنہ اس کی نماز ناقص ہوگی۔

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ یہ صرف منفرد کے لیے ہے، مقتدی کے لیے نہیں ہے۔ پھر اس کی متعدد وجوہ بیان فرمائی ہیں جو مختصر طور پر یہاں پیش کی جا رہی ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منازعت کی وجہ سے امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ متعدد روایتوں سے ثابت ہے صرف سورۂ فاتحہ کو مباح رکھا تھا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ قرأتِ سورۂ فاتحہ سے بھی منازعت ہوتی ہے، اس لیے آپ نے سورۂ فاتحہ کی قرأت سے بھی منع فرمادیا، جیسا کہ بیہقی کی سنن کبریٰ میں ابو ہریرہؓ کی روایت ہے، اس میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فاتحہ پڑھنے کو بھی موجب منازعت فرمایا ہے، اس کے بعد میں سب صحابہ نے اس کو ترک کر دیا تھا۔ منازعت جب موجب تحریم ہوئی اور صحابہ نے ترک کر دیا، تو پھر وہی چیز واجب کیسے ہو سکتی ہے؟ اس لیے یہ حدیث مقتدی کے لیے نہیں، منفرد کے لیے ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بخاری اور دوسری کتابوں میں یہ روایت

---

(۱) ابوہریرہ کی روایت کے بھی یہی الفاظ ہیں ابوداؤد ج ا ص ۱۱۹

موجود ہے کہ ابو بکرہ رضی اللہ عنہ جب مسجد میں آئے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں جا چکے تھے، انہوں نے صف سے پہلے ہی رکوع کر لیا اور اسی حالت میں چل کر صف میں شامل ہوئے۔ نماز ختم ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرہؓ سے فرمایا زادك الله حرصاً ولا تعد(۱) اگر مقتدی پر سورۂ فاتحہ واجب ہوتی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اعادۂ نماز کا حکم فرماتے، حالانکہ آپ نے نماز دہرانے کا حکم نہیں دیا۔ معلوم ہوا کہ مدرک رکوع رکعت کا پانے والا ہے اور بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز ہو جاتی ہے، مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب نہیں ہے۔ یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ ایک صحابی کی خصوصیت ہے، دوسرے کے لیے جائز نہیں، کیونکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کے متعلق عبد اللہ بن عمروؓ، عبد اللہ بن زبیرؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ یہ دونوں حضرات مسجد میں اس وقت آئے، جب حضورؐ رکوع میں تھے، یہ حضرات بھی رکوع میں شامل ہو گئے، معلوم ہوا کہ یہ کسی ایک صحابی کی خصوصیت نہیں تھی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ بیہقی کی سنن کبریٰ میں یہ روایت موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب امام رکوع میں ہو تو رکوع میں شامل ہو جاؤ اور سجدے میں ہو تو سجدے میں شامل ہو جاؤ، لیکن سجدے میں شمولیت سے رکعت نہیں ملے گی، البتہ رکوع میں شامل ہونے والا رکعت پانے والا ہے۔ یہ مشہور مسئلہ ہے کہ مدرک رکوع مع الامام مدرک رکعت ہوتا ہے، عام ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ پڑھے یا نہ پڑھے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ابن عدی نے کامل میں حضرت عائشہؓ کی اس روایت کو بایں الفاظ روایت کیا ہے کل صلوٰۃ لایقرأ فیھا بفاتحۃ

---

(۱) ابوداؤد ج ا ص ۹۹ باب الرجل یرکع دون الصف

الکتاب و آیتین فھی خداج۔ ابن عساکر نے بھی انہیں الفاظ میں روایت کیا ہے۔ لفظ " آیتین " سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ روایت میں جو حکم ہے، وہ منفرد کے لیے ہے، مقتدی کے لیے نہیں ہے۔ مذکورہ بالا چار وجہوں کی وجہ سے ہم حضرت عائشہؓ کی اس روایت کو منفرد کے لیے مانتے ہیں، مقتدی کے لیے نہیں۔

(۴) مدعیان قرأت خلف الامام کی چوتھی دلیل عبد اللہ بن عمروؓ کی روایت ہے، جس کے الفاظ ہیں: کل صلوۃ لایقرأ فیھا بفاتحۃ الکتاب ، فھی خداج خداج۔ اس روایت کو بھی دلیل میں پیش کرنا صحیح نہیں، کیوں کہ اس روایت میں جو حکم ہے، وہ منفرد کے لیے ہے، مقتدی کے لیے نہیں، جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث کا مفہوم ہے اور انہیں چاروں وجوہ سے مقتدی پر اس حکم کا اطلاق نہیں ہو سکتا، جو حدیث عائشہ میں مذکور ہوئیں۔

(۵) ان کی پانچویں دلیل ابوہریرہؓ کی ایک روایت ہے، جس کے الفاظ ہیں من صلی صلوٰۃ لم یقرأ فیھا بأمّ القران فھی خداج غیر تمام(۱) اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ وہی روایت ہے جو حضرت عائشہ سے مروی ہے، انہیں مذکورہ وجوہ کی وجہ سے یہ بھی منفرد کے لیے ہے مقتدی کے لیے نہیں۔ وجوب فاتحہ مقتدی کے لیے اس سے ثابت کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کی مذکورہ بالا تینوں احادیث قطعاً ایک ہیں اور ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ عبد اللہ بن عمروؓ کی روایت میں بفاتحۃ الکتاب و آیتین کے الفاظ آئے ہیں اور جب ایک طریق میں یہ زیادتی تسلیم کر لی گئی تو اصولاً تینوں طرق میں یہ زیادتی تسلیم کی جائے گی اور جب

(۱) ابوداؤد ج ۱ ص ۱۱۸

یہ زیادتی تسلیم کرلی گئی تو ثابت ہو گیا کہ یہ تینوں روایتیں مقتدی کے لیے نہیں، منفرد کے لیے ہیں۔

(۶) مدعیان قرأت خلف الامام ابو ہریرہؓ کی ایک اور روایت بھی پیش کرتے ہیں، اس کے الفاظ ہیں قال لی رسول الله صلی الله علیه وسلم أخرج ، فنادِ فی المدینة أنّه لا صلوٰة إلا بقراء ة فاتحة الکتاب فما زاد (۱) حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں مقتدی کے لیے قرأت فاتحہ کا وجوب ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ اور آیتوں کے بھی پڑھنے کا حکم ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ مقتدی کو اس سے روکا جا چکا ہے۔ روایت میں حکم انہیں لوگوں کے لیے ہے جن پر قرأت فرض ہے جیسے امام اور منفرد۔ مقتدی کے لیے اس روایت سے سورۂ فاتحہ کا وجوب ثابت کرنا خام خیالی ہے۔

(۷) ان کی ساتویں دلیل ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، جو ابو داؤد اور بخاری کی جزء القرأت میں ہے، جس کے الفاظ ہیں امرنا نبینا صلی الله علیه وسلم أن نقرأ بفاتحة الکتاب و ما تیسر۔ ظاہر ہے کہ یہ روایت بھی انہیں لوگوں کے لیے ہے، جن پر قرأت فرض ہے، جیسے امام اور منفرد، کیونکہ اس میں سورۂ فاتحہ کے علاوہ کو بھی واجب کہا گیا ہے، جس کو مدعیان قرات خلف الامام بھی نہیں مانتے۔

(۸) ان کی ایک دلیل وہ روایت ہے، جو جزء القراءت میں ہے:

عن ابی قلابة عن محمد بن ابی عائشة بمن شهد ذاك قال رسول الله صلی الله علیه وسلم فلما قضیٰ صلوٰته قال اَتقرؤون و الامام یقرأ ، قالوا إنا لنقرأ . قال فلا تفعلوا إلا أن یقرأ احدکم بفاتحة الکتاب فی نفسه اس روایت سے مازاد علی

---

(۱) ابوداؤد ج اص ۱۱۸

الفاتحہ کی ممانعت اور سورۂ فاتحہ کی اباحت معلوم ہوتی ہے، کیونکہ نہی کے بعد استثناء مفید اباحت ہوتا ہے، نہ کہ مفید وجوب جیسا کہ حدیث عبادہ میں میں بتایا جا چکا ہے۔ اس روایت سے زیادہ سے زیادہ سورۂ فاتحہ کی قراءت کو مباح کہا جا سکتا ہے، واجب تو بہت دور کی بات ہے۔

(۹) نویں دلیل میں حضرت انسؓ کی ایک روایت پیش کی جاتی ہے، جس کے الفاظ ہیں: أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی بأصحابه فلما قضیٰ صلوته أقبل علیهم بوجهه فقال أتقرؤن فی صلوٰتکم والإمام یقرأ؟ سکتوا فقالها ثلاث مراتٍ فقال قائل أو قائلون إنّا لنفعل قال فلا تفعلوا و لیقرأ احدکم بفاتحة الکتاب فی نفسه اس روایت کے بارے میں حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ یا تو حضرت عبادہؓ اور حضرت انسؓ کی روایتیں دو نہیں، ایک ہیں۔ اگر ایک مان لیا جائے، تو اس کے متعلق پہلے صورت حال بیان کی جا چکی، اگر یہ دوسری روایت ہے اور اس میں استثناء نہیں، بلکہ "لیقرأ" کا لفظ ہے، جس سے وجوب بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور اباحت بھی مراد لی جا سکتی ہے۔ راوی نے کیا مفہوم لیا ہے، اگر راوی نے وجوب مراد لیا ہے، تو یہ راوی کا خیال ہوا، جو دوسروں کے لیے حجت نہیں ہو سکتا۔

(۱۰) ان کی ایک دلیل ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے، جو بیہقیؒ نے نقل کیا ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من لم یقرأ خلف الإمام فصلوٰته خداج روایت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مقتدی کے لیے قراءت واجب ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ روایت سے مطلق قراءت کا واجب ہونا معلوم ہوتا ہے، چاہے سورۂ فاتحہ یا قرآن کی کوئی بھی سورہ، تو کیا مقتدی سورۂ فاتحہ کے بجائے دوسری آیتیں پڑھ لے، تو اس کی نماز ہو جائے گی؟ کیا

مدعیان قرأت خلف الامام اس کو تسلیم کریں گے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس کی روایت کو اس مسئلہ میں پیش کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اور نہ ان کے لیے مفید مطلب ہے۔ حضرت گنگوہی کا دوسرا جواب یہ ہے کہ روایت کے اصل الفاظ وہ ہیں، جو خطیب نے ابو امامہ سے نقل کیے ہیں قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بفاتحۃ الکتاب فھی خداج غیر تمام اور یہ وہی روایت ہے، جسے ابن ماجہ اور جزء القرأت میں حضرت عائشہؓ سے نقل کیا گیا ہے اور حضرت عائشہؓ کی روایت کے سلسلہ میں تفصیل سے بتایا جاچکا ہے کہ چار وجوہ سے مقتدی پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ روایت صرف ان لوگوں کے لیے ہے، جن پر قرأت فرض ہے، جیسے امام اور منفرد، مقتدی کی قرأت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

مدعیان وجوب فاتحہ کی ان دس دلیلوں کا محدثانہ اصولوں پر تجزیہ کرنے اور روایتوں کا صحیح مفہوم اور مراد بیان کرنے کے بعد آپؒ نے تحریر فرمایا کہ ان کے علاوہ بھی بعض دوسری دلیلیں ہیں، مگر ان میں کوئی وزن نہیں، اس لیے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

حضرت گنگوہیؒ نے آخر میں اتمام حجت کے طور پر کچھ مشہور اور جلیل القدر صحابہ کرام کے عمل کو اس سلسلہ میں پیش کیا ہے، جو مقتدی کے لیے قرأت کے بالکل قائل نہیں: ان میں عبد اللہ بن مسعودؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، عبد اللہ بن عمرؓ، جابر بن عبد اللہؓ، زید بن ثابتؓ، ابو درداءؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عمران بن حصینؓ کے اسماء گرامی شامل ہیں۔ مزید آپ نے علامہ بدر الدین عینی کا حوالہ دیا ہے کہ انہوں نے شرح بخاری عمدۃ القاری میں اسّی صحابہ کرام کا یہی مسلک بتایا ہے (۱)، جو قرأت خلف

---

(۱) عمدۃ القاری، بدر الدین عینی مطبوعہ بیروت ج ۶ ص ۱۱

الامام کو مکروہ اور ممنوع سمجھتے اور کہتے ہیں یہ مذہب بے داغ ہے، کسی حدیث مرفوع کے خلاف بھی نہیں، البتہ حدیث عبادہ سے جو اباحت فاتحہ معلوم ہوتی ہے، اس کے خلاف ہے، مگر یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اباحت ابتداء اسلام میں تھی، بعد میں یہ اباحت بھی مرتفع ہو گئی، جیسا کہ ابو ہریرہ اور ابو موسیٰ اشعری کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے کیفیت نماز بیان کرتے ہوئے یہ جملہ بھی کہا اذا قرئ فأنصتوا کہ جب امام پڑھنے لگے، تو خاموش ہو جانا۔ یہ دونوں حضرات جنگ خیبر کے موقع پر حاضر خدمت ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مازاد علی الفاتحة منازعت کی وجہ سے ممنوع تھا، سورۂ فاتحہ بھی اسی منازعت کی وجہ سے بعد میں ممنوع کر دی گئی، ابو ہریرہؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایتیں اس کی واضح دلیل ہیں۔

(۸) فتاویٰ رشیدیہ

حضرت گنگوہیؒ کے فتاویٰ پہلے تین حصوں میں علیحدہ علیحدہ شائع کیے گئے تھے، اب ان تینوں حصوں کو ایک جلد میں شائع کر دیا گیا ہے، جو پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ فتاویٰ کا امتیاز یہ ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کے دور میں مسلم معاشرہ میں جو غلط رسم و رواج اور خلاف شرع عقائد کی ہوائیں تیز چلنی شروع ہو گئی تھیں، بہت سی بد عقیدگیاں اور گمراہیاں جاری و ساری تھیں، حضرت گنگوہی نے جب علماء حق کی جماعت کو لیکر اصلاح امت کی مہم شروع کی تو مختلف حلقوں اور علاقوں سے انہیں مسائل کے سلسلہ میں زیادہ استفسارات آنے لگے، اس لیے اس مجموعہ کا بڑا حصہ انہیں مسائل کے جواب پر مشتمل ہے، بالخصوص علماء بدایوں و بریلی کی حمایت سے بدعات و خرافات کی کثرت تھی، شیعوں کے باطل اور

مشرکانہ عقائد سنی مسلمانوں میں لاعلمی کی وجہ سے سرایت کیے ہوئے تھے۔ جب علماء حق کی اصلاحی مہم شروع ہوئی، عوام میں بیداری آئی اور تلاش حق کا جذبہ پیدا ہوا، تو ان مسائل کے سلسلے میں شریعت کا حکم جاننے کی کوشش شروع ہوئی، جیسے تعزیہ بنانا، علم اٹھانا، مرثیہ پڑھنا، ماتم کرنا، تعزیوں پر چڑھاوا چڑھانا، امام کے نام کی سبیل لگانا، بی بی فاطمہ کی صحنک اور نیاز کرنا، داستانِ کربلا جو مبالغہ آمیز، جھوٹی اور بے ہودہ کہانیوں پر مشتمل ہے، اس کو پڑھنا، یا مجلسوں میں سننا سنانا اور اظہار غم کرنا، ان چیزوں کے بارے میں شریعت کا حکم جاننے کی ہر جانب سے کوشش شروع ہوئی۔ اسی طرح اہل بدعت میں آباء واجداد سے چلی آرہی رسوم، قبروں پر چادر چڑھانا، پختہ قبریں بنانا، ان پر چراغاں کرنا، اگربتی اور خوشبو سلگانا، دفن کے بعد قبر پر اذان دینا، مردوں کا تیجہ، چہلم اور برسی منانا، قبروں کا طواف کرنا، عرس کے نام میلہ لگانا، قوالیوں کی محفل جمانا، کونڈا، کھچڑا اور مختلف طرح کی بدعتیں ایجاد کر رکھی تھیں، نماز روزہ سے کہیں زیادہ ان رسوم کی پابندی ہوتی تھی اور ان کو بہت بڑا کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا، مصنوعی صوفیاء اور زر پرست علماء سوء نے مزارات پر حاضر ہو کر اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگنا اور ان کو سیاہ وسفید کا مالک سمجھنا اور صاحب مزار کو مختار کل بنا کر ان کو مقام الوہیت تک پہونچا دیا تھا، وہ کون سی خرافات اور مشرکانہ رسم تھیں ان پڑھ اور ناخواندہ وجاہل عوام میں نہیں تھیں، ان معاملوں میں وہ مشرکین مکہ سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں تھے۔ جب علماء حق کی تقریریں اور مواعظ اور رسالوں میں ان مشرکانہ عقیدوں اور ان بدعتوں کی مذمت کی جانے لگی، تو حضرت گنگوہیؒ کے یہاں ان تمام رسوم کے سلسلہ میں مسلسل سوالات آنے لگے۔ آپ اکثر سوالات کے جواب میں صرف شریعت کا حکم بتادیتے تھے، کتابوں کے حوالے اور

فتاویٰ کی کتابوں کی عبارتیں شاذ و نادر ہی لکھتے تھے۔ بعض فتاویٰ ضرور ایسے ہیں، جن میں آپؒ نے حوالوں اور دلیلوں کا اہتمام فرمایا ہے، ورنہ زیادہ تر فتووں میں آپؒ نے اپنی رائے کا صرف اظہار فرمادیا ہے۔ مشرکانہ عقیدوں اور عام خلاف شرع عقائد، بدعات اور مراسم تعزیہ داری کے سلسلے میں اس مجموعہ میں زیادہ مواد موجود ہے۔ اسی طرح غیر مقلدین کا جو نیا فرقہ ابھی نکلا تھا ان کے چند مسائل مخصوص ہیں، جن میں وہ حنفیوں کے مقابلے میں آتے ہیں، ان کے متعلق بھی آپ کے پاس سوالات آتے تھے، آپ ان کے جوابات محدثانہ اصولوں پر بہت محققانہ دیتے تھے اور دلائل و براہین اور حوالوں کا انبار لگادیتے تھے۔ فتاویٰ رشیدیہ میں بعض فتوے اتنے طویل ہوگئے ہیں کہ لوگوں نے ان کو الگ مستقل رسائل کے طور پر شائع کردیا ہے، جب کہ آپ نے ایک مستقل رسالہ کی حیثیت سے نہیں تحریر فرمایا تھا، مگر فتویٰ اتنا طویل ہوگیا کہ وہ خود ایک رسالہ بن گیا، جیسے جمعہ فی القریٰ، تراویح میں ۲۰ رکعت کا مسئلہ یا جہاں جمعہ صحیح ہونے میں شبہ تھا، وہاں احتیاطاً ظہر پڑھنے کا مسئلہ یہ سب جوابات الگ الگ رسالوں کی شکل میں شائع کیے گئے، مگر حقیقتاً وہ حضرت گنگوہی کے فتاوے ہیں، رسائل نہیں۔

حضرت گنگوہیؒ کا تفقہ درجۂ اجتہاد سے قریب تر تھا، آپ براہ راست قرآن وحدیث کے مطالعہ سے، جدید پیدا شدہ بدعات و خرافات کے خلاف مسائل کا استنباط فرماتے تھے اور قطعیت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے، اس لیے تمام علماء حق ان مسائل کے سلسلے میں صرف حضرت گنگوہیؒ کی رائے کا انتظار کرتے تھے اور جب ان کی رائے معلوم ہو جاتی تھی، تو پورے اعتماد کے ساتھ اظہار حق اور اعلان حق کرتے تھے۔ غرضیکہ فتاویٰ رشیدیہ میں بہت سے مروجہ مسائل کے سلسلے میں معلومات

کا ایک خزانہ ہے اور اسے محض فتویٰ معلوم کرنے کے لیے مطالعہ میں رکھا ہی جاسکتا ہے، لیکن بہت سے مسئلوں میں بصیرت کے ساتھ تفصیلی معلومات بھی ان فتاوی سے حاصل ہوتی ہیں، اس سے دعوت واصلاح کا کام کرنے والوں کو رہنمائیاں ملیں گی اور پورے اعتماد کے ساتھ ان مسئلوں پر اظہار رائے کرسکیں گے، جو غلط طور سے مسلمانوں میں رائج ہوگئے ہیں۔

(۹) زبدۃ المناسک

یہ رسالہ ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے، جو حج وعمرہ کے مسائل پر ہے۔ رسالہ ۱۲۹۹ء میں طبع ہوا، یعنی حضرت گنگوہی نے تیسرے حج میں جانے سے قبل تحریر فرمایا ہے، اس سے پہلے آپ دو بار زیارت حرمین شریفین کے لیے جاچکے تھے۔ اس زمانہ میں آج کل کی طرح نہ سفر کی سہولتیں حاصل تھیں اور نہ عام طور پر حج وعمرہ کے مسائل بتانے والے حجاج ملتے تھے، نہ معلم اور قابل اعتماد راہبر میسر تھے۔ زندگی میں پہلی بار سفر حج پر جانے والا ہر شخص مقامات زیارت سے ناواقف، طریقہ عمل سے نابلد ہوتا تھا، ضرورت تھی کہ اس مقدس قافلہ والوں کے لیے کوئی رہنما اور راہبر ہو، جو ہر مرحلہ پر عملی رہنمائی کا فریضہ ادا کرسکے، اس مرحلے پر حاجی کو کیا کرنا ہے اور کن باتوں سے بچنا ہے، ان کو ہر موقعہ کے مسائل بتائے، احکام سکھائے، دعائیں بتائے، احرام، طواف، سعی، رمی، وقوف عرفہ، مزدلفہ، منی، حلق، قربانی کے احکام، فرائض اور ذمہ داریوں کو سکھائے، جمع بین الصلوتین کب کہاں، مواقع کے احکام و مسائل سکھائے بتائے میرے علم میں اس وقت تک اردو زبان میں حجاج کے لیے ایسی مکمل رہنمای کرنے والی کوئی کتاب نہیں تھی، جو کسی مستند عالم و محدث وفقیہ

کی لکھی ہوئی ہو۔ حضرت گنگوہیؒ کی یہ کتاب زبدۃ المناسک میرے علم میں پہلی کتاب ہے، جو اتنی جامع اور مکمل ہے کہ کسی مرحلے پر ناواقفیت کا احساس نہیں ہونے دے گی۔ جنایات کے سلسلے میں تو یہ ایک منفرد کتاب ہے، سفر حج کے سلسلے میں عورتوں کے کچھ مخصوص اور اہم ترین مسائل ہیں ان مسائل پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ غرضیکہ یہ کتاب اس مبارک سفر میں قدم قدم پر رہنمائی کرتی ہے۔ اگر کوئی غلط قدم پڑ گیا، تو وہیں اس کا علاج بھی بتائی ہے۔

یہ کتاب فقہ کی عربی کتابوں میں "کتاب الحج" کی طرح نہیں ہے کہ مسائل کی کرید، اس کے دلائل، ائمہ کے اختلاف بیان کرے اور اصول و کلیات کے بیان کرنے پر اکتفاء کرے اور نہ ایک سیاح کے سفر نامہ کی طرح ہے کہ تاثرات و جذبات کے رنگ میں مقامات سفر کی تفصیلات پیش کرے۔ اپنے دور میں اپنی نوعیت کی بے مثال کتاب تھی اور مستند ترین اور قابل اعتماد رہنما کی تھی، البتہ کتاب کا سائز بڑا ہے اور ذیلی عنوانات نہ ہونے کی وجہ سے قدرے زحمت ہوتی ہے، کاتب نے یکساں قلم سے کتابت کی ہے۔ آج کے ترقی یافتہ فن کتابت کی طرح ہر پیراگراف ممتاز نہیں کیا گیا ہے، یہ اس دور کی مجبوری تھی۔ اگر اس کو دورِ جدید کے معیار اور ترتیب اور ذیلی عنوانات کے ساتھ شائع کیا جائے، تو ڈھائی سو صفحات کی کتاب ہو جائے گی۔ اس موضوع پر لکھی جانے والی موجودہ دور کی کتابوں میں سب سے مستند مفصل اور جامع ہو گی اور فقہی جزئیات کی تفصیل میں تو کوئی کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ مسائل مستند ترین مآخذ سے بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ نے ابتدائی سطروں میں بتایا ہے کہ مسائل اور جزئیات کے سلسلہ میں کلی طور پر شامی پر انحصار کیا گیا ہے اور جہاں جہاں فقہاء میں اختلاف ہے، وہاں بھی شامی

کی رائے کو ترجیح دی گئی ہے اور اسی کو بیان کیا گیا ہے اور اختلاف کی تفصیل سے احتراز کیا گیا ہے۔

زبدۃ المناسک حج کی فرضیت، اس کی اہمیت، اس کے اجر و ثواب کے بیان سے شروع کی گئی ہے اور سفر حج میں جانے سے پہلے خانگی امور، اہل و عیال کے اخراجات اور بندوبست، عزیز و اقارب، دوست واحباب اور متعلقین سے ملنے، تقصیرات کی معافی اور ان سے دعائیں لینے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

سفر کے لیے ہدایات اور مسائل کے بیان سے قبل فائدہ کے عنوان سے حج کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں: ایک قسم افراد ہے اور حج کرنے والے کو مفرد کہتے ہیں، دوسری قسم قران ہے، جس میں حج اور عمرہ اکٹھا کیا جاتا ہے اور اس طرح حج کرنے والے کو قارن کہا جاتا ہے۔ حج کی تیسری قسم تمتع ہے کہ اول عمرہ، حج کے مہینوں میں کرے اور پھر اسی سفر میں گھر جائے بغیر اسی سال میں حج کا احرام باندھ کر حج ادا کرے، اس طرح حج کرنے والے کو متمتع کہتے ہیں۔ آپؒ نے بتایا کہ حنفیوں کے نزدیک قران افضل ہے تمتع سے اور تمتع افضل ہے افراد سے بہر حال فریضۂ حج تینوں طرح ادا ہو جاتا ہے۔ پھر تین فصلوں میں افراد، قران اور تمتع کے احکام کی تفصیل دی گئی ہے۔ پہلی فصل جو افراد کے بیان میں ہے، اس فصل میں حج کے مکمل اور مفصل احکام بیان کر دیئے ہیں، پھر دوسری فصل میں قران اور تیسری فصل میں تمتع کے عنوان سے جو مخصوص مسئلے ہیں، دونوں فصلوں میں اس کی تفصیل دی گئی ہے۔ ایک فصل جنایات کے بیان میں ہے، جو بڑے سائز کے چھ سات صفحات میں آئی ہے اور سیکڑوں امکانی جنایتوں کا ذکر کر کے اس کے احکام بتائے گئے ہیں، جو عام طور سے اہل علم، ان کی تفصیلات سے اور جزئی احکام سے کماحقہ آشنا نہیں ہوتے۔ اس فصل میں

تشفی بخش بیان موجود ہے۔ آخری فصل میں عمرہ کا بیان ہے، پھر تتمہ کے عنوان سے متفرق مسائل لکھے گئے ہیں اور سب سے آخر میں مدینہ منورہ کی حاضری اور درود و سلام پیش کرنے اور ادب و احترام کی انتہائی تاکید اور اس حاضری کی اہمیت، اجر و ثواب کی تفصیلات پر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

ترمذی و بخاری کی درسی تقریریں

ذخیرۂ احادیث پر حضرت گنگوہیؒ کی بہت وسیع اور گہری نظر تھی۔ آپ نے حضرت شاہ اسحاق محدث دہلویؒ کے مشہور شاگرد محدث حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی مہاجر مکیؒ سے حدیث پڑھی تھی۔ خاندانِ ولی اللٰہی کا امتیازی وصف حدیث کا جامع مانع اور محققانہ درس تھا، یہ وصف سلسلہ بہ سلسلہ اس خاندان کے تمام فیض یافتہ علماء میں کم و بیش رہا۔ حضرت گنگوہیؒ کی وسعت نظر کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ آپ صحاح ستہ کی تمام کتابوں کا بیک وقت اور ایک سال میں مکمل درس دیا کرتے تھے، اس کی وجہ سے ان اہم ترین حدیث کی کتابوں کے ذخیرۂ حدیث سے خوب واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے زیر بحث روایت کے علاوہ دوسری تمام روایتیں پیش نظر رہتی تھیں اور ہر روایت پر کامل غور و فکر کے بعد اس کا ایسا مفہوم و محمل اور توجیہ و تاویل آپ کے ذہن میں مستحضر رہتی تھی کہ نہ کسی میں تعارض باقی رہتا ہے اور نہ پیش کی جانے والی دلیل میں کوئی خامی رہ جاتی تھی۔

حضرت گنگوہیؒ نے نہ حدیث کی کسی مشہور کتاب کی شرح لکھی ہے اور نہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے، کیونکہ ان کا دور عملی جد و جہد کا پر شور دور تھا، نظریاتی جنگ برپا تھی، مختلف فرقوں کی یلغار سے فضا پراگندہ تھی، ان کی روک تھام، صحیح مسلک پر عام مسلمانوں کو مضبوطی سے قائم رکھنا

وقت کا سب سے اہم تقاضا تھا۔ آپ چوں کہ مکمل علمی جنگ میں گھرے ہوئے تھے، اس لیے فرصت عنقا تھی، البتہ تیرہ چودہ سالوں تک مسلسل صحاح ستہ کی تمام کتابیں ایک سال میں طلبہ کو ضرور پڑھایا کرتے تھے، ترمذی شریف اور بخاری شریف کے درس میں اتنی مفصل اور جامع تقریر فرماتے کہ علم و تحقیق کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہتا تھا کہ طلبہ تشنگی محسوس کریں۔ حضرت گنگوہیؒ کا حلقۂ درس اپنے عہد میں ایک امتیازی علمی حلقہ تھا اور دہلی کا مرکز اجڑ جانے کے بعد گنگوہ جیسے معمولی قصبہ نے درس حدیث کی آبرو برقرار رکھی تھی اور خاندان ولی اللہی کے جاری کردہ علمی سرچشمہ کا فیضان بڑی حد تک جاری تھا۔ حضرت کے خادم خاص شاگرد رشید حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی نے ترمذی، بخاری، نسائی اور مسلم کی ان تقریروں کو دوران درس قلمبند کر لیا تھا، وہی افادات گنگوہی، **الکوکب الدری ، لامع الدراری ، الفیض السمائی اور الحل المفھم** کے نام سے بعد میں شائع ہوئے۔ ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد ہی حضرت گنگوہی کے فن حدیث میں کمال کا کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ یہ دونوں کتابیں چھپ کر عام ہو چکی ہیں اور ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔

خاتمۂ کلام

حضرت گنگوہیؒ کو وقت اور حالات نے جذبۂ عمل سے معمور ایک پرجوش اور مخلص داعی و مصلح بننے پر مجبور کر دیا۔ قدرت نے ان تمام صفات سے متصف کر رکھا تھا، جو ایک داعی اور مصلح بننے کے لیے ضروری ہیں۔ علم قرآن اور علم حدیث میں درجۂ کمال حال تھا، آپ کا کمال تفقہ اور فقہی بصیرت ہر شک وشبہ سے بالاتر تھی اور اس درجہ کمال کو پہونچی ہوئی تھی کہ اس دور کے تمام اہل علم اس کے معترف تھے۔ ان کی ذات پر غیر

متزلزل اعتماد کا یہ حال تھا کہ ان کی زبان سے کسی مسئلہ میں ان کی رائے معلوم ہو جاتی تھی، تو پھر اس کی دلیل و برہان کی تلاش نہیں ہوتی تھی، کیونکہ ان کو یقین کامل حاصل تھا کہ حضرت گنگوہیؒ نے جو مسئلہ بتایا ہے، اس کے پس پشت ان کا گہرا مطالعہ اور ان کی درجہ کمال کو پہونچی ہوئی فقہی بصیرت کار فرما ہے اور اگر کبھی بعض دلائل کی طرف اشارہ فرمادیتے، تو اس کی روشنی میں درجنوں دلائل خود اہل علم فراہم کر لیتے تھے، کیونکہ حضرت گنگوہی ان کے ہاتھوں میں مسئلہ کی شہ کلید دے دیتے تھے، اسی کو فقہی بصیرت کہا جاتا ہے۔ اسی فقہی بصیرت اور جید الاستعداد علماء کے اعتمادِ کامل کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے گنگوہ جیسی چھوٹی سی بستی میں رہ کر پورے ہندوستان کے اہل علم کو متاثر کیا۔ مسلم معاشرہ میں جس خلاف شرع پہلو کی نشاندہی فرمائی تمام علماء حق کے لیے اس کے خلاف علم جہاد بلند کرنا ضروری تھا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں بدعات اور مشرکانہ رسم ورواج اور باطل عقائد کے خلاف جہاد کرنے میں علماء دیوبند کامیاب ہوئے اور بدعات وخرافات ان لوگوں تک محدود ہو کر رہ گئیں، جو دنیا پرست مصنوعی صوفیاء اور علماء سوء کے زیر اثر رہے۔

حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند قائم کر کے تسلسل کے ساتھ اہل علم کی پرجوش جماعت پیدا کرنے کا سلسلہ شروع کیا، تو اس جماعت کی ذہنی و فکری تربیت حضرت گنگوہیؒ نے فرمائی اور آج ملک میں تمام فرق باطلہ کے خلاف اعلان حق کرنے میں علماء دیوبند جو سب سے اگلی صفوں میں نظر آتے ہیں، یہ جرأت گفتار اور اظہار حق کا جذبہ حضرت گنگوہی کا ورثہ ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کے جذبہ اصلاح و دعوت کے وارث دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ صدر المدرسین

دار العلوم دیوبند اور ان کے بعد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند ہوئے اور پوری زندگی دونوں نے باطل کے خلاف جنگ کرتے ہوئے گذار دی۔ دونوں کے تلامذہ نے پورے ہندو پاک کو اپنا دائرہ کار بنا کر حضرت گنگوہیؒ کی وراثت کو تقسیم کیا اور عام کیا۔ دوسری طرف مظاہر علوم سہارنپور میں مولانا محمد مظہر نانوتویؒ جن کے نام پر مظاہر علوم کا نام رکھا گیا، وہ حضرت گنگوہی کے ایسے خلیفہ تھے کہ حضرت گنگوہیؒ خود ان کا احترام کرتے تھے، پورے مدرسہ مظاہر علوم کے طلبہ اور اساتذہ پر ان کی شخصیت کی چھاپ تھی۔ دوسرے مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ شارح ابو داؤد مظاہر علوم کے صدر الاساتذہ تھے۔ وہ اصلاح و تبلیغ اور بدعت ورافضیت کے خلاف ہمیشہ شمشیر بدست رہے اور براہین قاطعہ لکھ کر بدعت وضلالت کی دنیا میں زلزلہ ڈال دیا، ہزاروں افراد نے ان سے بیعت ہو کر حضرت گنگوہیؒ کے مشن کو آگے بڑھایا اور ان سے ملی ہوئی علمی وراثت کو ہندوستان سے حجاز تک تقسیم کیا۔ آپ حضرت گنگوہیؒ کے اجلۂ خلفاء میں تھے۔ ہندوستان میں تیسرا مرکز مراد آباد تھا یہاں کا مدرسۃ الغرباء جو بعد میں جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد کے نام سے موسوم ہوا، یہاں حضرت گنگوہی کے خلفاء میں حکیم مولانا محمد صدیق صاحب مراد آبادی قطب وقت جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد کے مہتمم تھے، دوسرے خلیفہ مولانا محمد روشن خاں مراد آبادی تھے اور متوسلین میں اور دوسرے لوگ تھے، ان حضرات نے حضرت گنگوہی کے جذبۂ دعوت و اصلاح کو عام کیا اور اطراف و جوانب میں اس کے زبردست اثرات ہوئے۔

یہی تینوں ادارے پورے متحدہ ہندوستان (بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش) پر اثرانداز تھے، یہی تینوں مدارس اہل حق کے مراکز تھے،

انہیں تینوں نے ہند میں اسلام کی آبرو کو بچایا، اسلام کو صحیح خدوخال کے ساتھ پیش کیا اور باطل فرقوں سے ہمیشہ نبرد آزما رہے، انہیں تینوں مدرسوں کے علماء و اساتذہ نے حق و ہدایت کے پرچم کو بلند رکھنے میں مثالی کردار ادا کیا۔ آج سو سال بعد بھی اس کے اثرات پورے ملک میں موجود ہیں اور یہ تینوں ادارے حضرت گنگوہیؒ کے خلفاء کے زیر اثر تھے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ جب تحقیق اور پوری تفتیش و جستجو کے ساتھ اسلامی ہند کی دینی و مذہبی حالات کا جائزہ لیا جائے گا، تو آفتاب کی طرح روشن ہو کر یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دار العلوم دیوبند اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ رحمہما اللہ تاریخ ہند کے اس اہم موڑ پر اسلامی ہند میں بہار ملت کے لیے مسیحا بن کر نمودار ہوئے اور انہوں نے ملت کے تن مردہ میں ایک نئی روح ڈالی اور آج ملت اسلامیہ میں جو زندگی اور توانائیاں نظر آرہی ہیں، ان میں ان دو مخلص بزرگوں کا سب سے زبردست ہاتھ ہے اور انہیں کی بروقت جدوجہد نے آج ہم کو اسلامی دنیا میں میں سرخ رو رکھا ہے۔

ذلك فضل الله يوتيه من يشاء

اسیر ادروی

جامعہ اسلامیہ بنارس

۲۱/ فروری ۱۹۹۷ء

مآخذ و مراجع

(۱) تذکرۃ الرشید مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کتب خانہ نعمانیہ دیوبند
(۲) تذکرۃ الخلیل مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کتب خانہ اشاعت العلوم سہارنپور
(۳) تاریخ مظاہر شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب
کتب خانہ اشاعت العلوم سہارنپور
(۴) حیات خلیل مولانا محمد ثانی حسنی تنویر پریس باغ نواب گونگے لکھنؤ
(۵) مکاتب رشیدیہ مرتبہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی
کتب خانہ اشاعت العلوم سہارنپور
(۶) مفاوضات رشیدیہ مرتبہ مولانا اشرف علی صاحب سلطان پوری
(۷) نزہۃ الخواطر مولانا حکیم سید عبدالحیٔ رائے بریلوی
دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد
(۸) کاروان رفتہ اسیر ادروی دار المؤلفین دیوبند
(۹) مآثر شیخ الاسلام اسیر ادروی دار المؤلفین دیوبند
(۱۰) فیصلہ ہفت مسئلہ حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکی
(۱۱) ضیاء القلوب حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکی
(۱۲) امام الکلام مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی لکھنوی
(۱۳) براہین قاطعہ حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری مہاجر مدنیؒ
(۱۴) انوار ساطعہ مولوی عبدالسمیع بیدل رام پوری
(۱۵) رسالہ الرشید ساہیوال دار العلوم دیوبند نمبر
(۱۶) تاریخ دار العلوم دیوبند ناشر دار العلوم دیوبند
(۱۷) الشامی شائع کردہ مکتبہ نعمانیہ دیوبند

(۱۸) فتاویٰ بزازیہ مکتبہ نعمانیہ دیوبند
(۱۹) حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ندوۃ المصنفین دہلی
(۲۰) وفیات الاعیان ابن خلکان متوفی ۶۸۱ھ دار صادر بیروت
(۲۱) تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتی ندوۃ المصنفین دہلی
(۲۲) الدر المنثور علامہ سیوطی متوفی ۹۱۱ھ دار المعرفۃ بیروت
(۲۳) عمدۃ القاری علامہ بدرالدین عینی متوفی ۸۵۵ھ ادارہ احیاء التراث العربی
(۲۴) مصنف عبدالرزاق امام عبدالرزاق صنعانی متوفی ۲۱۱ھ مجلس علمی ڈابھیل
(۲۵) مشکوٰۃ شائع کردہ کتب خانہ رشیدیہ جامع مسجد دہلی
(۲۶) ابوداؤد شریف شائع کردہ کتب خانہ رشیدیہ جامع مسجد دہلی
(۲۷) فتح الباری حافظ ابن حجر عسقلانی شائع کردہ سعودی عرب
(۲۸) صحیح بخاری شائع کردہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی
(۲۹) فتاویٰ رشیدیہ ہر سہ حصہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
(۳۰) الرای النجیح
(۳۱) اوثق العریٰ
(۳۲) امداد السلوک
(۳۳) سبیل الرشاد
(۳۴) تصفیۃ القلوب
(۳۵) ہدایۃ الشیعۃ
(۳۶) ہدایۃ المعتدی
(۳۷) زبدۃ المناسک
(۳۸) الکوکب الدری مرتبہ مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ
(۳۹) اللامع الدراری